خواتین افسانہ نگار
۱۹۳۰ء سے ۱۹۹۰ء تک
مرتّب
کشور ناہید

خواتین افسانہ نگار

۱۹۳۰ء سے ۱۹۹۰ء تک

مرتّب

کشور ناہید

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

1996
نیاز احمد نے
آر۔آر پرنٹرز، لاہور سے چھپوا کر
سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔
تعداد ——— ایک ہزار
قیمت ۱۲۰/۰۰ روپے

ISBN - 969 - 35 - 0521 - 2

ترتیب

خواتین لکھنے والیوں کے توسط، استعارے کی تفہیم

"نانی اماں کہانی سنایئے" اس روایت کو تو ہر نئے پرانے نے مانا۔ مگر نانی اماں خود اپنی کہانی لکھے۔ اس پر سب نئے اور پرانوں کے تیور بدلے، تیوریاں چڑھیں، انگلیاں اٹھیں، فسانے کے فسانے بنے، عزت کو بٹہ لگا، گھر کی بات دہلیز سے باہر نکلی، آنکھوں دیکھی، کانوں نے سنی، کانوں سنی لفظ کا لباس پہن کر، بے نقاب ہوئی۔

یہاں سے بات شروع ہوتی ہے عورتوں کے لکھنے کی۔ یوں تو اردو ادب میں کہانی اور وہ بھی جدید کہانی لکھنے والیوں میں بہت سے نام فہرستوں میں گنوائے جاتے ہیں۔ مگر جن کو ادب کی سند ملی اور جنھوں نے "زینت کی کشیدہ کاری" کے پیرہن سے نکل کر ایک کہانی کار کی حیثیت سے اپنا وجود منوایا، اپنے عہد کو تحریر کیا، اپنے انداز فکر اور اسلوب کو منوایا اور جن کی تحریر سے آنکھ چرانا، نقادان ادب کے بس کی بات نہیں رہی، ان کی کہانیوں کو مجتمع کیا تو اپنے زمانے کی تاریخ کی بساط بچھتی چلی گئی اور وہ نئی لغت اور نیا منظر نامہ سامنے آیا کہ جس کو تسلیم کرتے ہوئے معاشرے کی گردن کی رگیں کھنچتی چلی جاتی ہیں۔

1930ء کی دہائی اردو ادب میں تراجم کی دہائی نظر آتی ہے۔ سجاد حیدر یلدرم اور امتیاز علی تاج ترکی ادب ترجمہ کر رہے تھے تو ادھر وکٹورین عہد کے ہیجان انگیز ناول نگاروں کی تصانیف مسٹریز آف لنڈن اور "کورٹ آف لنڈن" جیسی تخلیقات ترجمہ ہو کر اردو ادب میں شامل ہوئیں تو اردو کہانی لکھنے والوں نے بھی اسی انداز میں طبع زاد کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ مسز عبدالقادر کی کہانیاں جو کہ 1930ء میں شائع بھی ہو گئیں، ان زندہ رہنے والی کہانیوں میں شمار ہوتی ہیں۔ یاد رہے کہ اگتھا کرسٹی کہ جو فینٹیسی اور جادوئی کہانیاں لکھنے کے حوالے سے بہت مشہور ہوئی۔ وہ مسز عبدالقادر کے بہت بعد سامنے آئی تھیں۔ مسز عبدالقادر کے بعد اردو ادب میں نمایاں نام حجاب امتیاز علی کا ہے کہ انہوں نے بھی اسی زمانے میں کہانیاں لکھنے کا آغاز کر دیا تھا، اس زمانے میں وہ حجاب اسمٰعیل کے نام سے لکھا

کرتی تھیں۔ حجاب امتیاز علی کی کہانی "پاداش عمل" کی عورتیں، گوٹے کناری سے تجی، نزاکت کی تصویر بنی، محبت کے آمیزے میں لپٹی گڑیا نہیں ہیں، 32 روپے حق مہر والی وہی ر۔شما ہے کہ جو آج بھی صبا اور ناز بن کر کبھی فلم کی ہیروئن ہوتی ہے اور کبھی گھر کی نوکرانی۔ مگر رشتوں میں ان کے ایک جیسے نام ہوتے ہیں۔ کسی کی بیوی — کسی کی منکوحہ — کسی کی "منگ"

1930ء ہی میں "نثر پارے" اور "ادب لطیف" نام کی تخلیقات ہمایوں اور ادبی دنیا میں شائع ہونا شروع ہوئیں تھیں۔ خلیل جبران کی تحریروں کا اثر بہت واضح تھا۔ اس زمانے میں ابھی ترقی پسند تحریک بھی شروع نہیں ہوئی تھی کہ روسی افسانے کے ذریعہ حقیقت نگاری کا عکس اردو افسانے میں روشن ہونا شروع ہوا تھا، مگر اس وقت بھی غلام کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ غلام رہے گا اس وقت تک جب تک کہ زنجیریں کاٹنے کا عمل وہ خود نہیں شروع کرے گا۔ برصغیر کی افسانوی دنیا میں Gothic قسم کے پراسرار رومان کی فضا حجاب امتیاز علی نے قائم کی۔ مگر ان کی سب سے پہلی کتاب "خلوت کی انجمن" جو کہ 1936ء میں شائع ہوئی۔ اس میں کہانی "بیمار غم" میں وہ لکھتی ہیں:

> "اللہ! کیا مشرق میں لڑکی محض اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کی خوشیوں پر بھینٹ چڑھا دی جائے؟ کیا اسے خود اپنی زندگی کے معاملے میں بھی دخل دینے کا اختیار نہیں؟ کدھر ہیں وہ ریفارمر، جو قوم کے آگے لمبی لمبی تقریریں کرتے اور بہبودی قوم کا ترانہ بڑے زور و شور سے گاتے ہیں؟ سٹیجوں پر کھڑے ہو کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ رکھ کر، قومی درد جتانے والے ریفارمر کدھر ہیں؟ وہ اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں۔ انہوں نے اپنی ماؤں کے لیے کیا کیا؟... لڑکیوں کے لیے کیا کیا؟ جو کل کی مائیں بننے والی ہیں؟ کیا ان کا ہمدردی اور قوم کے عشق سے لبریز دل ..... مظلوم لڑکیوں کی آہ سے تھرا نہیں اٹھتا؟ کیا ان کی تمام ہمدردی تمام درد محض فرقہ دجال ہی تک محدود ہے؟ اگر ان کے احساسات صرف مردوں کے دکھ درد تک ہی محدود ہیں۔ تو پھر یہ بزرگ کس منہ سے قوم کے امام بنے پھرتے ہیں؟ پھر وہ کیوں اس نام سے منسوب کئے جاتے ہیں؟ کیا وہ عورت کو قوم سے خارج سمجھتے ہیں؟ کیا قوم صرف مردوں ہی کے اجتماع کا نام ہے؟

مجھے تو لگتا ہے کہ 1936ء کی ترقی پسند تحریک کے تحت سب سے پہلے ضبط ہونے والی

کتاب انگارے میں رشید جہاں کی کہانی میں جو عورت کے حقوق کی پاسداری اور آزادی کا مسئلہ اٹھایا گیا تھا۔ وہ اس فکر کی بازگشت تھی جو حجاب امتیاز علی کی ابتدائی کہانیوں میں بھی طاقتور انداز میں اظہار پاتی ہے۔ یہ وہ انداز تخاطب ہے جو ڈپٹی نذیر احمد یا راشد الخیری کی ہیروئین کی طرح مثالی تقلید کی نیکیوں کا بھرم نہیں رکھتا ہے بلکہ اپنے زخموں کی تصویر کی اصل کو پیش کرتا ہے۔ عورت پر رحم کی نظر نہیں' عورت یہ اپنے وجود کی تذلیل کے احساس کی چنگاری کی خبر دیتا ہے۔ اس احساس کو زمانے سے کم آشنا' مگر بیوریکریسی کی چھاؤں میں پلی نجمہ انوارالحق نے بھی سینچا۔ کم کم لکھا مگر اپنی کہانیوں میں طلازموں' بیگمات' صوفوں' عصرانوں' دعوتوں اور پردوں کی سرسراہٹ کی گوٹ لگاتے لگاتے' ساجدہ کے منہ سے یہ الفاظ کہلوا دیتی ہے کہ "بحث کرنا تو ایک شخص کی ذہانت کی دلیل ہے"

(یہ مرد) نجمہ انوار الحق

ہمارے معاشرے میں رشتہ کرتے ہوئے لڑکی کے بر دکھوے یہ بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس کو برا بھی سمجھا جاتا ہے' مگر پھر خاندان میں ہر جوان ہونے والی لڑکی کو سبق سکھایا جاتا ہے کہ اس مرحلے سے گزرو گی تو زوجیت کی چھاؤں اور سکون ملے گا۔ اپنے زخموں کا نمک چاٹ کر خود بن سنور کر آنے والی لڑکیوں کو خریدی جانے والی گائے بھینسوں کی طرح دیکھا پرکھا جاتا ہے اور پھر پسند و ناپسند کا فتویٰ صادر کیا جاتا ہے۔ بہنوں اور ماں کے بعد لڑکا بھی لڑکی کو پسند کرنے کی شرط عاید کرتا ہے' اور اس کے ہاتھ یہ اختیار بھی ہوتا ہے کہ وہ فیشن ایبل لڑکی کو رد بھی کر دے۔

جدید معاشرے میں بیگم اور اونچے طبقے کے ڈرائنگ رومز' موسم کی باتیں' اونچے طبقے کی عورتوں کی باتیں اور ان کی مصروفیات کی داستانیں حجاب امتیاز علی سے شروع ہو کر یوم یوم ڈارلنگ تک چلتی رہیں کہ ان لکھنے والیوں کا آغاز' اپنے ماحول کی عکاسی سے ہوا' مگر وہی حجاب امتیاز علی کہ جو سورج کی تمازت کو پگھلتا اور تیرتا اپنے آبنوسی برآمدوں میں محسوس کرتی تھیں' انہوں نے نیو کلیائی جنگ کی اذیت کو "پاگل خانے میں" رقم کیا اور وہی قرۃ العین حیدر' گردش رنگ چمن میں خاندانوں کے اجڑنے میں عورت کی بربادی کی تصویر جس کمال فن سے کھینچتی ہیں' وہ ان کا اپنے اندر اور باہر کے سفر کے سنگم کی داستان ہے۔

ترقی پسند تحریک' برصغیر کی پہلی ہمہ جہت تحریک تھی جس میں عورت اور مرد—— دونوں سیاسی اور فکری سطح پر مساویانہ طریقے پر آگے بڑھ رہے تھے۔ اس زمانے نے ادب کی لغت اور موضوع دونوں کو بدل دیا۔ ہیروئن بدل گئی' سماج کا نقشہ بدل گیا اور افسانے کا لہجہ

بدل گیا۔ اب وہ بے رنگ بوسیدہ لباس لڑکی' عورت اور مرد— موضوع بحث تھے کہ جن کے پہننے کو دھوپ' کھانے کو فاقے اور پینے کو اپنا ہی خون میسر تھا۔ 1943-1944ء کے زمانے میں ہاجرہ مسرور نے "بندر کا گھاؤ" جیسی لازوال کہانی لکھی۔ یہ کہانی اپنا ہی زخم کریدنے کی داستان ہے۔ اپنا لہو پینے کا حصہ ہے۔ قیام پاکستان— تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت تھی' چالیس ہزار عورتیں اغوا ہوئیں' ہزاروں قتل کر دی گئیں' ہزاروں ہندو لڑکیاں مسلمان بنا کر بیویاں بنا لی گئیں۔ ہزاروں گمنام رہیں' کسی کے گھر خادمہ کی شکل میں— کسی دارالامان میں۔ کسی گائیڈ ہاؤس میں' کسی سڑک پر بھکارن کے روپ میں اور کسی ہسپتال میں ظہورن کے روپ میں۔ ستم ظریفی یہ رہی کہ جو بچھڑ گئی تھیں وہ تو اسی غم اور آس کے درمیان لٹکی رہیں کہ کاش اپنے مل جاتے تو سارے دکھ دھل جاتے مگر وہ کہ جنہیں اپنے مل بھی گئے مگر انہوں نے اس داغ کو اپنا کہنے سے گریز کیا' اپنا ماننے سے اجتناب کیا' پہچان لینے سے انکار کیا' اپنے باوقار لباس اور باکردار خاندانی روایات کو قربان نہ کرنے کی قسم کھائی— وہ دل ہلانے والی داستانیں جمیلہ ہاشمی کی آتش رفتہ' خدیجہ مستور کی "چند روز اور" اور ہاجرہ مسرور کی "چاند کے اس طرف" میں اتنی شدت سے بیان کی گئی ہیں کہ آج بھی ان کے الفاظ تپش دینے لگتے ہیں۔

خدیجہ مستور کی "بھورے" کی ظہورن— سیتا پور کی بچھڑی ہوئی بھورے کی منگ ہے' جس کا نہ کوئی گھر ہے نہ رشتہ دار' بھورا بھی نہیں کہ جو اس کا انتظار کرتا رہا مگر جب وہ ملی اور علم ہوا کہ وہ عصمتوں کے چکروں سے آزاد حالات کے چکروں میں ہر گھر کی جورو بننے پر مجبور ہے تو وہی "بھورے میاں" نصیحتوں کی چادر اپنی "منگ" ظہورن کے سر پر اڑھا کر' خود کو مطمئن کر بیٹھے تھے۔

ساری خواتین افسانہ نگاروں میں Monologue کی فضا جاری رہتی ہے۔ کہانی میں کہیں بھی dialogue کی نوبت نہیں آتی ہے کہ زندگی میں بھی اصل یہی منظر ہے۔ ماں باپ' بہن بھائی' میاں بیوی— کسی کے درمیان ڈائیلاگ نہیں ہے۔ یہ انداز بہت سی بیمار ذہنیتوں کو جنم دیتا ہے۔ غیر فطری انداز کو فروغ دیتا ہے۔ محلوں میں اصطبلوں کی طرح بھری عورتوں اور مسجدوں میں سب لذتوں سے محروم مولویوں کو جن غیر فطری عادتوں کا شکار کرتا ہے۔ ان میں ایک معصوم مگر لڑکی کی تعلیم کے آغاز سے اب تک متوسط طبقے کی لڑکیوں اور استانیوں کے درمیان' چنگاریوں کے سے رشتے کو بھی عورت ہی نے موضوع سخن بنایا۔

ٹیچر اور شاگرد کے درمیان عشق کا قصہ' معاشرے میں بڑی رومانٹک بات رہی ہے'

سکولوں کی حد تک تو یہ سلسلہ خوب لطف دیتا اور پروان چڑھتا ہے' لڑکیاں یا استاد کسی شاگرد کو منتخب کر کے' پھول دینا' تحفے لینا' ایک دوسرے سے لپٹنا' چوری چوری ایک دوسرے کو دیکھنا اور شرمانا— یہ سب اس گھٹن کا نتیجہ ہیں کہ جہاں مرد ایک شجر ممنوعہ ہیں مگر زندگی اور بدن کے بدلتے موسم کی ہوائیں' کچھ طلب کرتی ہیں۔ ہمارے سکولوں اور ہماری حویلیوں میں بھیڑ بکریوں کی طرح بھری جوان عورتیں' نواب زادوں کی سینکڑوں کی تعداد میں منکوحہ عورتیں' سکولوں میں پردوں میں جکڑی آتی لڑکیاں' برقعوں میں محبوس نوکری کرتی استانیاں— سانس لیں تو کیسے لیں۔ یہ سارے عوامل ممتاز شیریں کی کہانی "انگڑائی" میں بار پاتے ہیں۔

ماماؤں' گورنس اور آیاؤں کی داستان ممتاز شیریں کی کہانیوں تک آتی ہے۔ ممتاز شیریں اردو ادب کی پہلی بہت پڑھی لکھی' خاص طور پر فرانسیسی ادب اور انگریزی ادب و تنقید اور ہم عصر عالمی مصنفین کی تحریروں سے شناسا خاتون تھی۔ اسی لیے ان کی کہانیوں میں وہ قطعی مسلم معاشرہ نہیں جو بعد کی پاکستانی لکھنے والیوں کا سٹرکچر بنا۔ Multicultural سوسائٹی جس میں مس فانس بھی ہیں' زبیدہ بھی ہے' جون' پروفیسر اور گلنار بھی' کٹے ہوئے بال' لپ اسٹک' روج اور "ا لیمنٹ رنگ" کا ذکر اور ساتھ ایک "نفسیاتی بیماری" جو کہ آج کے زمانے میں باقاعدہ Lesbianism کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ پرانے زمانوں میں بھی تو ٹکڑیاں اور کھیرے محلوں میں جانے کی ممانعت تھی۔

پاکستان کے قیام کے مرحلے کے بعد' پاکستان نے اپنے وجود کو عورت کے وجود کی طرح حصوں بخروں میں تقسیم ہوتے دیکھا' خود کو عورت کی طرح زر کی غلامی میں جکڑا ہوا محسوس کیا اور ملکی آزادی کو خوشنودی آقا کا رہن کر دیا۔

آقاؤں نے دو سو سالہ پرانا کھیل پھر دہرایا۔ اب یہ کھیل وہ خود نہیں کھیل رہے تھے ان کے زر خرید سیاست دان، اور نوکر شاہی کے وہ پرزے کھیل رہے تھے جو کبھی یونیفارم میں تھے اور کبھی یونیفارم کے بغیر تھے۔ 1965ء میں چھیڑ چھاڑ اور طاقتوں کو آزمانے کا کھیل کھیلا گیا۔ اب کے پھر شکار عورتیں تھیں— وہ عورتیں جو ان طاقت آزمائی کرنے والوں کی بیوہ تھیں' وہ عورتیں کہ جن کے گھروں پہ بارود کے گولے گرے اور گھر والے مرے اور اپاہج ہوئے۔ وہ عورتیں جو فرخندہ لودھی کی کہانی میں "پار بتی" بنیں۔ نام بدل کر کسی کی بیوی ہونے کے لئے دو بول پڑھوانے کو رضامند ہوئیں۔ اس سارے منظر نامے میں پاکستانی ادب میں جنگجو صلاح الدین ایوبی کی بازگشت زیادہ تھی' دل درد مند اور اس احساس کی لے

بہت کم تھی کہ پاکستان لال قلعے پر جھنڈا لہرانے کے آسیب میں مبتلا رہ کر' اپنے عوام کو غریب اور دفاع کے نام پر ملازمین کے ایک طبقے کو حاکم کے طور پر بالواسطہ تربیت دیتا رہا۔ یہ مرحلہ امریکی امداد اور "تھینک یو امریکہ" کی تختیوں سے شروع ہوا۔ آمریت کو "مسلم لیگ" میں بدل ڈالنے کے سفر میں دس سال مکمل کیئے اور بوڑھی گنگا پہ تیرہ تیرہ سالہ لڑکیوں کے بڑھے ہوئے پیٹوں اور پچکی ہوئی چھاتیوں کی شکل میں رونما ہو کر' جنرل اروڑا کے قدموں میں گر پڑا۔

پھر بے گھری بے دری اور ہجرت کی تصویر ابھری۔ ملک توڑنے والے کوئی اور تھے عوام اپنا حق مانگتے ہیں تو حاکم سزا دیتے ہیں کہ ملک ہی توڑ دیتے ہیں۔ یہ قصور کیا تھا۔ کون قصوروار تھا۔ کیا بیتی ان پر کہ جو ملک سے محبت کرتے تھے یوں بچھڑنا نہیں چاہتے تھے۔ کس بیوریکریسی کی نفرتوں نے عوام میں فاصلے پیدا کیئے۔

کسی ملک کا تاریخ میں اتنا بڑا واقعہ ہو اور وہاں کا ادب حادثے کو رقم کرنے سے قاصر رہے۔ جاپان میں 45 سال پہلے ایٹم بم پھٹا تھا۔ اب تک اس زہرناکی سے نفرت کی جھلک جاپانی ادب میں نظر آتی ہے۔ دیوار برلن کو اپنے اپنے رنگ اور جنگ سے نفرت کو شدومد کے ساتھ جرمن ادیبوں نے پیش کیا۔ ہمارے ملک کے دو ٹکڑے ہوئے' ہمارے ترانوے ہزار فوجی جنگی قیدی بنے۔ مگر ہمارے ادب نے کونسا قابل ذکر ناول پیش کیا۔ کونسا ایپک لکھا گیا۔ ہوتا بھی کیسے' نئی حکومتوں کے نئے قصیدہ گو' گزشتہ کا تجزیہ کفر سمجھتے ہیں۔ اردو ادب کا تجزیہ کرو تو مسعود اشعر اور ام عمارہ — دو لکھنے والے تھے۔ مسعود اشعر کہ جو اس دکھ کی بنا پر جدید افسانہ نگار بنا اور ام عمارہ کہ جو اس آگ اور خون کی ہولی سے گزری۔

سانپ اپنی کینچلی نجانے کتنے عرصے میں بدلتا ہے۔ کمپیوٹر اور روبوٹس نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا ہے۔ شہروں میں آوازوں کی جگہ لاؤڈ سپیکر کی اذانیں پھیل چکی ہیں۔ بھاری بوٹ ہمارے آقا اور پھر آمریت والی مسلم لیگ قومی شناخت کی مٹھی بنے ہیں۔ اس سارے ادوار میں عورت نے سوالات اٹھائے — خالدہ حسین بنکے کہا میں کون ہوں۔ اون کا گولہ ہوں' جتنا کھولو' اور الجھتا جاتا ہے' اوس کا قطرہ ہوں' ہاتھ میں پکڑنے کی کوشش کرو تو موجود غائب ہو جاتا ہے — میں کون ہوں — ماں' بیوی' بیٹی اور بہن — عورت کہاں ہے۔ مرد کے حوالے سے شناخت ہونے والے رشتے' اس کی پہچان نہیں۔ تو پھر یہ پہچان بھی کیا کہ قبر پہ لکھے کتبے مختلف ناموں کی نشانیاں معلوم ہوتے ہیں۔ مگر وہ سب وہ سارے کے سارے ہوتے تو مردے ہی ہیں' بے روح' بے جان' بیکار وجود' مٹی کا ڈھیر۔

سیمون ڈی بوا نے لکھا تھا "عورت پیدا نہیں ہوتی بنا دی جاتی ہے" ان بنی ہوئی عورتوں نے بھی خالدہ حسین' اختر جمال اور بانو قدسیہ کا نام پایا۔ ان بنی ہوئی عورتوں نے اپنے اندر کی عورت کی تھکن کو دھاگے کی پیچک میں لگی سوئیوں کی شکل میں محسوس کیا۔ میگریزا سے وابستہ تھکن کو لفظ دیے اور یوں لسانی رابطوں کی وہ فارمولیشن سامنے آئی جس سے اردو ادب نا آشنا تھا — جنت' جوانی' مامتا' عصمت' آبرو' عزت' مقدس' رشتے — یہ ساری دھجیاں ہاتھ میں لیے روایتی قدروں کا تجزیہ کیا تو "جاگتی آنکھوں ڈراؤنے خواب دیکھنے کا سلسلہ بڑھتا ہی گیا۔"

(زاہدہ حنا)

یوں رومانٹک انٹلیکچوئیل کالج گرل نے اپنی اکائی کو تین چار مستند اور مستقل حوالوں سے ٹٹول کر ایک نیا حوالہ بھی تلاش کیا اور وہ مرد کو اپنی جنس کی اپیل سے ذہن کی کاٹ تک لے گئی۔ اس طرح مرد کو بھی اپنے روپ اور رویے کا دوسرا چہرہ دیکھنے کا موقع ملا۔

تیسری دنیا کے غریب ترین ممالک میں پاکستان کا نام آتا ہے۔ ہم نے بیس برس پہلے اپنے لوگ عرب ممالک بھیج کر اس طرح زر مبادلہ کمانا شروع کیا۔ جیسے غلاموں کی تجارت سے زمانہ جاہلیت کے بدو' پیسے کماتے تھے' ہم نے بالکل اس ضرورت اور نفسیات کو فراموش کیا کہ جو شوہر' مرد اور گھر کے مالک کے گھر پر موجود نہ ہونے اور پیسے کے موجود ہونے سے رونما ہوتی ہے۔ اس طرح ہم نے زر کی تلاش اور مغربی عورت کو بیوی بنا کر احساس کمتری مٹانے والے مردوں کو بڑھاپے میں اپنی بیٹیاں واپس وطن لانے والے اس احساس جرم کی پردہ پوشی کی کہ جس طرح وہ گناہ و ثواب کو بھول کر داد عیش لوٹتے رہے ان کی اولاد بھی ویسا ہی نہ کرنے لگے۔ آگے چلیں تو ان لڑکیوں اور لڑکوں کا نفسیات کو کسی نے بیان کرنے کا زحمت گوارا نہ کی کہ جو مشرق اور مغرب کے دو پاٹوں کے بیچ لپٹے رہے اور کوئی ان کی بات نہ سمجھ سکا۔

تیسری دنیا کے غریب ملک ہونے کے ناطے غیر ملکی امداد کے لئے پھیلنے والے کالے ہاتھ کو ہم نے سفید قمیض اور کف لنک پہنا دیئے اور انگریزی بولنے کے مقابلے کی میرا تھون ریس میں شامل ہو گئے۔ یوں معاشرے کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ایک ٹکڑا اکیسویں صدی کی سمت رواں تھا اور دوسرا ٹکڑا چودھویں صدی سے بھی پیچھے رہا۔ ہماری بیشتر لڑکیاں Intermediate mothers کا کردار ادا کر کے' گھر میں ہر سال پیدا ہونے والا بچہ پالتی رہیں اور باپوں کے پیر داب کر' رات کے پچھلے پہر جہاں جگہ ملی' سہم کر کنڈلی مار کر لیٹ

رہیں۔

رشوت کا پیسہ عیب نہیں رہا۔ ہیروئن کلچر اور پیر و مشائخ کانفرنسیں اکٹھی فیشن میں داخل ہوئیں۔ کسی تریاق کی ضرورت نہیں رہی کہ تیسری دنیا کا نمائندہ قصبہ ٹاؤن' علی گڑھ ٹاؤن' ریشم گلی اور اوجھڑی کیمپ میں آنکھوں کے "دید بان وا کیے" "معمولی باتوں" کو " عذابوں کا پل صراط" سمجھ رہا ہے اور چڑھاوے کی چادر کو ہی توشہ آخرت سمجھ رہا ہے۔

یہ سارے منظر' ساری سیاست' سارا دوغلاپن اور ساری محرومیاں' خواتین لکھنے والیوں نے رقم کی ہیں۔

اس مجموعے میں اردو لکھنے والیوں کے علاوہ دو افسانہ نگار خواتین وہ ہیں کہ جنہوں نے اپنی قومی زبانوں میں بہت لکھا' اردو میں کم کم لکھا مگر بہت خوب لکھا۔ زیتون بانو اور نورالہدیٰ شاہ کی کہانیاں بھی اس انتخاب میں شامل ہیں کہ جس ملک میں بھینس مرنے پر عورت کے مرنے سے زیادہ دکھ کیا جائے اور جن علاقوں میں بیل بیمار ہو جائے تو ہل چلانے کے لئے عورت کو جوت لیا جائے' وہاں کی کہانی شامل نہ ہو تو آپ صرف باربرا کارٹ لینڈ کی کہانیوں کی خوبصورت' اندھی' گونگی اور بہری عورتوں کو ہی دیکھ سکتے۔ اس دیباچے میں جن نمائندہ کہانیوں کا ذکر کیا گیا۔ وہ تمام اس مجموعے میں شامل نہیں کہ اس انتخاب کو موضوعات کے تنوع کا نمائندہ انتخاب بنانا مقصود تھا۔

1930ء سے 1990ء کے درمیان اس ملک کے لوگوں کے ساتھ انصاف اور مذہب کے نام پر جو جو ناانصافیاں ہوئیں' اس اندھیرے کو دور کرنے کے لئے گیلی دیا سلائی سے روشنی پیدا کرنے یہ کوشش ہمارے خالی گھڑوں خالی برتنوں اور خالی ذہنوں کو' سمندر کی لہر پر رکھے چراغ کے ذریعہ' راستہ دکھانے کی وہ کوشش ہے جو کہتی ہے "آزادی ہمیشہ پہلے آتی ہے اور موت بعد میں۔"

کشور ناہید
ستمبر 93

مسز عبد القادر

شگوفہ

(1)

ہماری پارٹی سیر و سیاحت کی غرض سے امرناتھ جا رہی تھی۔ ہم لوگ خوشیاں اور رنگ رلیاں مناتے ہوئے پانچ بجے کے قریب چندن واڑھی جا پہنچے یہاں صرف ایک دوکان تھی جو ایک سکھ نے مسافروں کے لئے خیمہ میں کھول رکھی تھی۔

سہ پہر کا سہانا سماں، پہاڑ کی سیر، دلکش فضا، پاک و صاف ہوائیں، ندی کا شور و غل، برفانی پل پر آفتاب کی ناچتی ہوئی کرنیں جھلملا رہی تھیں۔ جن سے معلوم ہوتا تھا کہ تمام دنیا کا حسن سمٹ کر اس لاثانی مقام پر جمع ہو گیا ہے۔

ہم لوگوں نے فیصلہ کر لیا کہ آج رات یہاں ضرور قیام کریں گے۔ ہمارے باربرداری کے ٹٹو اور قلی ابھی پیچھے تھے۔ ہم نے دوکاندار کو چاء کا آرڈر دیا اور خود انتظار کی زحمت سے بچنے کے لئے برف کے پل کی طرف نکل گئے۔ نو عمری کا زمانہ تھا۔ طبیعت جولانیوں پر تھی۔ تازہ امنگیں، نئے جذبے، زندہ ولولے پوری صحت و تندرستی، سچی خوشیاں حقیقی مسرتیں، جو اس بے فکری کی عمر کے لوازم شمار ہوتے ہیں۔ اور جن کے زیرِ اثر دنیا کی ہر ایک چیز ایسی خوبصورت دکھائی دیتی ہے، گویا ہر شے سے خوشیوں اور جوانیوں کا رس ٹپک رہا ہو۔ اس پر یہ قدرتی اور دلفریب ماحول ایک انوکھا اور طلسمی رنگ چڑھا رہا تھا۔

ہم لوگ قدرت کی ان آرائشوں اور دلاویزیوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے برفانی پل پر چلنے لگے۔ پل کے پار ایک کاہی آلود چٹان پر ایک عجیب الہیت انسان بیٹھا تھا۔

اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ شکل و صورت سے بھی کچھ برا نہ تھا مگر اس نے وضع انوکھی بنا رکھی تھی۔ یعنی سیاہ رنگ کا ایک لمبا کشمیری طرز کا گرم خرقہ پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں سیاہ فوجی بوٹ تھے ہاتھوں میں چرمی دستانے اور سر پر سیاہ چرمی کنٹوپ ور اس پر طرہ یہ کنٹوپ پر سولہ ہیٹ لگا رکھا تھا۔ آنکھوں پر دوہری عینکیں چڑھی ہوئی تھی اور مزے مزے سے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔

اس کی ہیئت کذائی پر ہم بے اختیار ہنسنے لگے۔ تھوڑی دیر میں ہمارے قہقہوں کی زبردست یورش سے پہاڑ گونج اٹھے اور ندی کا شور دب کر رہ گیا ہمیں شوخیوں اور شرارتوں کا اچھا موقع ہاتھ آیا تھا ہم نے اس پر انگریزی زبان میں بھی آوازے کسے' پھبتیاں اڑائیں اور خوب دل کھول کر مذاق کئے۔

لوگ کہتے ہیں کہ جوانی کی سرمستیوں کے سامنے بھوت بھی بھاگتے ہیں مگر اس خدا کے بندے کے کان پر جوں تک نہ رینگی بلکہ ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا ہی نہیں اور بڑے اطمینان سے سگریٹ کا دھواں بکھیرتا رہا البتہ ہمارے انتہائی مذاق سے قدرے متاثر ہو کر وہ ہلکے سے مسکرا دیتا۔ اس سے ہماری ہنسی میں مزید اضافہ ہوتا کہ یہ جانگلو کیوں ہنستا ہے؟ اسے کیا کچھ سمجھ آتی ہے اور اس کی اس حرکت پر ہم اتنے ہنستے کہ ہمارے پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے اور گلے خشک ہو کر کھانسی ہونے لگتی۔

اسی ہنسی مذاق میں جب کچھ وقت گزر گیا تو ہمیں چاء یاد آئی اور وہاں سے لوٹے۔ چاء سے فارغ ہوئے تو بار برادری کے ٹٹو اور قلی وغیرہ پہنچ گئے تھے۔ اور خیمے نصب کرانے میں مشغول ہو گئے۔ الاؤ لگوا کر' بستر وغیرہ تیار کروا کر' فارغ ہوئے تو شام ہو چکی تھی۔ اب پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔

کشمیر کی بھوک تو مانی ہوئی ہے۔ اس سرزمین میں آکر قوت ہاضمہ اس قدر تیز ہو جاتی ہے کہ بغیر منہ چلائے کسی وقت بھی گزارا نہیں ہوتا۔ قدرتی چشموں اور بہتی ہوئی ندیوں کے پانی جو کیمیائی نباتاتی اور جڑی بوٹیوں کی آمیزش سے اکسیر کا جواب رکھتے ہیں۔ ثقیل سے ثقیل غذا بھی فوراً ہضم ہو جاتی ہے۔ اور بے اختیار الجوع الجوع زبان پر آتا ہے۔ چنانچہ کھانے کی غرض سے دوکان پر پہنچے! یکایک ایک کونے میں نظر پڑی تو ہم سب چونک اٹھے کیونکہ کونے میں بچھے ہوئے سٹول پر وہی خرقہ پوش صاحب بیٹھے انگریزی اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے جسے چاء کے وقت ہم لوگ ہی یہاں بھول گئے تھے۔

انہیں دیکھ کر پھر ہمیں مذاق کی سوجھی۔ ہمارے ایک شریر ساتھی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "آپ انگریزی تو خوب جانتے ہوں گے۔ ہمیں بھی کچھ سکھائیے۔"

اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "آپ کو کیا سکھاؤں گا۔ کیونکہ میں تو خود ضرورت کے مطابق جانتا ہوں۔"

"ایں آپ انگریزی جانتے ہیں۔ تو گویا آپ بھی تعلیم یافتہ ہیں۔" اس نے کہا۔

"شاید ایسا ہی ہو"! خرقہ پوش نے جواب دیا۔

تو کہاں تک تعلیم ہے۔ آپ کی ہم لوگوں نے برائے تمسخر کہا۔

"صرف ایم اے تک" اس نے طنزاً کہا۔

"پشیمان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہنسو اور کھیلو' تمہاری چھیڑ چھاڑ سے میں بہت خوش ہوں کیونکہ ایک عرصہ کے بعد مجھے یہ دلچسپ موقع میسر آیا ہے اس اتفاقیہ ملاقات نے میرا چلوؤں خون بڑھ گیا ہے۔ دوسرے میری ہیئت کذائی ہی ایسی تھی کہ خواہ مخواہ ہنسی آتی ہے مگر میں مجبور ہوں کیونکہ عرصہ دراز سے میں اس پہاڑی علاقہ میں رہتا ہوں اور یہ سورج کی چمکیلی کرنیں جو برف پر جگمگا کر دلکش سین پیش کرتی ہیں۔ آنکھوں کے لئے سخت مضر ہیں اسی لئے میں نے دوہری عینکیں چڑھا رکھی تھیں اور سولہ ہیٹ بھی اس سلسلے میں بہت مفید ہے۔ یہ چہرے کو برفانی عکس سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس طرح جسم کے دوسرے حصے بھی ڈھانپنے پڑتے ہیں۔ اگر ایسا نہ کروں تو اس برفانی ہوا سے میرے مسام پھٹ جائیں اور مجھے بھی خارش کی بیماری لگ جائے۔ جو ان علاقوں میں عام ہے۔"

اس کی طرز گفتگو اتنی سادہ اور موثر تھی کہ ہم سب اس سے معافی مانگنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ ایک نیک دل انسان تھا۔ بہت جلد ہم لوگوں سے مانوس ہو گیا۔ کھانے کے بعد ہم نے اس کو اپنے خیمہ میں لے جانا چاہا کہ ہمیں اپنی سیاحت کا کوئی دلچسپ واقعہ سنائے اس نے وعدہ کیا کہ ہمیں ایک دلچسپ اور سچی کہانی سنائے گا۔ لیکن چونکہ وہ رات کو تلخہ(۱) پینے کا عادی تھا۔ اس لئے اس نے کہا۔ آپ لوگ خیمے میں جائیں میں ابھی تلخہ پی کر آتا ہوں۔"

ہم خیمہ میں واپس آئے اور اسی خرقہ پوش کا ذکر کرتے ہوئے اس کے انتظار میں بستروں میں پڑ گئے۔ مگر پیشتر اس کے کہ وہ ہمارے خیمہ میں آتا۔ ہم سب سو گئے۔

صبح سویرے جب ہم لوگ بیدار ہوئے تو خرقہ پوش یاد آیا۔ ہم نے اپنے ملازم کو اسے بلانے کے لئے دوکان پر بھیجا۔ تھوڑی دیر میں وہ اکیلا ہی واپس آ گیا مگر اس کے ہاتھ میں کاغذوں کا ایک پلندا تھا۔ اس نے ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"وہ خرقہ پوش خود تو چلا گیا ہے البتہ کاغذات آپ کے لئے دوکاندار کے پاس چھوڑ گیا ہے۔"

ہم سب اس پلندے پر ایک ساتھ ٹوٹ پڑے۔ بیرونی کاغذ لفافہ کی صورت میں پلندے پر لپٹا ہوا تھا جس پر لکھا تھا۔

میرے نو عمر اور نووارد دوستو رات میں نے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں کوئی دلچسپ واقع

سناؤں گا۔ لہٰذا جب میں تمہارے خیمہ میں آیا تو تم لوگ جوانی کی راحت آمیز نیند کا مزا
لے رہے تھے۔ میں نے تمہیں جگانا مناسب نہ سمجھا لیکن یہ داستان جس کے سنانے کا میں
تہیہ کر کے آیا تھا۔ تم لوگوں کو سوتا ہوا دیکھ کر بار گراں کی طرح محسوس ہونے لگی میرے
پاس اتنا وقت نہ تھا کہ صبح تک ٹھہر سکتا' کیونکہ میں ان گھوڑے والوں کے ساتھ' جو منہ
اندھیرے ہی ادھر سے گزرتے ہیں' جانے کا وعدہ کر چکا تھا اگر ایسا نہ کرتا تو یہ دشوار گزار
راستہ پیدل طے کرنا پڑتا اس لئے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے کہانی قلمبند کر رہا ہوں
یہ میری آپ بیتی ہے!"

(2)

میں ایک سیاح ہوں۔ صرف سیاح ہی نہیں بلکہ سیاح اکبر کہنا زیادہ موزوں ہو گا۔ یہ
خبط مجھے بچپن سے تھا جو کسی وقت چین نہ لینے دیتا تھا میں باپ کے ڈر سے' اپنے دل پر جبر
کر کے تعلیم میں مصروف رہا۔ تعلیم کے ختم ہوتے ہی میرے والدین بھی جنت کو سدھار
گئے۔ میں اکیلا رہ گیا۔ وہ مردہ جذبات وقت کے تقاضوں سے پھر بیدار ہوئے۔ سیلانی طبیعت
نیا رنگ لائی لہٰذا آج سے بارہ سال پیشتر سیزن گزارنے کی خاطر پہلگام آیا۔ میرے ساتھ دو
کلاس فیلو عنایت اور مرزا بھی تھے جو کہ میری طرح دلدادۂ سیاحت تھے جن کی صحت گویا
سمند شوق پر تازیانہ تھی۔ ہم دن رات پہاڑوں اور جنگلوں میں گھومنے لگے۔

آخر ایک دن ہم نے اپنے پہاڑی ملازم سے امرناتھ کی تعریف سنی۔ بس پھر کیا تھا فوراً
کیل کانٹے سے لیس ہو کر چل پڑے۔ اتوار کا دن تھا چمکدار دھوپ سیلاب نور کی طرح
نشیب و فراز پر بہہ رہی تھی۔ تمام لدھرویلی پر نور کا عالم تھا۔ دس بجے ہم پہلگام سے چلے
اور ایک بجے تک چندن واڑی جا پہنچے۔ ہمارے ساتھ چھ قلی اور تین بار برداری کے ٹٹو
تھے۔ تھوڑی دیر ہم نے چندن واڑی میں دم لیا اور کھانا جو ساتھ پکا کر لائے تھے کھا کر
آگے روانہ ہوئے۔ ہمارا خیال تھا کہ غروب آفتاب تک شیش ناگ پہنچ جائیں گے مگر ابھی
چند میل ہی کا سفر طے کیا تھا کہ سایہ بادلوں نے چاروں طرف سے غول بیابانی کی طرح پھیلنا
شروع کیا تو قلی نے کہا

"جتنی جلدی ہو سکے اس حد سے نکل جانا چاہیے۔ کیونکہ اس مقام پر بارش اکثر
خطرناک اور شدید ہوتی ہے۔

ہم نے اپنی رفتار تیز کر دی لیکن آدھ گھنٹہ کے اندر ہر طرف اس قدر دھند چھا گئی کہ

ہاتھ پسارے دکھائی نہ دیتا تھا اور ساتھ ہی طوفان باد و باراں نے آ لیا۔

ہوا کا زور دم بدم بڑھ رہا تھا۔ جس کی گونج سے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ ندی کا مدو جزر ہوا کے غضبناک تھپیڑوں کے ساتھ ہر لحظہ بڑھ رہا تھا گویا اس کی خوفناک لہریں اچھل اچھل کر ہمیں نگلنا چاہتی ہوں ہم چٹانوں اور جھاڑیوں کا سہارا لے کر چلنے لگے اور اسی حالت میں اس حد کو عبور کر لیا۔

اب راستہ کافی کھلا تھا اور ندی بھی دور ہوتی جا رہی تھی لیکن بدقسمتی سے ژالہ باری ہونے لگی۔ اولوں کی بوچھار سے اپنے پرائے کی تمیز نہ رہی۔ ہم نے بے تحاشا دوڑنا شروع کیا۔ گو ژالہ باری سے ہماری برساتیاں اور ٹوپیاں سینہ غربال بن گئی تھیں پھر بھی ہم نے ہمت نہ ہاری اور بڑھتے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد ژالہ باری تو ختم ہو گئی مگر مینہ بدستور جاری رہا۔

آخر ایک لمبے اور دشوار سفر کے بعد ہمیں دور سے جھونپڑی دکھائی دی۔ ہم گرتے پڑتے وہاں تک جا پہنچے۔

یہ گھاس پھوس کی جھونپڑی بالکل غیر آباد تھی۔ شاید کسی سیاح نے یہاں کبھی قیام کیا تھا جس کے کونے میں ایک شکستہ چولہا تھا اور قریب ہی سوکھے پتوں کا ایک ڈھیر لگا تھا اور ایک طرف پیال بچھی تھی۔ ہم نے آگ جلا کر کپڑے خشک کئے اور قلیوں کا بے صبری سے انتظار کرنے لگے حتیٰ کہ شام ہو گئی اور وہ نہ آئے۔ اب اس ویران جھونپڑی میں رات گزارنے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔ چنانچہ ہم تینوں بھوکے پیاسے دوستوں نے خشک پتے اور پیال وغیرہ جلا کر رات کاٹ دی، گو تمام رات ہمیں ریچھوں کی غراہٹ اور دوسرے جنگلی جانوروں کی آوازیں آتی رہیں، مگر آگ روشن ہونے کی وجہ سے ہم ان کی دستبرد سے محفوظ رہے۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ مطلع بالکل صاف ہو چکا تھا اور قرص آفتاب سنگ پارس کی طرح بے رنگ دنیا کو جلاء دے رہا تھا۔ ہم اس تاریک جھونپڑی سے نکلے ہی تھے کہ ہمارے قلی بھی ہمیں تلاش کرتے ہوئے آ پہنچے جنھوں نے ہمیں بتایا کہ ہم لوگ راستہ بھٹک کر اس جگہ آ گئے تھے۔ وہ تمام رات ہمیں تلاش کرتے رہے اور یہ جگہ چندن واڑی اور شیش ناگ سے بہت دور دوسری طرف واقع ہے۔"

اس خبر سے ہم بہت افسردہ ہوئے۔ لیکن اس وقت ہمیں سخت بھوک لگ رہی تھی، ہم نے قلیوں سے پوچھا۔

"کیا اس جنگل کے قرب و جوار میں کوئی گاؤں ہے۔"

انہوں نے کہا۔ "ہاں یہاں قریب ہی ایک خوبصورت وادی ہے جس میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر تین گاؤں آباد ہیں جن میں کرور اور ہاری تو دونوں گاؤں چھوٹے چھوٹے ہیں مگر نگ پوہ بڑا گاؤں ہے۔"

ہم بھوک سے بے تاب ہو رہے تھے یہ مشورہ کیا ادھر چلیں اور شکم پری کریں۔ غرضیکہ ہم سیدھے راستے پر آگے کی طرف روانہ ہوئے۔

فجر کا پہلا نورانی سماں تھا اور خوشنما راستہ پہاڑی کے دامن میں بل کھاتی ہوئی دندانہ دار سڑک، کھڈ میں بہتی ہوئی منہ زور برفانی ندی دیو زاد چٹانیں، مینوسواد وادیوں کی فردوسی شان اور قدرت کے حقیقی جلوے، ترو تازگی بخش رہے تھے۔ قریباً ایک میل کے فاصلہ پر جا کر بلند پہاڑ کے نیچے ایک خوبصورت اور شاداب وادی دکھائی دی ہم ایک برساتی نالے کے ڈھلوان راستے کے ذریعے وادی میں اتر گئے۔

یہ وادی سچ مچ سراپا حسن تھی جس کی خاموش سرزمین سے حسن کی کرنیں پھوٹی پڑتی تھیں۔ اردگرد کے پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں سورج کی شفاف اور بھڑکیلی کرنوں کی بدولت نہایت آب و تاب سے جلوہ ریز تھیں۔ سبزے کا نکھرا ہوا رنگ آنکھوں میں کھب رہا تھا، دھان کے مختلف رنگوں کے کھیت نور آگیں بہار دکھا رہے تھے۔ زرشک کی بیلیں پھولی ہوئی تھیں جن کی کھٹ مٹھی خوشبو سے تمام وادی مہک رہی تھی ان قدرتی رنگینیوں سے ہماری روح تک مسکرانے لگی۔ تھوڑی دور ایک چھوٹی سی بلوریں ندی چمکیلے سنگریزوں سے کھیلتی اور ان کی سنگ دلی پر اشک حسرت بہاتی ہوئی آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی۔ جس کے پار درختوں کا ایک زبردست جھنڈ تھا جہاں سے گانے کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ آگے بڑھ کر معلوم ہوا کہ درختوں کے درمیان ایک قبرستان ہے جس میں گھنی گھاس کھڑی تھی۔ اس کے آخری سرے پر ایک طویل و عریض احاطہ تھا۔ قبرستان اور احاطہ کو جدا کرنے کی غرض سے زرشک کی بلیوں کی اونچی باڑ باندھی گئی تھی۔ جس کے دوسری طرف پتھر کی عمارت تھی جہاں کوئی دھیمے سروں میں گا رہا تھا۔

ہم لوگ باڑ پھاند کر عمارت کی طرف گئے۔ عمارت کے دروازے بند تھے۔ اس عمارت کے سامنے ایک وسیع چمن تھا جس کے آخری سرے پر دور سے ایک خوبصورت، کشمیری طرز کا دو منزلہ جھونپڑا دکھائی دیا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھے گانے کی آواز صاف اور بلند ہوتی گئی۔

گانے والے کی آواز میں اتنا رس تھا اور لے اتنی دلنشیں تھی کہ ہم لوگوں سے ضبط نہ ہو سکا۔ ہم بے تابی سے چمنستان میں گھس کر گانے والے کو تحیر زا نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

یہاں ایک چھوٹے سے جھرنے کے قریب اور خوش رنگ پھولوں کی کیاریوں کے درمیان ایک چھوٹا سا تعزیہ نما چھپر تھا جس کے نیچے ایک پری زاد لڑکی کی بیٹھی اردو زبان میں ایک فراقیہ گیت گا رہی تھی۔

یہ گانے والی حسینہ نہایت نازک اندام تھی۔ اس کے شبرنگ اور دراز بال تن نازک کے گرد حصار کئے ہوئے تھے۔ چونکہ وہ ہماری طرف پشت کئے بیٹھی تھی اس لئے اسے ہماری موجودگی کا علم نہ ہو سکا۔ ہم اس نغمہ کے نشے میں سرشار دیر تک چپ چاپ کھڑے رہے لیکن جونہی گانا ختم ہوا ہم اس کے قریب چلے گئے۔

ہمارے پاؤں کی چاپ سن کر اس نے رباب پرے رکھ دیا اور چہرے سے بکھرے ہوئے بالوں کی لٹیں ہٹائیں۔ آہ کیا بتاؤں وہ کس قدر حسین تھی۔ حسن کی تجلیوں سے ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کی نورانی جھلک سے گمان ہوا جیسے چاند یکایک کالی بدلیوں سے نکلا ہوا' اس کی سرخ و سفید رنگت بالکل اس طرح تھی جیسے میدہ اور شہاب سمویا ہوا ہو۔ اس کے خوشخط ہلالی ابروؤں کے نیچے بڑی بڑی مست آنکھوں میں میخانوں کی بستیاں آباد تھیں۔ اس کے گیسوؤں سے مصور کی دعا لپٹی ہوئی تھی۔ اس کا گول اور درخشاں چہرا آفتاب کو شرما رہا تھا اور گداز بازوؤں میں بتکدے کی راگنی سوئی ہوئی تھی' غرضیکہ ہر لحاظ سے وہ تخلیق کی پہلی سحر معلوم ہوتی تھی۔

وہ سرخ پشمینے کا ایک لمبا پیرہن پہنے تھی اور سر پر سرخ رنگ کا ہلکا پھلکا رومال اوڑھ رکھا تھا جس کے نیچے سے شبرنگ بال کمر تک لٹکتے ہوئے نہایت بھلے معلوم ہوتے تھے اس کی کمر میں بندھا ہوا سیاہ ریشمی پٹکا اس طرح تھا جیسے صندل کے درخت کے ارد گرد مار سیاہ ایسا بے مثال حسن دیکھ کر ہمارے دل پہلوؤں میں دھڑکنے لگے وہ اس زمردیں خطہ کی لال پری تھی یا سرخ بیر بہوٹی۔

ہم نے مختصر لفظوں میں اسے اپنے خیالات سے آگاہ کیا پہلے تو وہ چند منٹ تک ہمیں تعجب سے دیکھتی رہی۔ پھر معصومانہ انداز سے مسکرائی۔ ہمیں محسوس ہوا کہ شاید شب یلدا میں بجلی آسمان کا سینہ چیر کر کوند رہی ہے۔

اس کی مسکراہٹ سے ہم سب کے مضمحل چہرے کھل گئے۔ وہ ہمیں دو منزلہ

جھونپڑے کے اندر لے گئی۔ ایک بڑے کمرے میں پھول دار نمدے اور خوبصورت گدے بچھے ہوئے تھے اور کھونٹیوں کے ساتھ جا بجا پھولدار آبی نباتات کے لمبے لمبے ہار لٹک رہے تھے جو مینڈھیوں کی طرز پر گوندھے گئے تھے۔ غرضیکہ کمرے کی ہر ایک چیز صاف ستھری اور قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔

وہ ہمارے لئے کھانا لینے گئی اور ہم اس کی بابت آپس میں باتیں کرنے لگے۔

میں نے کہا۔ "شاید وہ یہاں اکیلی رہتی ہے۔ کیونکہ سوائے اس کے کوئی دوسرا آدمی دکھائی نہیں دیتا۔"

مرزا نے کہا "ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس کا ساتھی کہیں باہر کھیت پر ہو گا۔"

اتنے میں وہ کھانا لے آئی۔ جو لکڑی کے خوبصورت کاسوں میں رکھا ہوا تھا۔ یہ کھانا بھی عجیب طرح کا تھا یعنی ابلے ہوئے سیب جن میں دہی ملا ہوا تھا۔ دودھ کی روٹیاں' شہد' انڈے' پنیر' زرشک' کچے اخروٹ اور ایک خاص قسم کی گھاس جو پانی میں اگتی ہے اور مغز اخروٹ کے ساتھ کھائی جاتی ہے۔

یہ سب چیزیں با فراط تھیں۔ ایسے مفلس علاقہ میں ایسا کھانا یقیناً کسی جاگیردار کو بھی میسر نہ آ سکتا تھا۔

ہم نے کہا "آپ نے اردو زبان کس سے سیکھی؟"

اس نے کہا۔ "اپنے والدین سے۔ وہ پشاور کے رہنے والے تھے۔"

ہم نے پوچھا: "آپ کا اسم شریف۔"

اس نے کہا۔ "میرا نام شگوفہ ہے!"

کیا پیارا نام تھا۔ وہ خود تو ابھی شگوفہ تھی ہی لیکن اپنے حسن نورستہ سے دوسروں کے دلوں کے شگوفے کھلا دینے کا اعجاز بھی رکھتی تھی۔ ہم لوگوں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اس غیر مہذب علاقہ میں آپ کیسے آئیں؟" اس نے کہا۔ "قسمت لے آئی!"

ہم نے پوچھا۔ "آپ کے شریک زندگی غالباً کام پر گیا ہو گا۔"

اس نے شرما کر جواب دیا۔ "نہیں میں تو کنواری ہوں۔"

ہم نے کہا۔ "لیکن آپ کے لواحقین"

اس نے کہا۔ "میرا کوئی بھی نہیں۔ میں بالکل اکیلی ہوں' اکیلی؟"

ہم سب نے بے اعتباری سے کہا اور حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"ہاں بالکل اکیلی۔" اس نے متانت سے کہا۔
"مگر یہ ساز و سامان" ہم نے کہا۔
"سب گاؤں والے میرے لئے مہیا کرتے ہیں" اس نے فخر سے کہا اس کے بعد ہم نے کئی ایک سوال کئے مگر اس نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا بلکہ ٹالتی رہی۔
کھانے کے بعد ہم وہاں سے رخصت ہوئے اور راستہ بھر شگوفہ کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اس وادی کی رنگینیوں اور شگوفہ کی پرلطف ملاقات کا ہم پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ ہم نے کچھ دن یہاں قیام کرنے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ ہم نے واپس آ کر اسی ویران جھونپڑی کے قریب ڈیرے ڈال دیئے۔ اور روزانہ "شگوفہ" کے گھر جا کر اس کی پاکیزہ صحبتوں سے دل بہلانے لگے۔ مگر میرے دل پر ان ملاقاتوں کا خاص اثر ہو رہا تھا۔ تاہم مجھے کوئی ایسا موقع نہ ملا کہ کبھی تنہائی میں مل کر اس سے اپنے خیالات کا اظہار کرتا۔ شگوفہ بھی مجھ پر بہت مہربان تھی اور میرے دوستوں کی نسبت میری باتوں سے بہت خوش ہوتی تھی۔ لیکن دل کا حال خدا کو معلوم ہو گا۔ میں اس کے متعلق کیا کہہ سکتا تھا۔ البتہ خود دل و جان سے اس پر فدا ہونے لگا۔ چند دن بعد میرے دوستوں نے واپسی کا ارادہ کیا اور مجھے بھی ان کی انگشت نمائی کے ڈر سے مجبوراً ان کے ساتھ واپس آنا پڑا۔

(3)

شگوفہ کے حسن و جمال کی کشش کوئی معمولی نہ تھی۔ اس کی بھرپور جوانی محشر خیز شباب، مستانہ چال، شیریں کلامی اور ان سب سے بڑھ کر معصومیت میرے دل میں گھر کر چکی تھی۔ میرا دل اس کی پرستش کرتا تھا تاہم دن رات اس کی یاد میں تڑپنے کے باوجود میں تین سال تک کشمیر نہ جا سکا۔ آخر چوتھے سال بدقسمتی پھر مجھے وہاں لے گئی۔ شگوفہ کے اشتیاق میں جو میرے دل کی ملکہ اور میری خوشیوں کا گہوارہ تھی، میں دوبارہ پہلگام پہنچا، لیکن وہاں بمشکل ایک رات ٹھہرا اور دوسرے دن صبح شفق کے رنگین سایوں میں روانہ ہو کر چار بجے تک اپنی کھوئی ہوئی جنت میں پہنچ گیا، جس کی وسیع آغوش میں پاکیزگی اور معصومیت پرورش پاتی تھی، جس کے دراز دامنوں میں مستیاں اور رعنائیاں کھیلتی تھیں، جس کی چوڑی چھاتی پر بلوریں ندیاں مچلتی تھیں، جہاں دھان کے کھیتوں پر حسن ازلی لہلہاتا تھا، جہاں زمردیں درختوں کی نورانی سج دھج شادابیوں کا منہ چڑاتی اور جہاں کے سجیلے پھولوں کی نزاکت پر خود قدرت رشک کرتی تھی۔

میں والہانہ انداز سے مسکن محبوب میں داخل ہوا۔ چمنستان پھولوں سے پٹا پڑا تھا۔ وہ ایک کنج میں سورج مکھی کے پھولوں کے درمیان بیٹھی ایک خاص قسم کی نرم و نازک گھاس کے تنکوں سے اپنے لئے پاپوش تیار کر رہی تھی۔ اس وقت وہ آفتابی رنگ کے لباس میں تھی۔ اس کا گلابی چہرہ سورج کی خوشگرامی سے قندھاری انار کے خوشنما دانے کی طرح سرخ ہو رہا تھا اور سر کے بال کالی ناگن کی طرح ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس دلفریب نظارے سے متاثر ہو کر میں وہیں مبہوت کھڑا رہ گیا۔

کچھ دیر بعد اس نے اپنے کام سے اکتاتے ہوئے' انگڑائی لی تو اچانک اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ میں دوڑ کر اس کے قریب گیا۔ مجھے پہچان کر اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اس نے بڑے تپاک سے میرا خیر مقدم کیا اور نہایت خلوص سے جھونپڑے میں لے گئی۔

سفر کی تکان سے میری طبیعت مضمحل ہو رہی تھی' اس لئے میں کھانا کھا کر سو گیا۔ شام کے قریب میری آنکھ کھلی تو باہر نکل کر دیکھا کہ کشمیری عورتوں کا ایک میلہ سا لگا تھا جن کے درمیان شگوفہ نہایت وقار سے اس طرح بیٹھی تھی جیسے ستاروں کے حلقہ میں چاند کے سامنے ایک بہت بڑے ساوار میں چاء ابل رہی تھی۔

میں اسے مصروف پا کر چمنستان کی طرف چل دیا سورج اس وقت پہاڑوں کی عین برفانی چوٹیوں پر چمک رہا تھا۔ اور نورانی شعاعوں کے عکس سے برف پر جا بجا قوس قزح کے رنگ جھلک رہے تھے۔ ان رنگین سایوں سے وادی کی شان دوبالا ہو رہی تھی۔ ادھر زرشک کی کھٹ مٹھی خوشبو دل کو لبھا رہی تھی۔

میں ان فطری تجلیات کی بہاریں لوٹتا ہوا نہایت سکون و اطمینان سے گلگشت چمن کرنے لگا۔ اسی حالت میں جبکہ میں چکر کاٹ کر زرشک کی بیلوں سے گزر رہا تھا تو سامنے مجھے ایک خرقہ پوش کشمیری کھڑا دکھائی دیا جس نے کشمیری زبان میں آہستہ سے کہا۔

"یہاں سے بھاگ جا!"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور بھاگ گیا۔

ابھی میں اس شخص کی حرکت پر غور کر رہا تھا کہ پیچھے سے سیٹی کی آواز آئی میں نے پلٹ کر دیکھا تو پگڈنڈی پر کھڑا ہوا ایک بوڑھا کشمیری مجھے وہاں سے بھاگ جانے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھنے لگا۔ مگر اس نے اشارے سے مجھے روک دیا' اور پھر جھونپڑے کی طرف اشارہ کر کے اس نے انگلی اپنے لبوں پر رکھ لی۔ جس کا مطلب ظاہر تھا کہ خاموش رہو' وہ سن لے گی۔

ان لوگوں کی ایسی حرکات نے مجھے تذبذب میں ڈال دیا۔ میں نہ سمجھ سکا کہ یہ لوگ مجھے کس خطرے سے آگاہ کرتے ہیں' اتنے میں سورج کی سنہری شعاعیں ایک ایک کر کے روپوش ہو گئیں' جنگلی درخت' خوشرنگ پھول' پہاڑی کھیت' خود رو بیل بوٹے' کشادہ وادی' غرضیکہ ہر ایک چیز سہم کر رات کے تاریک دامن میں سونے لگی۔ مگر میں عالم استعجاب میں وہیں کھڑا رہا۔

یکایک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے چونک کر دیکھا تو اپنے قریب ایک بوڑھی عورت کو کھڑا پایا۔ جس نے مجھے کشمیری زبان میں کہا۔ تم یہاں کیوں آئے ہو اور کہاں سے آئے ہو۔"

میں نے جواب دیا۔ "میں پنجابی ہوں اور سیر و سیاحت کی غرض سے آیا ہوں۔

اس نے کہا۔ "تو کیا تمہیں رات گزارنے کے لئے گاؤں میں کوئی جگہ نہ مل سکتی تھی۔ جو یہاں اس بلا کے دام میں آ پھنسے۔"

اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھنے لگی۔ مگر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔

"سچ سچ بتاؤ کیا معاملہ ہے؟ ورنہ ابھی شگوفہ کو بلا کر سب کچھ بتاتا ہوں"

اس دھمکی سے بڑھیا کانپ گئی۔ اور قبرستان کی باڑ کے قریب سنگین عمارت کے پیچھے لے جا کر مجھ سے کہنے لگی۔ "تم نے دیکھا کہ وہ اس جنگل میں کس شان و شوکت سے رہتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں"

بڑھیا کہنے لگی۔ "یہ بھی جانتے ہو کہ ہمارا علاقہ بہت مفلس ہے۔ ہم خود چیتھڑے پہنتے ہیں مگر اس کے لئے پشمینے کے زر دوز لباس بناتے ہیں خود روکھا سوکھا کھاتے ہیں اور اس کے لئے روزانہ اچھی اچھی خوراکیں بہم پہنچاتے ہیں۔ خود "کانگڑیوں" کے سہارے بیٹھ کر رات گزارتے ہیں مگر اس کے گھر میں ہمارے بنائے ہوئے گبے نمدے اور قالین موجود ہیں۔ آخر ایسا کیوں کرتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میں کیا جانوں؟"

بڑھیا نے کہا۔ "اچھا سنو۔ شگوفہ ڈائن ہے انسانی خون اس کے منہ لگ چکا ہے۔ ہم یہ سب چیزیں اپنے بچاؤ کی خاطر اسے بطور نذر دیتے ہیں۔ کیونکہ اس سے پیشتر وہ گاؤں والوں پر ہاتھ صاف کیا کرتی تھی۔ مگر اب صرف بھولے بھٹکے مسافروں کو ہی شکار بناتی ہے یا قبروں سے مردے نکال کر کھاتی ہے۔ اس کا حسن و جمال صرف فریب نظر ہے۔"

اس انکشاف نے مجھے حواس باختہ کر دیا۔
آسمان پر سیاہی اور سفیدی دست و گریباں ہو رہی تھی۔
تمام وادی پر دھندلکے کا غلاف چڑھ رہا تھا—— ہوائیں کالے چور کی طرح کائنات سے داؤ گھات کر رہی تھیں۔ سیاہ پوش فضا میں جھاڑوں کی جنبش سے روحوں کے چلنے پھرنے کا گمان ہو رہا تھا اس پریشان کن ماحول میں بڑھیا کے اس بیان کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ میں واہمہ کا شکار ہو کر کانپنے لگا۔ سچ ہے۔ جان بہت عزیز ہوتی ہے چنانچہ میں نے بڑھیا سے التجا کی کہ آج رات مجھے اپنے گھر میں پناہ دے لیکن بڑھیا نے کانوں پر ہاتھ رکھے۔
میں نے کہا۔ ”کیا گاؤں میں کوئی سرائے بھی ہے۔“
اس نے کہا۔ ”کوئی نہیں اور اگر ہوتی بھی تو تمہیں کوئی پتہ نہ دیتا۔“
میں نے کہا۔ ”کیوں“
بڑھیا نے کہا۔ ”گاؤں والے ایک مسافر کی خاطر شگوفہ کو دشمن کیسے بناتے۔“
عین اسی وقت پاؤں کی چاپ سنائی دی اور ساتھ ہی جھاڑیوں سے خفیف سی سرسراہٹ۔ بڑھیا تو فوراً دم دبا کر بھاگی' لیکن میں بدحواسی کے عالم میں وہیں کھڑا رہ گیا۔ کچھ دیر بعد جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ محض وہم تھا۔ تو میری جان میں جان آئی اور چہرے پر بناوٹی بشاشت پیدا کرتے ہوئے جھونپڑی کی طرف چلا گیا۔
جھونپڑے کو خالی پا کر مجھے سخت فکر ہوئی اور یقین ہو گیا کہ اس نے ضرور ہماری باتیں سنی ہوں گی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں چپ چاپ کمرے میں بیٹھ گیا۔ اسی اثناء میں وہ اندر داخل ہوئی۔ اور ست انداز سے کھانا لائی اور نہایت خاموشی سے میرے سامنے چن دیا اس کے اس رویہ سے میں بہت پریشان ہوا اور اس سے گھل مل کر باتیں کرنے لگا۔ اس نے کچھ توجہ نہ کی اور ٹالنے کی غرض سے اٹھ کر میرا بستر تیار کرنے میں مصروف ہو گئی اب تو میں بہت گھبرایا اور کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ جسے وہ تاڑ گئی اور اپنے مغموم چہرے پر عارضی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی۔
”آپ نے کھانا کیوں چھوڑ دیا۔“
میں نے اداسی سے کہا۔ ”آپ کی بے رخی دیکھ کر۔“
میرے اس جواب پر اس نے سر جھکا لیا اور اس کی شرابی آنکھوں سے اس طرح آنسو برسنے لگے جیسے ساون بھادوں کی جھڑی۔
خدا جانے اتنے بڑے بڑے شفاف اور نورانی آنسو اس نے کہاں سے جمع کر رکھے تھے

کہ میں حیران رہ گیا۔ مگر فوراً ان مست آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں نے ایسا اعجاز دکھایا کہ میرے تمام شکوک ان کی دلفریب رو میں بہہ گئے۔ میں اپنی غلطی پر سخت نادم ہوا۔ اور اس کا بھولا بھالا چہرہ دیکھ کر میرا دل موم ہو گیا۔

"شگوفہ میں تم سے محبت کرتا ہوں" میں نے ٹوٹے پھوٹے جملوں میں کہا۔

وہ خاموش رہی۔ میں نے دوبارہ یہی الفاظ دوہرائے

"لیکن تمہاری محبت" اس نے رکتے ہوئے کہا اور پھر خاموش ہو گئی۔

لیکن کا کیا مطلب۔ شگوفہ کیا تمہیں میری محبت ناپسند ہے؟"

میں نے کہا؟

اس نے کچھ جواب نہ دیا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کی خاموشی سے میری بے قراری دم بدم بڑھنے لگی۔ مگر وہ کسی ایسے خیال میں محو تھی جیسے اس کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔

"جلدی بولو شگوفہ اب میں صبر نہیں کر سکتا۔ "میں نے منت کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن تمہاری محبت ناجائز ہے" اس نے جواب دیا۔

"نہیں نہیں شگوفہ میں کسی ناجائز محبت کا خواہشمند نہیں۔" میں نے کہا میں تمہیں شریک زندگی بنانا چاہتا ہوں۔"

ہاں میں نے سمجھا، مگر میرے اور تمہارے درمیان ایک بیکراں خلیج حائل ہے۔" اس نے کہا۔

"خلیج کیسی" میں نے پوچھا

شگوفہ نے جواب دیا۔ "مذہب"

"تو کیا تم مسلمان نہیں ہو۔" میں نے تعجب سے کہا۔

"لیکن مسلمانوں میں توکئی فرقے ہوتے ہیں۔" شگوفہ نے جواب دیا۔

"نہیں مسلمان سب ایک رشتہ میں منسلک ہیں۔ فرقہ داری ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی۔" میں نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔

"مگر میں اپنے فرقہ کے قوانین کسی صورت میں بھی نہیں توڑ سکتی" شگوفہ نے متانت سے جواب دیا۔

"اچھا تو مجھے بھی اپنے فرقہ میں شامل کرو۔ کیا تم ایسا بھی نہیں کر سکتیں" میں نے منت سے کہا۔

وہ ایک لمبے سکوت کے بعد بولی۔ "ہاں۔ ایسا ہو سکتا ہے بشرطیکہ پہلے میرے فرقہ میں شامل ہونے کی رسوم ادا کرو۔"

چنانچہ میں نے منظور کر لیا۔

(4)

آدھی رات کا وقت تھا۔ چاند کی سیمیں کرنیں زیتون کے چراغ کی لو سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ بال چھل کی نشیلی خوشبو سے مستی برس رہی تھی۔ میں کمرے میں اکیلا بیٹھا اپنی قسمت کے آخری فیصلہ کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں شگوفہ اندر آئی۔ اس نے سیاہ کمخواب کا لباس پہن رکھا تھا اور سیاہ ہی موتیوں کے زیورات نورانی جسم کے زینت بن رہے تھے۔ یہ سوگوار علامت دیکھ کر میں نے آزردگی سے کہا۔

"شگوفہ شب عروسی کے لئے کالا لباس بہت منحوس ہے۔"

شگوفہ نے جواب نہ دیا اور نہایت خاموشی سے میرے قریب بیٹھ کر حسرت ناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"اچھا تمہیں میری شرط منظور ہے۔ بعد میں پچھتاؤ گے تو نہیں۔"

میں نے کہا۔ "ہرگز نہیں۔ قول مرداں جان دارد۔"

اس منظوری کے بعد اس نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایک ریشمی چادر میرے ہاتھ میں دے دی اور ایک منتر بتا کر مجھے ہدایت کی کہ میں شگوفہ کی صورت کا تصور کر کے یہ منتر پڑھوں اور منتر پڑھتے وقت ۔ چادر اپنے دونوں ہاتھوں پر پھیلائے رکھوں۔ چند بار عمل کرنے سے ایک پرندہ آ کر میرے ہاتھوں پر گرے گا۔ جسے میں اس چادر میں لپیٹ کر بغل میں داب لوں۔

چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ جس کے عمل سے چند سیکنڈ ہی میں ایک پرندہ پھڑپھڑاتا ہوا میرے ہاتھوں میں آ گیا اور میں نے فوراً اسے چادر میں لپیٹ کر بغل میں داب لیا۔

بعد ازاں اس نے میری آنکھوں سے پٹی کھولی اور میرے قریب بیٹھ کر کہنے لگی۔

"اچھا میری داستان حیات سنو تاکہ میری سچائی کے اظہار کے ساتھ ہی میری داستان ختم ہو جائے۔"

پرندہ بیچارہ میری بغل سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ اس لئے میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا

"پہلے اس بے زبان کی قسمت کا فیصلہ تو کرو۔ جو میری بغل میں تڑپ رہا ہے۔ داستان حیات سنانے کو تو تمام عمر پڑی ہے"

اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔"اس کا کچھ خیال نہ کرو۔ اسے تڑپنے دو۔ کیونکہ میرے مذہب کا یہی فرمان ہے"

"میں بے دلی سے خاموش ہو گیا۔" شگوفہ نے کہا

آہ میں بہت ہی بدقسمت ہوں۔ ابھی میں نے دہر ناپائیدار میں قدم ہی رکھا تھا کہ میری ماں مر گئی۔ جب میں نے کچھ ہوش سنبھالا تو سوتیلی ماں کی جھڑکیوں اور ملامتوں کے سوا کبھی میرے، کانوں نے نرم الفاظ نہ سنے۔ میں جب چھ برس کی ہوئی تو باپ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ گو باپ نے کبھی مجھ سے محبت نہ کی تھی تاہم ایک ٹھکانہ تو تھا سو وہ بھی جاتا رہا۔ مگر خدا مسبب الاسباب ہے۔ اس نے میرا ٹھکانا اس طرح بنایا کہ ہمارے محلہ کی ایک نیک دل اور امیر عورت نے میری پرورش کا ذمہ لے لیا۔ اس نیک دل خاتون کا ایک ہی لڑکا تھا جس کو گھر سے نکلے ہوئے دس سال کا طویل عرصہ گزر چکا تھا۔

خدا کی قدرت مجھے ابھی ان کے گھر آئے تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا۔ کہ بھائی عثمان یعنی اس نیک دل خاتون کا اکلوتا بیٹا واپس آ گیا۔ ماں مجھے پہلے ہی بہت پیار کرتی تھی۔ مگر اب مجھے اپنے لئے مبارک خیال کرتے ہوئے زیادہ قدر کرنے لگی۔ حتیٰ کہ ان کی ناز برداریوں نے مجھے بہت شوخ اور شریر بنا دیا۔ لیکن جہاں گل ہوتا ہے وہاں خار بھی ساتھ ہی ہوتا ہے یعنی بھائی عثمان کو میری شوخیاں ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ وہ اکثر مجھے ایسی قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے کہ میرا خون خشک ہو کر رہ جاتا ہے۔

بھائی عثمان زرد رو اور اور لاغر اندام تھے۔ ان کے متین چہرے سے عزم و استقلال ٹپکتا تھا۔ اور پیشانی کی شکنیں دانائی اور بزرگی کی شاہد تھیں ان کی عمر تیس سال کے قریب تھی۔ طبیعت میں حکومت کا مادہ تھا۔ وہ اپنی ہر جائز و ناجائز بات منوانے کے عادی تھے۔

بھائی عثمان نے ماں کو بتایا کہ وہ کشمیر کے علاقہ میں ایک دور دراز وادی میں دس سال تک مقیم رہے، اور آئندہ بھی اپنی زندگی وہیں گزارنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ماں نے ہر چند منع کیا مگر وہ نہ مانے بلکہ ماں کو بھی اپنے ساتھ چلنے کے لئے اصرار کرنا شروع کیا، آخر کار ماں کو انہوں نے رضامند یا مجبور کر لیا۔ اس طرح ہمارا آٹھ افراد کا

قافلہ اس وادی میں پہنچا یعنی ایک عثمان بھائی خود' دوسری میں' تیسری ماں چوتھا چچا' دو بوڑھی خادمائیں اور دو ملازم۔

کچھ دن تک تو ہم لوگ بہت اداس رہے۔ لیکن قدرت نے اس وادی کو حسن و دلکشی کا وافر حصہ دے رکھا تھا۔ اس لئے ہم چند ہی دن میں اس قدرتی زندگی کے عادی ہو گئے۔

بھائی عثمان فطرتاً" خشک طبیعت اور خلوت پسند واقع ہوئے تھے اس احاطہ کے دوسرے سرے پر جو عمارت کھڑی ہے' یہ ان کی لائبریری تھی۔ وہ دن میں ایک مرتبہ ماں سے ملنے آتے' باقی تمام وقت اسی لائبریری میں گزارتے اور رات کو بہت دیر سے گھر آتے۔ مجھے اس تجربہ گاہ کی طرف جانے کا حکم نہ تھا۔ بلکہ گھر میں بھی جب کبھی میرا ان کا سامنا ہو جاتا تو خواہ مخواہ ایسی ڈانٹ بتاتے جس سے میں سہم جاتی اور ہمیشہ ان کی نظروں سے دور رہنے کی کوشش کرتی۔

دن گزرتے گئے۔ میری ماں نے مجھے اردو فارسی کی کتابیں پڑھائیں اور تھوڑا بہت لکھنا بھی سکھایا۔ لیکن بدقسمتی نے ساتھ نہ چھوڑا' جب بارہ سال کی ہوئی تو ماں نے انتقال کیا۔ تھوڑے عرصہ بعد چچا بھی مر گیا اور پھر دونوں ملازم اور ایک خادمہ بھی یکے بعد دیگرے ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گئے۔

اب بھائی عثمان کے علاوہ صرف میں اور بوڑھی خادمہ گھر میں باقی رہ گئے۔ بھائی عثمان بدستور اپنی لائبریری میں رہتے تھے۔ گو اب انہوں نے اپنی سخت گیری سے ہاتھ اٹھا لیا تھا مگر مجھے منہ بھی نہ لگاتے تھے۔ میں مجبوراً تنہائی کی زندگی بسر کرتی رہی۔ آخر جوں جوں میری عمر بڑھتی گئی مجھے احساس ہونے لگا کہ میں اس گھر میں غیر ہوں اور اسی وجہ سے بھائی عثمان مجھ سے کھنچے کھنچے سے رہتے ہیں۔ حالانکہ میری ذات سے کبھی انہیں تکلیف نہیں پہنچی۔

عمر کے ساتھ حوصلہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میں نے تہیہ کر لیا کہ آج ضرور بھائی عثمان سے اس شدید اور نامعلوم نفرت کی وجہ دریافت کروں گی۔ اگر میرا وجود ہی ان کے کسی دکھ کا باعث ہو تو میں اس گھر سے رخصت ہو جاؤں گی۔

اسی خیال سے میں رات کو دیر تک ان کا انتظار کرتی رہی۔ انہوں نے اس دن کھانا بھی نہ کھایا۔ بوڑھی خادمہ بیچاری ان کا کھانا آتش دان کے قریب رکھے دیوار کے سہارے خراٹے بھرتی رہی۔ ادھر میں ان کے انتظار میں بستر پر کروٹیں لے رہی تھی۔ حتیٰ کہ یہ انتظار کی گھڑیاں میرے لئے ناقابل برداشت ہو گئیں' ناچار میں لائبریری کی طرف چلی گئی۔

مگر دروازہ پر پہنچ کر کچھ جھجکی۔ بھائی عثمان کی خفگی کے خیال سے کانپ گئی۔ تاہم میں نے فوراً ہی اپنے دل کو مضبوط کیا کہ بھائی عثمان بھی تو آخر انسان ہی ہیں، کوئی ہوا تو نہیں۔ میں نے دستک دینے کے ارادے سے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو دروازے کا پٹ ہاتھ لگتے ہی چو سے کھل گیا۔ میں بوکھلا کر پیچھے ہٹی۔ میرا خیال تھا کہ ابھی بھائی عثمان اپنی بھاری بھرکم آواز میں للکار کر کہیں گے۔ کون ہے۔ لیکن جب خلاف امید کوئی آواز نہ آئی تو میں نے جھانک کر اندر دیکھا۔

کمرہ خالی تھا میں چپکے سے اندر داخل ہوئی۔ طاقچہ پر موم بتی جل رہی تھی۔ میز پر کتابیں بے ترتیبی سے بکھری ہوئی تھیں قریب ہی بھائی عثمان کی ٹوپی پڑی تھی اور کوٹ ایک طرف کھونٹی پر لٹک رہا تھا۔ کمرے میں کسی دوا کی ہلکی ہلکی بو پھیل رہی تھی۔ میں حیران تھی کہ بھائی عثمان ایسی بے سرو سامانی سے کہاں جا سکتے ہیں۔ یک دم میری نظر دیوار سے لگے ہوئے ایک بڑے قطعہ پر پڑی جو مجھے کچھ عجیب سا معلوم ہوا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ تو اس پر لکھی ہوئی سطروں میں حروف کے بجائے اعضاء کی صورتیں دی گئیں تھیں۔ مثلاً کان، ناک، آنکھیں، زبان، دانت، دل، معدہ، تلی، کلیجہ، بھیپھڑے، گردے وغیرہ۔ ہر ایک عضو کی تصویر دے کر عبارت کے طریقہ پر سطریں لکھی گئی تھیں۔ نہ جانے یہ کونسی زبان تھی۔ میں دیر تک اسے سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ مگر کامیاب نہ ہوئی۔

قریب ہی ایک الماری تھی۔ جس کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔ اتفاقاً میری نظر اس کے اندرونی حصہ تک پہنچی۔ یہ الماری دراصل ایک چھوٹا سا صندوق نما کمرہ تھا جس کے اندر ایک زینہ تھا۔ جو نیچے گہرائی میں جا رہا تھا۔

معاً مجھے خیال آیا کہ ہو نہ ہو ضرور بھائی عثمان نے اپنی تفریح کی کوئی جگہ بنا رکھی ہے لہٰذا یہ اسرار کھولنے کے لئے میں دبے پاؤں نیچے اترنے لگی تو بہت سی سیڑھیاں اترنے کے بعد کچھ روشنی دکھائی دی۔

تحت الثریٰ میں ایک چھوٹا سا تہ خانہ تھا جس میں عجیب قسم کی روشنی ہو رہی تھی۔ سیڑھیوں کے قریب ہی لکڑی کا ایک بڑا سا شیلف پڑا تھا جس میں پتھر کے بڑے بڑے مرتبان اور ٹین کے بڑے بڑے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔

میں رینگتی ہوئی اس شیلف کے پیچھے چھپ گئی اور شیلف کے کونے سے جھانک کر اندر کا نظارہ کرنے لگی۔ تہ خانہ کے کونے میں آگ جل رہی تھی۔ اس آگ کا رنگ بالکل سبز تھا اور یہ تہ خانہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا مگر اس دھوئیں سے دم گھٹنے کی بجائے ایک

طرح کی فرحت حاصل ہوتی تھی۔ تہہ خانے کا اندرونی حصہ اس دھوئیں کی کثیف چادر میں لپٹا ہوا بالکل ایک سبز غبارے کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اس غبارے میں سامنے لکڑی کا ایک بڑا سا میز رکھا تھا جس پر پھولوں کی سیج بچھی ہوئی تھی اور اس سیج پر کوئی سفید چادر اوڑھے سو رہا تھا سونے والے کی پائنتی کی طرف دو تین شیشے کے پیالے پڑے تھے جن میں کوئی سیاہ سی چیز پڑی ہوئی بل رہی تھی' کونے کے قریب ہی آگ سے تھوڑی دور دیوار کے ساتھ ویسا ہی ایک قطعہ لٹک رہا تھا جیسا کہ میں اوپر ابھی دیکھ چکی تھی۔ اس قطعہ کے سامنے بھائی عثمان بت بنے کھڑے تھے۔ ان کی پشت میری طرف تھی۔

یک لخت وہ میز کی طرف پلٹے تو ان کے ہاتھ میں بھیپھڑوں سمیت ایک کلیجہ دکھائی دیا جو انہوں نے سانس والی نالی کے اوپر والے سرے سے پکڑ رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ میں بھاگ جانا چاہتی تھی۔ مگر طاقت نے جواب دے دیا اور لرزاں براندام شیلف کے سہارے بیٹھی ہوئی سب کچھ دیکھتی رہی۔

بھائی عثمان کے ہاتھ میں پکڑا ہوا کلیجہ پوری طرح تڑپ رہا تھا جسے انہوں نے شیشے کے خالی پیالے میں ڈال دیا۔ اس کلیجہ کی حرکت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ وہ اچھل اچھل کر پیالے سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ بھائی عثمان نے اب جیب سے گھڑی نکالی اور دیر تک اس کی حرکت کا گھڑی کی رفتار سے مقابلہ کرتے رہے۔

اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ سونے والے کے سرہانے پہنچے اور اس کے منہ سے کپڑا ہٹا کر اس پر جھک گئے۔ اور بہت دیر تک اسے دیکھتے رہے وہ کبھی آہستگی سے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرتے کبھی ہلکی ہلکی جنبش دے کر اسے جگانے کی کوشش کرتے مگر سونے والے نے کوئی حرکت نہ کی۔ آخر اس کی بیداری سے مایوس ہو کر بھائی عثمان نے اس پر سے چادر اتار دی۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ ایسی گہری نیند سونے والی ایک نیم برہنہ عورت تھی۔ گو اس کا چہرہ بھائی عثمان کے سائے کی اوٹ میں ہونے سے مجھے دکھائی نہ دیا مگر اس کے جسم کے باقی حصہ' جو سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا' صاف ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی مریضہ ہے۔

بھائی عثمان نے اس مریضہ کو گود میں اٹھا لیا اور جلتی آگ کے پاس کھڑے ہو کر اس کے جسم کو آگ کی گرمی پہنچانے لگے۔ دفعتاً" مجھے اس مریضہ کے چہرے کی تھوڑی سی جھلک دکھائی دی۔ جس سے مجھ پر دہشت طاری ہو گئی۔ آہ وہ ایک لاش تھی۔ جس کی ٹانگیں ایک طرف لٹک رہی تھیں۔ سر اور بازو دوسری طرف' اس کی لاش کے لمبے لمبے

بکھرے ہوئے بال بھائی عثمان کے پاؤں کو چھو رہے تھے۔

خوف و ہراس سے مجھ پر ایک تشنجی دورہ پڑا اور تہہ خانہ ایک سبز غبارے کی طرح ہوا میں اڑتا ہوا معلوم ہوا۔ ایک ہولناک چیخ میرے منہ سے نکلی اور بیہوش ہو گئی۔

شگوفہ یہاں تک پہنچ کر یک دم رک گئی۔ وہ کچھ تھکی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اور ادھر پرندہ میری بغل میں دم توڑ رہا تھا۔ میں نے مضطرب ہو کر کہا۔

خدا کے لئے جلد کہانی ختم کرو۔ تمہاری اس طویل کہانی سے اس جانور کا خواہ مخواہ خون ہو جائے گا۔"

شگوفہ نے بری طرح ہانپ کر کہ۔ "پھر اسی پرندے کا ذکر۔"

ایک دفعہ میں کہہ چکی ہوں کہ یہ مارنے کی خاطر تمہاری بغل میں دیا گیا ہے۔"

مجھے اس کی سنگدلی پر افسوس ہوا۔

تھوڑے وقفے کے بعد اس نے کہنا شروع کیا

"اس پرہول واقعہ کے بعد جب میں ہوش میں آئی۔ تو خود کو اپنے بستر پر پڑا ہوا پایا۔ میں نے خیال کیا کہ یہ سب کچھ میں نے خواب میں دیکھا ہے۔ چونکہ سردی سے میرے بدن میں کپکپی ہو رہی تھی لہٰذا میں نے بوڑھی خادمہ کو آواز دی تاکہ آتش دان میں آگ سلگائے مگر میری متعدد آوازوں پر بھی جب بڑھیا نے کوئی جواب نہ دیا تو میں گھبراہٹ میں اٹھ کر اس دروازے تک گئی جو میری اور بڑھیا کی خواب گاہ کے درمیان تھا۔

بڑھیا کو کمرے میں نہ پا کر میں بدحواسی سے باہر برآمدے میں نکل آئی۔ خدا کی پناہ تحت الثریٰ کی تاریک رات میں مہیب سرخ روشنی کے شعلے بڑھتے پھیلتے دکھائی دیئے۔ فضا دھوئیں سے بھرپور تھی۔ میں کانپتی ہوئی آگے بڑھی تو معلوم ہوا۔ کہ بھائی عثمان کی لائبریری دھڑا دھڑ جل رہی ہے۔ جسے دیکھ کر اس تہ خانے کا سارا سین میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور مجھے یقین کرنا پڑا کہ جو کچھ میں نے دیکھا وہ خواب نہ تھا۔ مگر یہ آگ کیسے لگی کیا بھائی عثمان نے خود لگائی۔ لیکن کیوں۔ کہیں انہوں نے خود کشی نہ کر لی ہو۔

یہ خیال آتے ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور میں نے بے تحاشا چیخیں مارنی شروع کیں۔ میری اس چیخ و پکار پر بوڑھی خادمہ بھائی عثمان کے کمرے سے نکلی۔ میں دوڑ کر اس سے لپٹ گئی اور روتے ہوئے پوچھا کہ بھائی عثمان کہاں ہیں؟

اس نے کہا۔ "اپنے کمرے میں۔"

میں نے کہا۔ "تو کیا ان کو آتشزدگی کی خبر نہیں۔"

بڑھیا نے جواب دیا کیوں نہیں"

میں نے کہا۔ "تو وہ پھر اسے بجھانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔"

بڑھیا نے کہا۔ "ناممکن بات کی کوشش سے کیا فائدہ؟"

میں نے پھر کہا۔ "مگر کم از کم وہ باہر آ کر اسے دیکھ ہی لیتے۔"

بڑھیا نے روکھے پن سے کہا۔ "یہ ان کی مرضی پر منحصر ہے۔ تم فوراً اپنے کمرے میں جاؤ۔ یہاں دھوئیں میں بیمار ہو جاؤ گی۔"

میں نے مچلتے ہوئے کہا۔ "مجھے بھائی عثمان کے پاس لے چلو"

بڑھیا نے سختی سے کہا "نہیں تمہیں اپنے کمرے میں جانا ہو گا۔ اس وقت وہ تمہیں نہیں مل سکتے۔"

میں مایوس ہو کر اپنے کمرے میں آ گئی اس وقت میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھ رہے تھے۔ جن کا میں نے بوڑھی خادمہ پر بھی اظہار کیا۔ اس نے کہا۔

"نادان لڑکی اگر وہ سلامت نہ ہوتے تو تمہیں یہاں اٹھا کر کون لاتا؟"

"تو کیا بھائی عثمان مجھے اٹھا کر لائے ہیں۔" میں نے متعجب ہو کر کہا۔

بڑھیا نے کہا۔ "تو کیا میں لائی ہوں۔ اب زیادہ باتیں نہ بناؤ اور سو جاؤ۔"

میں بڑھیا کے اصرار پر بستر پر پڑ رہی۔ مگر ایسی حالت میں سو کون سکتا ہے وہ آگ تمام رات بھڑکتی رہی۔ اتفاقاً صبح کے قریب بارش شروع ہو گئی جس سے یہ منحوس آگ فرو ہوئی۔

اس واقعہ کے بعد میں دو ماہ تک بھائی عثمان کو نہ دیکھ سکی لیکن بوڑھی خادمہ کا ان کے کمرے میں آنا جانا بتاتا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں ہیں اور گوشہ نشینی اختیار کر چکے ہیں۔ کئی بار مجھے خیال آیا کہ جا کر ان سے معافی مانگوں۔ مگر میں مجرم تھی اور وہ انتہائی سخت گیر واقع ہوئے تھے' اس لئے جرات نہ ہوئی اور میں اپنی اس بیوقوفانہ حرکت پر بہت نادم تھی۔

خزاں کا آغاز تھا نہایت اداس اور خشک دوپہر تھی۔ میں آتش دان کے قریب سرنگوں بیٹھی تھی کہ بوڑھی خادمہ نے آ کر مجھ سے کہا۔ "شگوفہ جان تمہیں آغا بلا رہے ہیں۔"

اس اچانک بلاوے نے مجھے کسی حد تک خوفزدہ کر دیا۔ نہ جانے بھائی عثمان اب مجھے کیا سزا دیں۔ چنانچہ میں سہمی ہوئی ان کے کمرہ میں گئی۔

آج پہلی دفعہ میں نے ان کا کمرہ دیکھا تھا۔ اس نیم تاریک کمرہ میں گہرے سبز رنگ کے اونی پردے پڑے تھے۔ اور چھت میں ایک بہت بڑی پیتل کی قندیل لٹک رہی تھی جس

میں رکھے ہوئے ایک پیتل کے چو مکھے چراغ میں بیروزہ کی بتیاں جل رہی تھیں اور بیروزہ کی تیز بو تمام کمرہ میں پھیل رہی تھی۔ آتش دان میں ایک خاص قسم کی لکڑی سلگ رہی تھی۔ جس کی روشنی بالکل سبز تھی بیروزہ کی گہرے بادامی رنگ کی روشنی اس سبز روشنی کے گرد دھوئیں کی تہہ کی طرح لپٹی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جس سے یہ کمرہ بھی ایک سبز غبارے کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ یہاں بھی وہی تصویروں کی زبان میں لکھے ہوئے قطعے لٹک رہے تھے اور قالین پر بھی کچھ ویسے ہی نشانات تھے۔ اس انوکھے ماحول سے میں بہت گھبرائی۔

بھائی عثمان بستر پر نیم دراز تھے' میں ان کو دیکھ کر ٹھٹھکی۔

"آ جاؤ شگوفہ بہن" انہوں نے نرمی سے کہا۔

ان کے منہ سے یہ الفاظ سن کی میری جان میں جان آ گئی' میں خوشی اور تعجب کے ملے جلے احساس سے کانپتی ہوئی آگے بڑھی' انہوں نے مجھے اپنے قریب ایک تپائی پر بٹھا لیا۔ وہ بہت لاغر ہو رہے تھے اور ان کی کلائیوں پر بہت بڑے بڑے سفید داغ دکھائی دیتے تھے۔ ان کو مہربان پا کر میں نے دبی زبان سے پوچھا۔

"یہ آپ کی کلائیوں پر نشان کیسے ہیں؟"

"یہ جل گئی ہیں تمہاری مہربانی سے شگوفہ انہوں نے اداسی سے کہا۔

مجھے افسوس ہوا اور میں نے معافی کی غرض سے اپنا سر ان کے پاؤں پر رکھ دیا۔

انہوں نے میرا سر آہستہ سے اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "شگوفہ میں تمہیں ملامت نہیں کرتا۔ بلکہ اچھا ہوا کہ تم اس راز سے واقف ہو گئیں۔ مجھے تم سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔"

میں نے حیرت سے بھائی عثمان کا منہ دیکھا کیونکہ میں نہ جانتی تھی کہ کون سا راز مجھ پر ظاہر ہوا ہے۔ آخر میں نے حوصلہ کر کے کہہ دیا۔

"میں تو کسی راز سے بھی واقف نہیں ہوئی۔"

بھائی عثمان نے کہا۔ "تو پھر تم تہہ خانے میں کیوں گئی تھیں؟"

جس پر میں نے ان سے وہاں جانے کا سارا ماجرا بیان کیا۔ بھائی عثمان کہنے لگا۔

"اچھا تو میرا خیال تھا کہ تم اکثر وہاں جایا کرتی ہو"

میں نے جواب دیا۔ "اگر میں پہلے کبھی گئی ہوتی تو اتنی خوفزدہ کیسے ہوتی۔"

بھائی عثمان نے کہا "بیشک"

پھر کچھ سوچ کر کہنے لگے۔ "شگوفہ اب تم سیانی ہو گئی ہو او یہ بھی جانتی ہو کہ تمہارا میرے سوا اس دنیا میں کوئی عزیز نہیں ہے اور نہ تمہارے سوا میرا۔ اس لئے بہن بھائی کی حیثیت سے ایک دوسرے کی مصیبت میں کام آنا ہمارا فرض ہے۔"

میں نے کہا۔ "ضرور"

انہوں نے کہا۔ "اچھا مجھے قول دو۔"

آہ میں نے انہیں بے سمجھے بوجھے قول دے دیا۔

بعدازاں بھائی عثمان نے مجھے بتایا کہ اس واقعہ کے اٹھارہ سال پیشتر وہ ایک پارٹی کے ساتھ اس علاقہ میں آئے تھے تو ایک غریب لاغر پہاڑی گوالے کی لڑکی کو دل دے بیٹھے۔ فرحہ گو ایک گوالے کی لڑکی تھی۔ مگر اتنی خودار اور قانع واقع ہوئی تھی کہ انتہائی کوششوں کے باوجود ان سے مانوس نہ ہوئی آخر انہوں نے اس کے باپ کو کسی نہ کسی طرح رام کر لیا۔ اور اس نے اس شرط پر ان کا نکاح فرحہ سے کر دیا کہ وہ اسی گاؤں میں سکونت اختیار کریں۔ مگر آہ ان کی قسمت میں سکھ نہ تھا۔ شادی کے بعد جلدی ہی ان کے سہانے خوابوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ کیونکہ فرحہ دق کی مریض تھی اور وہ ان کی ان تھک کوششوں کے باوجود جانبر نہ ہو سکی۔

انہیں اس کی موت کا اتنا صدمہ ہوا کہ زندگی دوبھر ہو گئی وہ فرحہ کے علاج کے دوران میں کئی ایک ایسی جڑی بوٹیوں سے واقف ہو چکے تھے جن کی عجیب و غریب خاصیتیں تھیں' چنانچہ ایک ایسی جڑی کا بھی انہیں علم تھا۔ جس کے پھولوں پر اگر لاش رکھ دی جائے تو وہ خراب ہونے سے محفوظ رہتی ہے۔ اور یہ بیروزہ کی بتیاں بھی دق کے جراثیم کو ہلاک کرتی ہیں۔ لہٰذا انہوں نے فرحہ کی لاش کو محفوظ رکھنے کے لئے اپنے کتب خانہ کے نیچے ایک تہ خانہ بنایا اور اس خاص بوٹی کے پھولوں کی سیج بنا کر اس پر فرحہ کو لٹا کر تہ خانہ میں بند کر دیا اور خود بیراگی بن کر جنگلوں اور بنوں میں آوارہ گردی کرنے لگے کبھی مہینے میں ایک آدھ دفعہ یہاں آتے اور لاش پر تازہ پھول ڈال جاتے۔

اسی دوران میں اتفاقاً انہیں ایک ایسا سنیاسی مل گیا جو ایک خاص علم جانتا تھا۔ جسے ڈائنوں کا علم کہا جاتا ہے یہ علم ایک خاص زبان میں پڑھا جاتا ہے اور اس کی عبارت اعضاء کی صورت میں لکھی جاتی ہے جس کا عمل انسانی یا حیوانی اعضاء کو آسانی سے بدل سکتا ہے یا بالکل علیحدہ کر سکتا ہے۔

چنانچہ سنیاسی سے یہ علم حاصل کر کے انہیں اتنی خوشی ہوئی جیسے انہوں نے کونین کی

دولت پا لی۔ محبت کی رنگینیاں' زندگی کی دلچسپیاں اور امیدوں کا ہرا بھرا باغ ان کی آنکھوں کے سامنے لہلہانے لگا۔ انہیں یقین تھا کہ اس عمل کے ذریعہ فرحہ کو دوبارہ زندگی دے سکیں گے غرضیکہ وہ انہیں ارمانوں کو دل میں لئے واپس آئے اور اس علم کے ذریعہ انہوں نے بغیر کسی قسم کے اپریشن کے اس کے ناکارہ بھیپھڑے کلیجہ سمیت نکال دیئے اور بکری کے تازہ بھیپھڑے اس کے جسم میں داخل کئے لیکن چونکہ اس کو مرے ہوئے عرصہ گزر چکا تھا۔ اس لئے اس کا جسم سڑ کر ضائع ہو چکا تھا اور گوشت بالکل سوکھ کر لکڑی بن گیا تھا اس لئے وہ زندہ نہ ہو سکی۔ گو اس نے چند سانس لئے مگر پھر جلدی ختم ہو گئی۔

گو اب انہیں اس کی زندگی سے بالکل مایوسی ہو گئی تھی لیکن خبط کا کیا علاج جس کے زیر اثر وہ بار بار ناکارہ بھیپھڑے نکال کر نئے ڈالتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاید بار بار ایسا کرنے سے اس کا جسم بھی تازہ ہو سکے۔ اس جدوجہد میں ان کہ صحت خراب ہو گئی' اب انہیں محسوس ہوا کہ غور پرداخت کرنے والا ضرور کوئی ان کے پاس ہونا چاہیے لہٰذا اسی لئے والدہ کو یہاں لے آئے۔ جن کے آنے سے ان کی حالت بہت سنبھل گئی اور اسی طرح انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزار دیا۔ مگر تھوڑے عرصہ سے وہ خود کو دق کا مریض تصور کرنے لگے۔ چونکہ وہ کئی جڑی بوٹیاں جانتے تھے اس لئے ان کے ذریعہ انہوں نے مرض کو دبا دیا۔ مگر مرض جڑ سے نہ گیا۔

اب ان کے لئے ضرور تھا کہ فرحہ کو زندہ کرنے کا خیال چھوڑ دیں وہ خود بھی اس کام سے بیزار ہو چکے تھے۔ مگر نہ معلوم کیوں اس کام سے باز نہ آئے۔ آخر خدا نے ان کی مدد کی کہ اس روز تہ خانے میں میری چیخ سن کر ایسے بوکھلائے کہ فرحہ کی لاش ہاتھوں سے چھوٹ کر جلتی آگ میں جا پڑی جس سے شعلے بھڑکنے لگے۔ وہ بدحواسی سے بھاگ رہے تھے کہ راستہ میں مجھ پر نظر پڑی مجھے وہاں سے اٹھا لائے لیکن خدا جانے ان کی کلائیاں کیسے جل گئیں۔

اب وہ کئی دن سوچ رہے تھے کہ یہ بیماری جو انہیں لگ چکی ہے کس طرح رفع ہو۔ کہاں تک وہ اسے جڑی بوٹیوں کے ذریعے قابو میں رکھ سکیں گے اگر ذرا بھی بے احتیاطی ہو گئی تو جان کے لالے پڑ جائیں گے لہٰذا اس دن ایک تدبیر ان کے ذہن میں آئی کہ اگر میں یہ علم ان سے سیکھ کر ان کے بھیپھڑے بکری کے تازہ بھیپھڑوں سے بدل دوں تو ان کی زندگی محفوظ ہو سکتی ہے۔ میں نے حامی بھر لی۔

غرضیکہ کچھ دن بعد مجھے اسی تہ خانہ میں لائے جس میں کبھی فرحہ کی لاش رکھی گئی تھی

جو آتش زدگی کے بعد انہوں نے از سر نو تعمیر کیا تھا- میز پر لیٹ کر انہوں نے مجھے دو طلسم سکھائے اور بکری کے تازہ پھیپھڑے جو خاص طور پر اس کام کے لئے تیار رکھے تھے- مجھے دیئے اور ہدایت کی کہ پہلے طلسم کے اثر سے جب ان کے پھیپھڑے باہر نکل آئیں تو دوسرا طلسم بکری کے پھیپھڑوں پر پڑھنے سے یہ ان کے جسم میں خودبخود داخل ہو جائیں گے- آہ میں نے اس کام کو معمولی سمجھ رکھا تھا- لیکن جونہی میں نے طلسم پڑھا تو بھد سے کوئی چیز میرے پاؤں کے قریب آگری میں نے جھک کر دیکھا- کہ ایک پھیپھڑا معہ جگر کے میرے پاؤں میں تڑپ رہا تھا-

میرا دل ہل گیا- میں نے گھبرا کر بھائی عثمان کی طرف دیکھا- ان کا رنگ اس وقت ایسا زرد ہو رہا تھا' کہ میں حواس باختہ ہو گئی- میری حالت دیکھ کر انہوں نے مجھے اشارہ سے بلایا- مگر میں بت بنی کھڑی رہی آخر انہوں نے اونچی آواز سے کہا- "شگوفہ کیا دیکھ رہی ہو- اپنا کام شروع کرو- بیماری نے پہلے ہی مجھے نڈھال کر رکھا ہے- میں اس حالت میں زیادہ دیر تک زندہ نہ رہ سکوں گا-

نہ جانے مجھے اس وقت کیا ہو گیا کہ انتہائی کوشش کے باوجود میں حرکت نہ کر سکی اور متوحش نگاہوں سے ان کے زرد اور مدقوق چہرے کو دیکھتی رہی "آہ بدبخت لڑکی-" بھائی عثمان غصے سے تلملاتے ہوئے کہا اور پوری طاقت سے اٹھ کر بیٹھ گئے- اف اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ایک لاش اٹھ رہی ہے خوف و ہراس سے خون میری رگوں میں جم گیا- اور بیہوش ہو گئی-

جب میں ہوش میں آئی تو تہ خانہ میں مکمل خاموشی تھی اور بھائی عثمان چند قدم پر اوندھے پڑے تھے- میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ- بے تحاشا سیڑھیوں کی طرف بھاگی اور اوپر جا کر کتب خانہ سے باہر نکلتے ہی دھاڑیں مار مار کر رونے لگی-

اسی وقت بوڑھی خادمہ دوڑتی ہوئی آئی اور مجھے پچکارے ہوئے رونے کی وجہ پوچھنے لگی- میں نے سارا ماجرا اس سے بیان کر دیا- پہلے تو اس نے مجھے بہت ملامت کی پھر اپنے فرض سے آگاہ کرتے ہوئے اس کام کو انجام دینے کے لئے منت سماجت کرنے لگی- اب کھلی ہوا میں میرے حواس بھی کچھ بجا ہوئے- مجھے اپنی کمزوری پر سخت ندامت ہوئی اور بوڑھی خادمہ کے سمجھانے سے میں دوبارہ تہ خانہ میں جانے کے لئے تیار ہو گئی-

اس دفعہ مجھے دلیری بھی تھی کیونکہ بوڑھی خادمہ میرے ساتھ تھی- وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بھائی عثمان ٹھنڈے ہو چکے تھے- ہم دنوں نے اٹھا کر انہیں میز پر لٹایا اور میں نے

بکری کے بھیپھڑے پر طلسم پڑھنا شروع کیا۔ چند منٹ کے بعد وہ بھیپھڑا حرکت کرنے لگا۔ میں نے اپنا عمل جاری رکھا۔ آہ وہ بھیپھڑا صرف حرکت ہی کرتا تھا۔ مگر بھائی عثمان کے جسم میں داخل نہ ہوتا تھا۔ میں حیران تھی کہ یہ طلسم اپنا اثر پوری طرح کیوں نہیں کرتا۔ لیکن مجھے جلدی ہی معلوم ہو گیا۔ کہ میں طلسم پورا نہیں پڑھ رہی اس کا ایک آخری حرف بھول چکی ہوں۔ اپنی غلطی سے آگاہ ہو کر میں نے سر پیٹ لیا آہ اگر میں دل کو مضبوط رکھتی تو اپنے عمل میں کامیاب ہو سکتی تھی۔ اب وہ مر چکے تھے۔ بھولا ہوا حرف کون یاد دلاتا۔ اس کے بعد جب تک ان کی لاش ٹھیک تھی، میں نے انہیں زندہ کرنے کی جدوجہد جاری رکھی۔

بھائی عثمان کے مرنے کے بعد گاؤں کے آوارہ لڑکے میرے پیچھے پڑ گئے اور ایک دن رات کے وقت نہ جانے کس طرح میرے جھونپڑے میں گھس آئے، میں اس وقت ایک بندر کے نکالے ہوئے بھیپھڑے اور کلیجے پر اپنا عمل کر رہی تھی۔ بندر کی لاش بھی سامنے پڑی تھی یہ حالت دیکھ کر وہ اتنے خوفزدہ ہوئے کہ بجائے سیدھے راستے بھاگنے کے کھڑکی سے کود گئے جن میں سے ایک تو نیچے گرتے ہی مر گیا۔ اور دوسرے بھاگ نکلے اور انہوں نے گاؤں میں جا کر مجھے ڈائن مشہور کر دیا۔ اس دن سے کسی نے بھی میرے جھونپڑے کی طرف آنے کی جرات نہ کی۔

ایک سال گاؤں میں وبا پھیل گئی "یہ ایک نئی بیماری تھی یعنی پہلے زکام کی شکایت ہوتی۔ ساتھ ہی سر میں درد ہوتا۔ دوسرے دن ناک اور منہ سے خون آتا جس سے مریض فوراً مر جاتا۔ لہٰذا ان لوگوں نے اپنی جہالت کی وجہ سے وبا کا خالق مجھے ہی قرار دیا اور میرے قتل کے منصوبے ہونے لگے۔

اکیلی عورت کو مارنا بھلا کون سی بڑی بات ہے کیونکہ اب میری بوڑھی خادمہ بھی مر چکی تھی۔ چونکہ میں ان کی نظروں میں عورت نہ تھی بلکہ ایک ڈائن تھی اس لئے وہ اس سازش کو عملی جامہ پہنانے سے ہچکچاتے رہے۔

نوری ایک یتیم لڑکی تھی جو کبھی کبھی مجھ سے پھٹا پرانا کپڑا یا بچا کھچا کھانا لے جایا کرتی۔ ایک دن اس نے مجھے گاؤں والوں کے ارادے سے آگاہ کیا۔ اسی دن میں شام کو خود گاؤں میں گئی۔

نمبردار کی حویلی میں اس وقت محفل جم رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے میں نے گرج کر کہا۔

"مجھے اپنے علم کے زور سے معلوم ہوا ہے کہ گاؤں میں میرے خلاف ہنڈیا پک رہی ہے۔ اس لئے میں تمہیں آگاہ کرنے آئی ہوں۔ کہ ڈائن کسی کے مارے نہیں مرتی اور اگر وہ مر بھی جائے تو اس کی بددعا کبھی نہیں مر سکتی۔"

میرا یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ گاؤں والوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ میری منتیں کرنے لگے وباء سے انہیں بچاؤں۔

میں نے بھائی عثمان سے سن رکھا تھا کہ یہاں ایک خاص قسم کا لہسن پیدا ہوتا ہے جس کے کھانے سے ہر قسم کے زکام کے جراثیم مر جاتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ان سے کہا کہ کل گاؤں کے معززین میرے ڈیرے پر آئیں اور فلاں قسم کا لہسن کا ایک ٹوکرا بھر کر ساتھ لائیں۔

دوسرے دن وہ لوگ لہسن کا ٹوکرا لے کر میرے گھر آئے تو میں نے یہ شرط پیش کی کہ ان تینوں گاؤں کے لوگ اگر مجھے اپنا پیر بنائیں اور نذرانہ دیا کریں تو میں وباء دور کر دوں گی انہوں نے میری شرط منظور کر لی۔

سمجھوتہ ہونے کے بعد میں نے لہسن پر جھوٹ موٹ دم کر دیا اور حکم دیا کہ یہ لہسن وبا زدہ لوگوں کو کھلایا جائے جب اس لہسن کے کھانے سے وبا زدہ لوگ اچھے ہونے لگے تو میرا سکہ ان کے دلوں پر بیٹھ گیا۔ اس دن سے یہ لوگ مجھے نذرانہ دینے لگے اور فارغ البالی سے میری گزر اوقات ہوتی رہی حتیٰ کہ وہ دن بھی آ پہنچا کہ آپ سے ملاقات ہوئی اور آپ کی محبت میرے من میں بس گئی' مگر پھر جب آپ مجھے چھوڑ کر چلے گئے تو میرا برا حال ہوا میں زندگی سے بیزار رہنے لگی آخر ایک مدت کے بعد میری محبت کی کشش پھر آپ کو یہاں کھینچ لائی تو ظالموں نے آپ کو بہکانا شروع کیا۔ آخر آپ انسان تھے۔ دھوکے میں آ گئے اب اگر میں لاکھ صفائی پیش کروں' پھر بھی آپ کی محبت اور ہمدردی حاصل نہیں کر سکتی۔ آپ ہمیشہ مشکوک رہیں گے۔

(5)

شگوفہ نے اپنی کہانی ختم کرتے ہی نہایت غمگین ادا سے سر جھکا لیا اور کسی گہری سوچ میں پڑ گئی۔ میری بغل میں بدنصیب پرندے کی تڑپ بھی دم بدم کم ہو رہی تھی۔ میں نے اس کی لمبی خاموشی سے اکتا کر کہا۔

"بس کہانی تو ختم ہو گئی۔ اب مجھے اجازت دو کہ اس پرندے کو رہا کروں تاکہ یہ کم از

کم آخری سانس تو کھلی ہوا میں لے سکے۔"

شگوفے نے کچھ جواب نہ دیا اور حس و حرکت بیٹھی رہی' یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ کانپ رہی ہے' میں نے محبت سے اس کے سیمیں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔

اف وہ برف کی طرح سرد ہو رہے تھے۔ میں بے اختیار اس سے لپٹ گیا۔ مگر اس کی حالت بدستور رہی' میں نے اسے جھنجھوڑ کر زور سے پکارا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنا خوشنما سر اونچا کیا۔ اس کا چہرہ بالکل سفید ہو چکا تھا اور اس کی شرابی آنکھیں سچ مچ بدمستیوں کی طرح نیم باز تھیں۔

اس نے آہستہ آہستہ اپنی کانپتی ہوئی مرمریں بانہیں اٹھا کر میرے گلے میں ڈال دیں۔ میں نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

"شگوفہ تمہارا جسم اتنا سرد کیوں ہے کیا کچھ بیمار ہو؟"

وہ خاموش رہی۔ میں نے پھر پکارا۔

"شگوفہ"

"میرے آقا۔" اس نے رکتے ہوئے کہا۔ "میں نے ڈائن کا ذلیل لفظ اپنے نام سے ہمیشہ کے لئے مٹا دیا۔"

یہ کہتے ہوئے اس کا سر خودبخود میری چھاتی سے لگ گیا اور اس کے پھول سے لب ہمیشہ کے لئے کمہلا گئے۔ میں نے سمجھا کہ وہ غشی کی حالت میں ہے لیکن میری انتہائی کوششوں کے باوجود اس کی دائمی غشی دور نہ ہو سکی۔

شگوفہ کی اس اچانک موت سے میرا کلیجہ پھٹنے لگا اور میں تمام رات گریہ و زاری کرتا رہا۔

صبح جب گاؤں والے اس کی تجہیز و تکفین کی تیاری کرنے لگے تو مجھے اس پرندے کا خیال آیا جو رات کو شگوفہ نے میری بغل میں دیا تھا۔ دیکھا تو وہ بدستور ٹپکے میں لپٹا ہوا ایک طرف پڑا تھا۔ میں نے بیتابی سے اٹھا کر اسے کھولا۔ آہ! یہ پرندہ دراصل شگوفہ کے پھیپھڑے اور کلیجہ تھا۔

حجاب امتیاز علی

بیمار غم

ابھی تو زردی ہے رخ پہ کم کم' ابھی سے روتے ہیں سارے ہمدم
یونہی جو چندے رہی تپ غم' تو پھر لہو بھی نہیں رہے گا

اسے لا کر اس کی خواب گاہ میں لٹا دیا گیا۔ رات گرم تھی اور ویران۔ اس کی خواب گاہ کی دیواریں ہلکے آسمانی رنگ کی تھیں۔ اس پر سیاہ رنگ میں چینی کسانوں کی تصویریں پینٹ کی ہوئی تھیں۔ جو چائے کے کھیت میں مشقت کر رہے تھے۔ خواب گاہ کے لمبے لمبے سنہرے اور فیروزی رنگ کے پردے خزاں کی ہوا سے نہ جانے کیوں ایک عجیب المناک انداز میں ہل رہے تھے۔ جیسے کوئی انہیں جھنجوڑ رہا ہو اور زندگی کے خواب سے بیدار کر رہا ہو۔

ایک طرف ایک چھوٹی سے منقش صندل کی میز پر چاندی کے دو بڑے بڑے گلدانوں میں حنا کے پھول رکھے تھے۔ جن کی نکہت کمرے کو کچھ اور زیادہ حسین بنا رہی تھی۔
اک کونے میں آسمانی رنگ کے پتھر میں محبت کے دیوتا کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ اس کے قدموں میں میری پالتو بلی شکوری سو رہی تھی۔ دریچے کے نیچے ستار بے کسی کی حالت میں پڑا تھا۔ اس کا غلاف کوچ کے پاس ہی قالین پر رکھا ہوا تھا۔ اس سے کچھ دور خزاں کے چند خشک اور زرد پتے پڑے ہوئے تھے۔
اسے لا کر خواب گاہ میں لٹا دیا گیا۔ نیلی ساٹن کے فانوس سے چھن کر مدھم چراغ کی پیلی پیلی کرنیں اس کے لیموں جیسے زرد رنگ چہرے پر کانپ کر اس کی ناتوانی اور اضمحلال کو زیادہ دردناک بنا رہی تھیں۔ سیاہ' دراز اور ایشیائی حسن' دل فریبی سے لبریز' ساٹن جیسے بال مخملی تکئے پر بکھر گئے تھے۔
آہ ناشاد لڑکی!
زندگی نے اس سے برا سلوک کیا۔
میں انتہائی فکر مندی اور اضطرار کی کیفیت میں اس کے سرہانے ایک چھوٹی سی الماری

سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اور اسے دیکھ رہی تھی۔ ہائے وہ وقت! مجھے اب تک نہیں بھولا۔ واقعی زندگی کے چند واقعات انسان کو کبھی نہیں بھولتے! رات سنسان اور خاموش تھی۔ قبرستان کی شام کی طرح خاموش!—— کھڑکی کے باہر باغ میں کہیں دور تاڑ کے چپ چاپ درختوں پر چاند طلوع ہو رہا تھا۔ خزاں کی ہوائیں خشک پتوں کو اڑا اڑا کر اندر لا رہی تھیں۔ کئی تو اس کے بستر پر بھی پڑے تھے۔ قریب ہی دریچے کے باہر ناشپاتی کی اک خزاں رسیدہ پتلی سی ٹہنی پر نیلگوں چشم عربی بلبل اداس بیٹھی زرد چاند کو تک رہی تھی جو اس کے پیچھے طلوع ہو رہا تھا۔ رات کے سناٹے میں اور چاند کی مدھم زرد روشنی میں ننھی بلبل کی سیاہ تصویر ایسی نظر آتی تھی جیسے کوئی مغموم روح عالم ارواح میں بیٹھی اپنے اعمال نامے پر غور کر رہی ہو۔

میرا اضطراب اور غصہ بڑھتا گیا۔ آہ بد نصیب مظلوم لڑکی بے رحم رواج نے اسے تباہ کر دیا۔ اس کی زندگی کی پنکھڑی کو رواج کی ظالم اور بے پناہ انگلیوں نے قریب قریب نوچ لیا —— اللہ! کیا مشرق لڑکی محض اسی لئے پیدا ہوتی ہے۔ کہ وہ دوسروں کی خوشیوں پر بھینٹ چڑھا دی جائے؟ کیا اسے خود اپنی زندگی کے معاملے میں بھی دخل دینے کا اختیار نہیں؟ کدھر ہیں وہ ریفارمر، جو قوم کے آگے لمبی لمبی تقریریں کرتے اور بہبودی قوم کا ترانہ بڑے زور و شور سے گاتے ہیں؟ سٹیجوں پر کھڑے ہو کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ رکھ کر۔ قومی درد جتانے والے ریفارمر کدھر ہیں؟ وہ گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں۔ انہوں نے اپنی ماؤں کے لئے کیا کیا؟ لڑکیوں کے لئے کیا کیا۔ جو کل قوم کی مائیں بننے والی ہیں؟ کیا ان کا ہمدردی اور قوم کے عشق سے لبریز دل—— مظلوم لڑکیوں کی آہ سے تھرا نہیں اٹھتا۔ کیا ان کی تمام ہمدردی، تمام درد محض فرقہ رجال ہی تک محدود ہے؟ اگر ان کے احساسات صرف مردوں کے دکھ درد تک ہی محدود ہیں۔ تو پھر یہ بزرگ کس منہ سے قوم کے امام بنے پھرتے ہیں؟ پھر وہ کیوں اس نام سے منسوب کئے جاتے ہیں؟ کیا وہ عورت کو قوم سے خارج سمجھتے ہیں؟ کیا قوم صرف مردوں ہی کے احتجاج کا نام ہے؟

اے خدا! ان بزرگوں نے ہمارے لئے کیا کیا؟ کچھ نہیں کیا۔ آہ۔ کچھ بھی نہیں کیا۔ ان سے اتنا بھی نہ ہو سکا۔ کہ ہم کو زندگی کے اس نازک ترین مسئلہ میں رائے دینے کا اختیار دے دیں۔ جس پر ہر مرد اور عورت کی آئندہ خوشیوں اور امیدوں کا انحصار ہوتا ہے۔ اور جس میں دخل دینا انسانی فطرت ہے یہ لوگ لڑکوں کی یونیورسٹیوں کے لئے جھگڑتے ہیں۔ اپنی انجمنوں کے لئے بھیک مانگتے ہیں۔ اپنی شہرت کے لئے تقریریں کرتے

ہیں۔ مگر ہمارے لئے آج کسی بزرگ نے کسی ریفارمر نے یہ قانون نہیں بنایا کہ خود زندگی کے مسائل میں ہماری رائے ضروری سمجھی جائے۔

کچھ سوچ کر میری آنکھوں میں آنسو آئے۔ میں بیمار پر جھک گئی اور مشکل سے اتنا کہہ سکی ۔ "جسوتی"! اس نے آنکھ کھولی۔ سیاہ اور نرگسی آنکھ' جس میں روتے روتے گلابی ڈورے پڑ گئے تھے۔ میری طرف دیکھا۔ کمزور اور حسرت مند نگاہ' جس میں ہزاروں ہی حسرتیں تھیں اور کہا۔ "آہ!"—— پھر چھت کی طرف تکنے لگی۔ اس کی نیم وا آنکھوں میں سے زندگی کی پرانی تمنائیں جھانکتی معلوم ہوتی تھیں۔ اب بھی وقت تھا۔ اب بھی اس کے بزرگ اس پھول کو باد خزاں کے تند جھونکوں سے بچا سکتے تھے۔

میں آنسو پونچھتی ہوئی باغ کے دروازے سے باہر آئی۔ اب چاند اداس چاند تاڑ کے چپ چاپ درختوں پر آگیا تھا اور خزاں رسیدہ ٹہنی پر مغموم بلبل اسی طرح خاموش بیٹھی اسے تک رہی تھی۔

***

ممتاز شیریں

گھر تک

"لنگا"

"سوامی"

ہم راستہ بھول گئے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے، ہمارا گاؤں یہاں سے قریب ہی ہے
"ادھر دیکھئے، سوامی۔ سفید لکیر دکھائی دے رہی ہے نا، وہی ہوگی سڑک۔ نہیں وہ تو پانی بہہ رہا ہے۔ ایک چھوٹا سا نالا۔"

"ادھر آ، اس ٹیلے پر چڑھ کر دیکھیں۔ شاید کچھ پتہ چلے۔"

ہم چڑھنے لگے۔ لنگا بڑی مشکل سے چل رہا تھا۔ پاؤں کیچڑ میں دھنس جاتے۔ میں اس کے پیچھے گھوڑے پر ہو لیا۔ اندھیرا ہو چلا تھا ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ گرمی کی چھٹیوں میں میں اپنے گاؤں جا رہا تھا۔ بنگلور سے بس میں چلا۔ تحصیل پہنچ کر وہاں شیخ داد صاحب سے جن سے میری جان پہچان تھی، گھوڑا لیا۔ اور ان کے نوکر لنگا کو ساتھ لیے چلا تھا۔ لنگا راستے سے اچھی طرح واقف نہ تھا، لیکن میں ادھر سے کئی دفعہ گزرا ہوں۔ جانے کیسے ہم اس شام بھٹک گئے۔

"لنگا"

"جی سوامی۔"

"سوٹ کیس کا بوجھ زیادہ تو نہیں معلوم ہو رہا؟"

"جی نہیں بہت ہلکا ہے یہ۔ دیکھنے میں بڑا معلوم ہوتا ہے بس۔ کیا رکھا ہے سوامی۔ اس میں؟" بس، چند کتابیں، دو جوڑے کپڑے۔ بھائی کے لیے زری کی ٹوپی اور جوتے؛ بہن کے لیے دو گڑیاں۔ بس یہی۔"

"بنگلور میں آپ کے دن رہے سوامی؟"

"پچھلی گرمیوں کے بعد اب لوٹ رہا ہوں۔ دیکھا ایک سال میں یہ جگہ اتنی بدل گئی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف جھاڑیاں اور پودے بھی بدل گئے ہیں۔ اسی لیے تو سمجھ میں

نہیں آرہا کس سمت جا رہے ہیں۔"

ہم تینوں، لنگا، میں اور گھوڑا تھک کر چور ہو رہے تھے۔ کچھ دیر خاموشی سے یونہی چلتے رہے۔ مجھے گھر جلدی پہنچنے کی بے تابی تھی۔ میں ماں سے ملنا چاہتا تھا، ننھے کو دیکھنا چاہتا تھا جو ٹوپی کا انتظار کر رہا ہو گا۔ پتا جی کو سنانا چاہتا تھا کہ میں نے امتحان میں پرچے کتنے اچھے کئے ہیں اور بھی کتنی ساری باتیں تھیں جو گھر والوں کو سنانی تھیں——"

ہم چڑھائی پر چڑھ کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔ لیکن بے سود۔ راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ صحیح راستہ معلوم کرنے کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے ہی میں نے سگریٹ جلانے کی کوشش کی۔ ہوا اتنی تیز تھی۔ دیا سلائی بجھ بجھ جاتی۔ آخر بڑی مشکل سے سگریٹ جلایا۔ سناٹا، ویرانی اور ہوا کی سائیں سائیں۔ ہمیں ساری رات یہیں پڑا رہنا ہو گا۔ اس بیابان میں۔ گھوڑا جیسے میری بات سمجھ گیا، اس کے کان کھڑے ہو گئے، لنگا بولا۔ "ذرا سنئے سرکار۔" ہماری داہنی جانب کتے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے کہا، چل اسی طرف چلیں، شائد کوئی گاؤں مل جائے۔ پیڑ پودوں کو دیکھتے چلیں، کچھ نہ کچھ نشان مل جائے گا۔ ہم ذرا داہنے کو مڑ کر اترنے لگے لیکن کتے کا بھونکنا پھر سنائی نہ پڑا۔ لنگا یکایک رک گیا۔

"وہ—— وہ دیکھئے ادھر۔" میں نے دیکھا جدھر اس نے اشارہ کیا تھا۔ "اوہ! وہ تو ایک پیڑ ہے۔ ڈرپوک کہیں کا، ادھر آجا۔ گھوڑے کے ساتھ چل، گھبرا نہیں میں تجھے ایک کہانی سناؤں گا۔ تجھے پڑھنا لکھنا آتا ہے کیا؟"

"کچھ کچھ آتا ہے، سوامی، اچھا، سنایئے کہانی۔"

وہیں ایک مینڈھ پر ہم دونوں بیٹھ گئے۔ میں لنگا کو کہانی سنانے لگا۔ انگریزی فوج کاویری ندی پار کر کے کیسے آئی—— کڑی دوپہر میں انگریز قلعے پر چڑھ آئے اور اس پر اپنا جھنڈا چڑھا دیا—— اس وقت سلطان ٹیپو، کھانے پر بیٹھے تھے۔ دو نوالے ہی لے پائے تھے کہ انگریزوں کی چڑھائی کی خبر سنی۔ کھانا چھوڑا اٹھ کھڑے ہوئے۔ گھوڑے پر سوار ہو کر قلعے کے پاس آئے—— شام تک ڈٹ کر لڑتے رہے۔ سات گولیاں کھائیں۔ پھر بھی جان باقی تھی۔ وہ لاشوں میں پڑے تھے۔ ایک گورے نے ٹیپو کا کمربند نکالنا چاہا۔ ٹیپو نے تلوار کا وار کیا۔ سپاہی نے گولی چلائی۔ اس گولی سے وہ ختم ہو گئے—— پھر کہانی بقیہ حصہ انگریزوں کا سلطان کے بیٹوں کو قید کرنا۔ لالٹین لے کر ٹیپو کی لاش تلاش کرنا—— رات کی تاریکی میں سرنگاپٹم میں لوٹ مار—— ہراساں عورتوں اور بچوں کا رات سڑکوں پر

گزارنا، دوسری صبح ٹیپو کے جنازے کا جلوس، تجہیز و تکفین —— اور پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا —— "بڑی دکھ بھری کہانی ہے، سوامی، سچ کتنی دکھ بھری ہے۔"

ہم پھر چل پڑے۔ پیڑ کی طرف دیکھتے ہوئے لنگا نے زیر لب کہا۔ "سوامی، پیڑ کہیں ایسا ہوتا ہے؟" اور گھوڑے کے نزدیک آگیا۔ بات بھی یہ تھی کہ وہ پیڑ تاریکی میں کچھ بھیانک سا معلوم ہو رہا تھا۔ یہ سوچ کر لڑکا ڈر جائے گا، میں گھوڑے سے نیچے اتر پڑا۔ "اس پیڑ کو میں اچھی طرح جانتا ہوں، رے" ہمارا گاؤں یہاں سے بالکل قریب ہے۔ اسی پیڑ کو دیکھ کر میرا بھائی شامنا، ڈر گیا تھا۔" وہ اس طرف کیوں آنکلے تھے، سرکار؟

"پچھلی گرمیوں میں جب یہاں آیا تھا۔ شامنا اور میں شام میں یونہی گھومنے نکلے۔ اس وقت اس کی عمر صرف آٹھ سال کی تھی۔ وہ مجھے ایک کہانی سنا رہا تھا۔ وہی کہانی جو ابھی میں نے سنائی۔ وہ اتنے جوش و خروش میں ہوتا کہ کہانی سناتے اپنے آپ کو بھول جاتا ہے شامنا بڑا ہوشیار ہے۔ بڑی اچھی کہانیاں سناتا ہے۔ سرنگاپٹم کی کہانی اسے بہت پسند ہے۔ وہ مجھے تنگ کیا کرتا ہے مجھے سرنگاپٹم لے چلو۔ اس دن بھی کہانی سنتے سنتے رات ہو گئی اور ہم راستہ بھول گئے اور بھٹک کر اسی پیڑ کے پاس پہنچے۔ شامنا اس پیڑ کو دیکھ کر ڈر گیا پھر گھر پہنچتے ہی اس کو بخار چڑھ آیا اور تین دن تک نہ اترا۔"

"تب تو یہاں سے گاؤں جانے کا راستہ آپ کو معلوم ہو گا —— یہاں سے گاؤں اور کتنی دور ہے؟"

"یہاں سے گاؤں تک کوئی سیدھی سڑک نہیں۔ ہمیں اندھیرے میں کھوج لگاتے جانا ہو گا۔ یہاں سے گاؤں کوئی آدھ میل ہو گا۔ یہ ہمارے گاؤں کا شمشان ہے۔"

"کیا کہا سوامی؟"

ارے توبہ، میں نے بھول کر شمشان کا ذکر اس کے سامنے کر دیا۔ یہ چودہ سال کا لڑکا پھر ڈر جائے تو،

"بس اب گاؤں آ ہی گیا۔ یہاں سے ذرا داہنی طرف جانا ہے۔ یہ پیڑ ہمارے گاؤں کے پچھم میں ہے۔" بارش ختم گئی تھی۔ لیکن تاریکی بڑھ گئی تھی۔ لنگا پیچھے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا۔ میں جان گیا وہ ڈر گیا ہے۔ اس سے بات کرتے رہنا چاہیے، میں نے سوچا۔ "لنگا!" "ادھر دیکھ" اس نے انگلی سے پیچھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "پھولوں سے ڈرتا ہے بزدل، ڈرپوک کہیں کا!" "لیکن وہاں سوامی، دیکھئے ادھر ——" وہ اصرار کر رہا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مینڈھ کے پاس جہاں بیٹھ کر میں نے لنگا کو کہانی

سنائی تھی۔ روشنی نظر آئی۔ اور دو شکلیں آمنے سامنے بیٹھی زمین کی طرف تک رہی تھیں۔ جھوٹ کیوں کہوں؟ مجھے بھی ذرا ڈر لگا۔

"لنگا تجھے کیا دکھائی پڑتا ہے وہاں۔"

"دیکھئے۔ ایک مشعل ہے اور اس کے پاس——"

"ڈر مت، چل پاس جا کر دیکھیں۔"

"دیکھئے اس طرف، دیکھئے۔" وہ بے حد سہا ہوا تھا۔ روشنی اب حرکت کرتی نظر آئی۔ میں نے لنگا کا ہاتھ تھام لیا اور دوسرے ہاتھ میں گھوڑے کی لگام پکڑ لی میں دھیرے دھیرے مینڈھ کی طرف بڑھا۔ جو کچھ نظر آیا تھا وہ ہمارا وہم نہیں تھا۔ دو صورتیں واقعی تھیں اور وہ بات کر رہی تھیں۔ انسانی آواز سن کر ہم میں ہمت آئی اور ہم پیڑ کے پیچھے کھڑے ہو سننے لگے۔

"ہائے، میرے بچے، میرے لال، تو پیاس سے تڑپتا رہا۔ تیرے لیے دودھ لائی ہوں، پی لے—— کیسا تھا میرا لال، اور اب تو سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا—— ہم سب کو چھوڑ کر کہاں چلا گیا تو—— رو مت تو کیا کہنا چاہتا تھا، میرے بچے، تیرے ہونٹ پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔ تیری آنکھوں میں کتنا کرب تھا! تیری آنکھیں کہتی تھیں تو ہمیں چھوڑنا نہیں چاہتا، ہائے، میرے بچے، اس جنگل بیابان میں اکیلا تن تنہا، ہائے بھگوان کیا یہ سب سچ ہے؟"—— ایک عورت کٹورے سے مینڈھ پر دودھ انڈیل کر زارو قطار رو رہی تھی، بین کر رہی تھی۔ ہم اس دھیمی روشنی میں پہچان سکتے تھے کہ وہاں دو عورتیں ہیں، ان میں سے ایک چھوٹی لڑکی ہے۔ لڑکی رو رو کر کہہ رہی تھی۔

"ہم بھیا کو لکھ بھی نہ سکے۔ دو دن کے اندر ہی یہ کیا ہو گیا۔ ہائے۔ میں نے چند قدم آگے بڑھائے۔ اتنے میں ہمارے سامنے کی روشنی مینڈھ میں پہنچ گئی—— پھر تیسری آواز آئی۔ بھرائی ہوئی لیکن قدرے کرخت۔

"یہ کیا پاگل پن ہے کہ ایسی خوفناک رات میں تم یہاں آئی ہو۔ کیا تمہارے رونے چلانے—— سے وہ واپس آجائے گا؟" میں نے آواز پہچان لی۔ یہ میرے پتا جی کی آواز تھی۔

"میرے بچے، تو اندھیرے سے ڈرتا تھا، اب اندھیرے میں اکیلا پڑا ہے۔ تو ایک بار اسی جگہ ڈر گیا تھا۔ اور اب تو اکیلا اسی جگہ پڑا ہے، اب تجھے ڈر نہیں لگتا؟ میں تجھے اکیلا چھوڑ کر گھر کیسے جاؤں" میری ماں پھر پھوٹ پڑی۔

"بھیا ٹوپی اور جوتے لائیں گے۔ اب انہیں سرنگاپٹم کا قصہ کون سنائے گا۔ بھیا کس کو سرنگاپٹم دکھائیں گے۔ شیامیو' میرے شیامو' ہائے بھگوان۔" یہ میری بہنیں تھی۔

اس وقت مجھ پر کیا گزر رہی تھی میں بیان نہیں کر سکتا۔ ایسا لگتا تھا کائنات کی اس بے کراں وسعت میں' میں بالکل اکیلا رہ گیا ہوں۔ لگا میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہا تھا' مجھے وہاں جانے سے روک رہا تھا۔ لیکن میں ہاتھ چھڑا کر مینڈہ کی طرف بھاگا۔

"پتا جی نے لالٹین اوپر اٹھائی اور پوچھا کون ہے"

مجھے دیکھتے ہی سب پھر پھوٹ پڑے۔ نئے سرے سے کرب' ان کے سینوں میں امڈ آیا۔ میں بہت دیر تک شامنا کی قبر پر آنسو بہاتا رہا۔ میں نے سوٹ کیس سے ٹوپی اور جوتے نکالے' اور انہیں شامنا کی قبر پر رکھ دیا۔ شامنا نے ایک بار پوچھا تھا۔ "بھیا یہ پیڑ پودے جنگل میں اکیلے کیسے رہتے ہیں" میرا جی چاہا ساری رات یہیں گزار دوں' شامنا کو اکیلا نہ چھوڑوں۔

ہم بہت دیر تک وہاں رہے۔ شامنا کی باتیں کرتے رہے۔ اس کی بیماری' اس کی موت ـــــ وہ ہمارے گھر کا ہیرا تھا' سب گاؤں والوں کو آنکھوں کا تارا تھا۔ سب کا چہیتا' ذہن' عقل مند' اب اس کے بغیر زندگی بے کیف تھی۔

"پتا جی نے آہ بھر کر کہا "ایک نہ ایک دن ہم سب کو یہیں آنا ہو گا۔"

"ہوا کا ایک جھونکا جیسے اپنے ساتھ اس کا جواب لایا۔"ہاں"

میرا بھائی اسی جگہ جہاں وہ ڈر گیا تھا' آج اکیلا' ابدی نیند سو رہا تھا۔ اسے چھوڑ کر ہم گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ جی ہاں گھر کی طرف؟ لیکن ہمارا گھر ہے کون سا؟

***

ہاجرہ مسرور

بندر کا گھاؤ

وہ برآمدے میں جھلنگی کھاٹ پر نئی دلہن کی طرح گٹھڑی بنی پڑی تھی۔ گرمی کی بھری دوپہر' اس پر ٹھیرا ہوا بخار۔۔۔جی بولایا جا رہا تھا۔ کمرے میں گھر کے سب افراد دروازے بند کئے آرام سے ہنس بول رہے تھے۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ بھی سورج کی تپش سے پناہ لینے کے لئے کمرے میں جا پڑے۔ لیکن اس کو ڈر تھا کہ کہیں اسے دیکھتے ہی کڑوی نصیحتوں کی بوتلیں نہ کھل جائیں۔ اس لئے وہ سورج کی تپش اور بخار کی حالت میں بھی اس تھوڑی سی تنہائی کو غنیمت سمجھ رہی تھی۔

تیز دھوپ اور تیز بخار۔ اسے رہ رہ کے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی ہڈیوں کا گودا پگھل گیا ہے اور اس میں اس کی نس نس تلی جا رہی ہے اور اس کی کمانوں کی طرح ابھری ہوئی پسلیوں کو ایک مضبوط ہاتھ جھاڑو کی سینکوں کی طرح توڑ مروڑ دینا چاہتا ہے۔ اس عجیب احساس سے اسے کھانسی آنے لگی۔ وہی کھانسی۔۔۔۔ اس طرح جیسے کوئی لکڑی کے گھنے ہوئے خالی صندوق کو دھپ دھپائے! کھانستے کھانستے اس کے حلق سے کوئی چیز امنڈ آئی اور اس نے لیٹے لیٹے کھاٹ کے ڈھیلے بانوں کو سرکا کر تھوکا۔ جمے ہوئے خون کا ایک چھوٹا سا لوتھڑا چپ سے زمین پر چپک گیا اور اس سے پہلے کہ وہ خون کو دیکھ کر کچھ سوچتی' بندروں کے خوخیانے کی آواز سن کر بے حس و حرکت پڑ گئی۔ کیونکہ اسے بندروں سے بہت خوف معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بغیر گردن موڑے آنکھیں گھما کر اس طرف دیکھا جدھر سے آواز آ رہی تھی۔

ہائے اللہ۔۔۔۔ اس کے پپڑیائے ہوئے ہونٹوں کو اور بھی جھلساتا ہوا نکلا افوہ! کتنے بہت سے بندر باورچی خانے کی پچھواڑے والی نیم سے دھپا دھپ چھت پر الٹی سیدھی چھلانگیں لگا رہے تھے۔ اس کا دل ایک دم چاہا کہ وہ بھاگ کر کمرے میں گھس جائے۔ لیکن اس ڈر کے مارے وہ حرکت نہ کر سکی۔ کہ کہیں یہ سب بندر اس پر ٹوٹ نہ پڑیں۔

کائی سے کالی منڈیر پر ایک مرجھلا سا بندر پڑا سسک رہا تھا اور اس کے ارد گرد کئی

موٹے موٹے بندر بیٹھے اس کی پیٹھ کے سیاہ گھناؤنے گھاؤ کو اپنے تیز ناخنوں سے کرید رہے تھے۔ بندر کا مکروہ گھاؤ دیکھ کر اسے پھریریاں آنے لگیں۔ اور بندر تھے کہ زخم کے معائنے میں پوری طرح منہمک، ابھی ایک گھاؤ میں ہاتھ گھنگھول رہا ہے کہ دوسرا پیپ نکالتا، پوٹے پیٹتا، وہی عمل شروع کر دیتا۔ گویا ایک زخمی اور سینکڑوں جراح۔ اور وہ بیچارہ مرجھلا بندر تھا کہ مارے تکلیف کے سر ڈھلکائے دیتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ بس اب مرا۔ اب مرا، وہ سوچنے لگی کہ یہ کمبخت یہاں سے بھاگ کیوں نہیں جاتا؟ بھلا اس طرح اپنے گھاؤ کا معائنہ کراتے کراتے جان دینے سے حاصل؟ لیکن بے عقل جانور! پھر بھی اسے اس مظلوم کی بے کسی پر بڑا رحم آرہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ کسی طرح ان دھوں کے دھوں بندروں سے اس کا پیچھا چھڑا دے جو ہمدردی کے بہانے تماشہ دیکھ رہے ہیں لیکن—— لیکن یکلخت اس کی پسلیوں پر کوئی مضبوط ہاتھ زور آزمائی کرنے لگا۔ کھانسی اور سینے سے لے کر حلق تک گدگدی۔ اس کا منہ اس طرح بھر گیا جیسے اس نے بیک وقت پان کی کئی گلوریوں کی پیک اکٹھی کر لی ہو، اس نے گھبرا کر تھوکا۔

ہی ای ای—— سرخ سرخ جیتا ہوا خون، ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے اور وہ اپنا دھمکتا ہوا سر پھانسوں بھری کھاٹ پر رگڑنے لگی۔

بندر خوخیا رہے تھے اور کمرے میں گھر کے لوگ اس کے یوں الگ تھلگ رہنے پر باتیں بنا رہے تھے۔ اس نے بیزار ہو کر ڈھیلی ڈھیلی ٹانگیں پسار کر پٹی سے اڑالیں اور دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔ اس کے کانوں میں گھر والوں کے بڑبڑانے اور بندروں کے خوخیانے کی آوازیں لوہے کی گرم گرم سلاخوں کی مانند اترتی معلوم ہو رہی تھیں۔ بندر اور گھر والے کتنے ہم آہنگ ہیں۔ اسے خیال آیا اور اسے اپنے سارے جسم میں نبضوں کی پھڑک محسوس ہونے لگی۔ معاً جیسے اس سے کسی نے کہہ دیا ہو کہ تو بھی اس مرجھلے بندر کی طرح ہے جو جانتے بوجھتے مہلک بیماریوں کا شکار ہو رہی ہے اور پھر بطور دلیل اس کے دھمکتے ہوئے دماغ پر کچھ زمانہ قبل کی کئی انمٹ تصویریں ابھر آئیں۔

"تیئس چوبیس برس کی جوان پچھتی، آنکھوں میں نہیں ساتی اب تو" ماں کچھ جل کر فکر مند لہجے میں کہہ اٹھتی اور اسے اپنے پہاڑ جیسے کنوارپنے کا بہت احساس ہونے لگتا۔ اس کے خاندان کی ہم عمر لڑکیاں بلکہ اس سے بھی کمسن لڑکیاں کتنے ہی سال ہوئے بیاہی جا چکی تھیں۔ کئی کے چار چار پانچ پانچ بچے بھی ہو چکے تھے۔ کئی اپنے شوہروں کی نظر میں پرانا گھسا ہوا مال ہو کر میکے میں پڑی تعویذوں اور پیر صاحبان کے عملیات کے ذریعے اپنی چھٹی

پرانی جوانیاں رفو کرا رہی تھیں۔ لیکن ایک وہی نہ جانے کیسی قسمت لے کر آئی تھی کہ اب تک اس اچھوتی بیری پر کسی نے ڈھیلا پھینکنے کی زحمت نہ گوارہ فرمائی۔ صورت شکل کی کہو تو ایسی بری بھی نہ تھی۔ بڑی سگھڑ اور بے منہ کی لڑکی تھی۔ اس کے باوجود اس کی شادی کا کہیں بندوبست ہو ہی نہ پاتا تھا۔ اتنی بات ضرور تھی کہ سوائے اس کے اس کی ماں کے کسی اور کو اتنی فکر بھی نہ تھی۔ باپ تھا تو اس کو صرف پڑے پڑے حقہ پینے اور ہر دوسرے سال ایک عدد بچے کے اضافہ پر فخر کرنے کے علاوہ تیسرا کام نہ تھا۔ بڑا بھائی سو اپنی فکر میں مگن۔ آج دھوبن پر عاشق تو کل مہترانی پر فدا۔ اور چپکے چپکے بھی نہیں۔ کھلم کھلا، جوان بہن کے سامنے آہیں بھرنے، چٹخارے لینے اور جا و بیجا کھجانے سے بھی نہ چوکتا۔

تو وہ کچھ ایسے ماحول میں سانس لے رہی تھی۔ ماں نے اس کی بھرپور جوانی کو خانہ داری کی سل کے نیچے بہت دبانا چاہا لیکن توبہ! ایک وقت ہوا کرتا ہے۔ جب سوپ کا اللار اسوپ میں نہیں رہتا۔ آپ نے کبھی چولہے پر پکتی ہوئی دال تو دیکھی ہی ہو گی اور یہ بھی دیکھا ہو گا کہ جس وقت ابال آتا ہے تو ہنڈیا دیکھنے والا جلدی سے پتیلی کا ڈھکنا ہٹا دیتا ہے۔ اس طرح ابال میں کچھ کمی آجاتی ہے نا؟ اور اگر غلطی سے ڈھکنا نہ ہٹایا جائے تو ابال اسے خودبخود اچھال کر اپنے لئے راہ پیدا کر لیتا ہے۔ غلط تو نہیں؟ ہاں تو اس کی زندگی میں بھی ابال کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ حیا کے بوجھ سے جھکی ہوئی آنکھیں کچھ ڈھونڈنے کے لئے ادھر ادھر اٹھنے لگیں۔ ویسے تو پڑوس کا مکان عرصے سے خالی پڑا تھا۔ لیکن ادھر سنا کہ کوئی طالب علم آکر رہا ہے۔ بس کیا تھا؟ زمین کے پیٹ میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے لاوے کو پھوٹ پڑنے کے لئے زمین کی کمزور پرت مل گئی۔ کام کاج کرتے کرتے اس کی نظریں اس دیوار کی طرف اٹھ جاتیں۔ جس کے پیچھے کوئی چلتا پھرتا ہوا رہتا ہو گا۔ اس کی خود فراموشیوں پر ماں گالیاں کوسنے دے رہی ہوتی۔ لیکن اس کے کانوں کے پردے وہ بھاری سی اجنبی آواز اپنے میں جذب کرنے کے لئے پھڑپھڑاتے رہتے۔ گھر میں ماں باپ آپس میں جھگڑتے ہوتے اور وہ خیال ہی خیال میں دیوار پار کے کسی کے پہلو سے جا لگتی۔ لاوا جو تھا ــــ بس اندر ہی اندر جوش کھا رہا تھا۔

"کوٹھے پر کیوں جا رہی ہے؟" بڑا بھائی تھا بڑا ماہر نفسیات۔ اس کے ہاتھ رنگا ہوا گیلا دوپٹہ بھینچ کر رہ گیا۔

"دوپٹہ سکھانے۔" اس کی تیوری پر بل آگئے۔ بھوکے کے سامنے سے تھالی سرکائی جائے اور اسے غصہ نہ آئے؟

"کیا یہاں دھوپ نہیں ہے جو اوپر جانے کی ضرورت ہوئی؟" اس نے ایک باغیرت بھائی کی طرح اسے جلتی ہوئی نظروں سے گھورا اور پھر ایک گھٹیا قسم کی سگریٹ سلگائی۔ وہ بدبداتی ہوئی دوپٹہ پلنگ پر پھینک کر بیٹھ رہی۔ بھائی مطمئن ہو کر گنگنانے لگا

نینوں میں نینا ڈالے، ہو بانکے نینا والے

اور وہ چڑ کر دل میں کوسنے دینے لگی۔

ادھر دیکھا، ادھر دیکھا۔ کوئی بھی اس کے شوق میں حارج نہ تھا۔ افوہ! کتنے دن سے وہ اس سوراخ سے جھانکنے کی متمنی تھی۔ اس نے موقع پا کر جلدی سے اپنی آنکھ اس ننھے سے سوراخ سے لگا دی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک گورا چٹا سا چہرہ سامنے آیا اور جھپ سے گذر گیا۔ ایک جھلک صرف ایک! اس کا اضطراب اور بڑھ گیا۔ کاش ایک بار وہ اور سامنے آ جائے—— وہ اپنی آنکھ سوراخ سے لگائے رہی۔ کمبخت سوراخ بھی تو ایسی جگہ تھا کہ نہ تو پوری طرح بیٹھ کر جھانکا جا سکتا تھا اور نہ بالکل کھڑے ہی ہو کر۔ بس اس پر بالکل رکوع کی سی کیفیت طاری تھی۔ دونوں ہاتھ گھٹنوں پر، آنکھ سوراخ پر اور کان کمرے کے دروازوں پر۔ جھکے جھکے کمر دکھ گئی ہاتھ سن پڑ گئے اور کئی بار تو پلکوں کی رگڑ سے دیوار کی مٹی جھڑ کر آنکھ میں گھس گئی لیکن وہ اسی طرح اس سوراخ سے چمٹی رہی اور اس سے عجیب عجیب امنگیں لپٹی رہیں۔

ایک دن، دو دن، تین دن—— مہینوں اس ننھے سے سوراخ سے اس نظر کے ساتھ ساتھ جسم نے بھی پار ہو جانا چاہا۔ لیکن تھک کر اسے یقین آ گیا۔ کہ یہ ناممکن بات ہے۔

"اماں!" اس کا چھوٹا بھائی دھا دھم زینے سے اتر رہا تھا۔" سالے نے میری پتنگ کاٹ لی۔"

"اے کس نے بیٹا؟" ماں کے چھکے چھوٹ گئے۔ یعنی ابھی کل ہی تو انہوں نے اسے چار پیسے کی پتنگ منگا کر دی تھی۔ اور وہ بھی کٹ گئی۔

"وہی جو ادھر آکر آ رہا ہے—— کہہ رہا تھا کوٹھے پر پتنگ نہ اڑایا کرو۔ گر پڑو گے نیچے۔" وہ مارے غصے کے پاؤں پٹخے جا رہا تھا۔

"تو کیا برا کہا؟" آٹا گوندھتے گوندھتے رک کر بولی۔

"چل تو چپکی بیٹھی رہ——" ماں نے اسے پھٹکار دی۔ "وہ بڑا آیا نصیحت کرنے—— بچہ کوٹھے پر نہ اڑائے تو کیا اس کی میا کے سینے پر اڑائے؟ ہاں تو بیٹا پھر اس نے پتنگ کس بات پر کاٹی؟"

"میں نے کہا۔ تم کون ہوتے ہو منع کرنے والے؟ خوب اڑائیں گے پتنگ، تمہارا اجارہ نہیں۔ بس اس پر اس نے لنگر ڈال کر پتنگ کاٹ لی——" صاحبزادے نے مزے میں آ کر دو چار موٹی موٹی گالیاں بک ڈالیں اور اس کے جیسے مرچیں ہی لگ گئیں۔ جی چاہا کہ آٹا چھوڑ کر لگائے دو تین، اور یہ اماں؟ منع بھی نہیں کرتیں اسے—— بالشت بھر کا لونڈا اور یہ گالیاں! وہ اتنی بڑی ہو گئی تھی پھر بھی جب اس نے اس ایک بار صرف یونہی ایک گھریلو گالی غصے میں آکر بک دی تو اماں پھکنی لے کر مارنے کھڑی ہو گئی تھیں مگر——

"ہے ہے قربان کروں ایسے خدائی فوجدار کو—— تو بیٹا جب وہ—— چھت پر نہ ہوا کرے تو اڑایا کر پتنگ—— کمینوں کے منہ نہیں لگتے اور پھر تیرے ابا ہیں ظالم۔ کہیں سن پایا تو اپنی اس کی جان ایک کر دیں گے۔"

"کی نہ ایک جان!" وہ پھر بدبدائی۔ "بھلا یہ بھی کوئی بات تھی کہ جس کے لئے وہ اتنے دن سے سوکھ رہی تھی۔ اسے کوئی گالیاں دے؟

ہوا کیا نہ کرے؟ وہ تو شام سے ڈٹا رہتا ہے چھت پر۔ پلنگ ولنگ بھی وہیں ڈال رکھا ہے اور شاید سوتا بھی وہیں ہے۔ مرے خدا کرے، جنازہ نکلے——

وہ کوسنے دے کر اپنا دل ٹھنڈا کر رہا تھا۔ لیکن وہ آپ ہی آپ مسکرا رہی تھی۔ جیسے وہ یہ کوسنے سن ہی نہ رہی تھی، اور واقعی وہ تو اس وقت کچھ سوچ رہی تھی۔ ایک بڑے مزے کی بات!

"پنجرے کا پنچھی اڑان کے لئے پر تول رہا تھا۔"

رات کو ماں نے پلنگ پر لیٹے ہی چابیوں کا گچھا کمر بند سے کھول کر دیتے ہوئے کہا۔

"لو یہ—— اور کوٹھڑی کا تالا کھول کر زینے کے دروازے میں ڈال دو۔ آج تو بچے کی پتنگ پر نیت خراب کی۔ کل کو گھر کا صفایا کر دے گا، اے ہاں نگوڑا!" اور پھر اپنا گھڑا جیسا چمکتا ہوا پیٹ کھول کر اطمینان سے ٹانگیں پسار دیں۔ اپنے بھر وہ حفاظت کر چکی تھیں۔ لیکن ادھر شروع ہو گیا کاٹ پیچ۔ وہ کوٹھڑی کا تالا کھولتے ہوئے سوچ رہی تھی۔" چھت سے چھت تو ملی ہوتی ہے۔ آج اس سے وہ سب کچھ کیوں نہ کہہ ڈالوں جو ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک دل میں بھرا ہوا ہے۔" زینے کا دروازہ مقفل کر دیا گیا۔ لیکن چپکے سے اس کی چابی غائب ہو کر تکئے کے نیچے پہنچ گئی۔

چوکی کے گھنٹے نے ٹن ٹن دو بجائے۔ گھر میں سب بے خبر سو رہے تھے۔ وہ تکئے کے نیچے سے چابی نکال کر ننگے پاؤں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہوا کا یک بھیگا سا جھونکا آیا اور اس کی

جوانی کو ہلکورہ دے گیا۔ کسی نے سوتے سوتے پاؤں پٹخا۔ اور وہ دبے قدموں پانی کی گھڑونچی کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ وہ تھوڑی دیر تک تاروں کی روشنی میں سب کو گھورتی رہی کہ کہیں کوئی جاگ تو نہیں رہا ہے۔ پھر اطمینان کر کے اس نے چپکے چپکے تالا کھولا۔ اب دروازہ کھولنے کی مہم تھی۔ لیکن وہ بھی بغیر چیں چپڑ کئے اس طرح وا ہو گیا جیسے کوئی بھوکی بھکارن چند ٹکوں کی خاطر لوتھ پڑ جائے۔ کتنے زور سے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ جیسے اب وہ پسلیوں کو توڑ کر رہے گا۔ زینے کے گھپ اندھیرے میں اس کی جلتی ہوئی آنکھوں کے سامنے وہ سب تارے ناچ رہے تھے۔ جو اس نے سرشام سے اس وقت تک گنے تھے۔ اور اس کی کنپٹیاں شدت جذبات سے دھڑ دھڑ کر رہی تھیں۔ اس پر بھرائے ہوئے مچھروں کی بھن بھن اور کچوکے۔ جانے کس مشکل سے آدھے زینے طے کئے۔ اس وقت تو واقعی اسے اپنا جسم پہاڑ معلوم ہو رہا تھا۔ شوق' خوف اور اندھیرا۔ سانس روکنے سے اس کا سر چکرانے لگا اور پھر آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے دھبے پھیل گئے۔

گدا گد ـــــ وہ جوان پچھتی' گیند کی طرح زینوں پر گرتی اچھلتی باپ کے پلنگ کے پھیل سے جا ٹکرائی۔

ہو ہو ـــــ ہائے ـــــ چور ـــــ اللہ چیخیں سنکر اس کی آنکھوں کے سامنے کے رنگ برنگے دھبے سکڑ گئے۔ لالٹین کی بتی اونچی کی گئی۔

"ہے ہے یہ۔" ماں نے ایک دوہتڑ اپنے متزلزل سینے پر رسید کیا۔ "ارے میں تو پہلے ہی اس رنڈی کے گن دیکھ رہی تھی۔ ہائے تو مر کیوں نہ گئی۔" غریب ماں کو تو جیسے غش آنے لگا۔

"ذبح کر دوں گا اسے' بس کوئی روکے نہ مجھے ـــــ کہے دیتا ہوں۔ اوپر سے ہو کر آئی ہے مردار۔" باپ کی حالت مارے غیرت کے غیر ہو گئی۔ لیکن شاباش ہے کہ آپے سے باہر تو تھا۔ لیکن کہہ رہا تھا سب چپکے چپکے ـــــ ارے ہاں کوئی اور محلے والے سن لیں تو ـــــ تو ـــــ

بڑا بھائی شاید اپنی نئی معشوقہ کا خواب دیکھتے دیکھتے چونکا تھا۔ اس لئے اس کی جو حالت تھی بس بیان سے باہر۔ دوسرے وہ کتنی ہی بار اشاروں ہی اشاروں میں اسے سمجھا بھی چکا تھا کہ "دیکھو یہ کنواں ہے اس میں کسی بہن کو نہیں گرنا چاہئے۔" اس پر بھی نہ مانی تو یہ لے ـــــ بس چوٹی پکڑی اور دینا شروع کئے جھٹکے۔ باپ کی غیرت اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ اب جو اتنا آسان طریقہ دیکھا تو خود بھی جٹ گیا۔ لیکن ماں چونکہ بارھویں

امید سے تھی۔ اس لئے محنت سے گریز کر گئیں۔ ویسے جتنی بھی خاص قسم کی گالیاں یاد تھیں۔ ہر پھر کر دہرائی جا رہی تھیں۔ لیکن وہ بے انتہا تکلیف محسوس کرتے ہوئے بھی چیخ نہ سکتی تھی۔ ارادے کی ناکامی انسان کو بزدل بنا دیتی ہے اور بزدل ہی دنیا سے خوف کھاتا ہے۔ اس میں اتنی ہمت ہی نہ تھی کہ ان مجرم مصنفوں کے خلاف زبان ہلا سکے۔

کتنے ہی مہینے گزر گئے اس واقعے کو۔ وہ سمجھتی تھی کہ جس طرح بڑے بھائی عیاشیاں "سیانا ہے' یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے" کہہ کر بھلا دی جاتی ہیں۔ اسی طرح اس کے عزم گناہ کو بھی فراموش کر دیا جائے گا "لیکن پگلی! عورت کی حیثیت کو بھول گئی۔ عورت ایک کٹھ پتلی ہے جس کی ڈور سماج کے کوڑھی ہاتھوں میں ہے اور ان کوڑھی ہاتھوں میں جب چل ہونے لگتی ہے تو ڈور کے جھٹکوں سے یہ کٹھ پتلی نچائی جاتی ہے۔ لیکن اگر اس کٹھ پتلی میں جان پڑ جائے اور وہ اپنی مرضی کے مطابق حرکت کرنے لگے تو سماج کا لوتھ پڑا ہوا سڑاندھ جسم —— کس سے دلچسپی لے؟" وہ سوچتی تھی کہ جس طرح اس کے گھر والے اس کی جوانی کے تقاضوں کی طرف سے کان بہرے کر کے بیٹھ رہے۔ اسی طرح اس واقعے کو بھول کر اپنی غلطی کو تسلیم کر لیں گے۔ لیکن یہ محض اس کا خیال تھا۔ اس کے فرشتہ صفت سرپرستوں کی نظر میں اس کی زندگی پر گناہ کی جو خراش آگئی تھی۔ بھلا وہ کبھی مندمل بھی ہو سکتی تھی۔

"بدمعاش ——" ماں اس کی اتری صورت ہی دیکھ کر ایک سانس میں گھنی گھنی گالیاں سنا ڈالتی۔

معمولی خراش لعن طعن کے زہریلے ناخنوں سے کریدی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ خراش ایک بڑا سا گھاؤ بنا دی گئی۔ ایسا گھاؤ جو اندر ہی اندر سڑ کر زہریلا ہو جائے اور پھر اس کا زہر زندگی پر سکرات طاری کر دے۔ لیکن خوفناک ناخن پھر بھی چین نہیں لیتے ——

"یہاں کیوں پڑی ہے؟ نگوڑی کو بخار ویسے ہی رہتا ہے۔ اس پر یہ دیوار اور دھوپ مگر میں جانتی ہوں کہ سب کے سنگ بیٹھ کر کاہے کو دل لگے گا۔ بات چیت ہو گی اور بیوی بنو کا دھیان بھٹکے گا۔" ماں کھنساتی ہوئی لوٹا لے پاخانے میں جا گھسی۔

اس نے نڈھال ہو کر اپنی ٹانگیں سمیٹ لیں۔ باورچی خانے کی چھت پر مسٹنڈے بندر اپنے حساب زخمی بندر کا علاج کر رہے تھے۔ اس کے سینے میں درد پھر انگڑائیاں لینے لگا۔ حلق سے سینے تک سرسراہٹ اور پھر وہی ہڈیوں کا پگھلا ہوا گودا سے اندر ہی اندر تلنے لگا۔

"اللہ!" اس نے للک کر پکارا اور پھر اپنی فریادی نظریں نیلے آسمان کی طرف اٹھائیں

جو ایک وسیع ڈھکنے کی طرح دنیا پر رکھا ہوا تھا۔ نظریں دیر تک ڈھکنے کے اس پار جانے کی کوشش کرتی رہیں۔ جہاں اس کے خیال سے انصاف و رحم کی دنیا بسی تھی۔ لیکن فریادی نظریں ناکام رہیں۔ تھک کر اسے خیال آیا کہ اللہ میاں اپنی دنیا کو آسمان کے ڈھکنے سے ڈھک کر مطمئن ہو گئے ہیں۔ جس طرح وہ ایک دن کٹورے میں بچی کچھی دال رکھ ڈھک کر مطمئن ہو گئی تھی۔ لیکن جب ایک گرم دوپہر گزرنے کے بعد اسے دال کا خیال آیا تو دیکھا دال سڑ کر بجبجا رہی تھی۔

خدیجہ مستور

بھورے

محمد بھورے ولد محمد بوٹے کے دماغ میں کوئی خلل پیدا ہو گیا ہے۔ یہ سب کا متفقہ فیصلہ تھا مگر مس لال خاں ہاؤس سرجن کا خیال تھا کہ ان کے دماغ میں کوئی خل نہیں ہے کیونکہ وہ بقائمی ہوش و حواس تمام کام انجام دیتا ہے۔ اگر گھنٹے کی آواز سے اس پر بے چینی طاری ہو جاتی تو یہ کوئی جذباتی معاملہ ہے۔

محمد بھورے سے اس معاملے میں تقریباً سبھی نے پوچھ گچھ کی مگر جواب میں اس نے ہمیشہ دانت نکال دیئے اور اس طرح ہنسا جیسے سب کو چڑا رہا ہو۔ مس لال خاں نے اس معاملے میں بھورے سے بڑی رازداری کے ساتھ معلومات حاصل کرنی چاہئیں مگر وہ ان کی ہمدردی اور خلوص کو بھی بڑی بے اعتنائی سے ٹال کر صرف تنہا رہ گیا۔ آخر کار مس لال خاں کا بھی خیال بدل گیا اور انہیں بھی ماننا پڑا کہ یہ خلل ہے مگر محض لمحاتی، جو گھنٹے کی آواز سے پیدا ہوتا ہے اس لئے بھورے بے زار سا انسان ہے اور اسے اپنی ملازمت پر موجود رہنا چاہیے۔

محمد بھورے اپنی ملازمت پر موجود رہا مگر یہ کسی کو نہ معلوم ہو سکا کہ یہ ایک کہانی ہے جو بھورے کسی کو نہیں بتانا چاہتا اور وہ اس کہانی کے ایک بڑے ہی مسرت انگیز انجام کا منتظر ہے۔ یہ کہانی اس طرح ہے کہ:

سیتا پور کا مہاجر محمد بھورے اس زنانہ امراض کے اسپتال میں آٹھ سال سے کام کر رہا تھا۔ اس کی ڈیوٹی اسپتال کے اس ٹیلی فون پر لگی ہوئی تھی جو ہاؤس سرجنوں اور ٹریننگ حاصل کرنے والی لڑکیوں کے لئے وقف تھا۔ دوسرا ٹیلی فون جو دوسری طرف تھا، مریضوں اور ان کے سرپرستوں کے لئے وقف تھا۔ دونی ڈبے میں ڈال کر جس کا جی چاہے فون کر لے۔ اس دوسری طرف ہر وقت ہلڑ سا مچا رہتا۔ اس کے باوجود ٹیلی فون چپڑاسی پرائیویٹ کمروں کے مریضوں کو پیغام بھی پہنچا دیتا اور مریض خوش ہو کر اسے انعام بھی دے دیا کرتے۔ اس طرح خاصی آمدنی ہو جاتی مگر بھورے اس آمدنی اور اس ٹیلی فون دونوں سے

توبہ کرتا تھا۔ اس نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ اس کی ڈیوٹی دوسرے ٹیلی فون پر تبدیل کر دی جائے۔ وہاں پر قریبی لیبر روم سے آتی ہوئی چیخیں صاف سنائی دیتیں۔ سب بدحواس سے نظر آتے مگر یہاں اس طرف بڑی بڑی محرابوں والے برآمدے میں ہر طرف سکون طاری رہتا۔ سامنے وسیع لان کے درختوں پر چڑیاں چہکا کرتیں۔ گرمیوں میں لو کے گرم جھونکے بھی برآمدے تک آتے آتے ٹھنڈے ہو جاتے۔ سردیوں میں چمکیلی دھوپ گھنٹہ دو گھنٹے برآمدے میں لوٹتی رہتی اور برسات میں جب چھم چھم بارش ہوتی تو کبھی کبھی بوچھار برآمدے کی محرابوں سے داخل ہو کر بھورے کے قدموں کو بھگو جاتی۔ یہاں کے سناٹے کے اور بھی بہت سے فائدے تھے۔ یہاں وہ آزادی سے جوان آیاؤں اور بوڑھی آیاؤں کی لڑکیوں سے عشق لڑا لیتا تھا۔ اتوار' اتوار فلموں کے میٹنی شو دیکھنے کی وجہ سے اس کو عشق کرنے کے ہزاروں طریقے معلوم ہو گئے تھے۔ تنخواہ کا آدھا حصہ تحفوں میں خرچ کرنے کے بعد بھی بھورے کی زندگی بڑے مزے سے گزر رہی تھی۔ اس کی زندگی میں صرف اس چیز کی کمی تھی کہ اس کی محبوبائیں فلمی ہیروئنوں کی طرح نہ تو اس سے محبت کرتی تھیں اور نہ باوفا تھیں۔ و ہمپوں کی طرح بے وفا اور ہرجائی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اور بہت سوں سے بھی تحفے وصول کر لیتی ہیں' وہ اپنی محبوباؤں کو جی جان سے بدمعاش سمجھتا تھا۔ اسی لئے اس نے اب تک شادی نہ کی تھی اور نہ اسے شادی کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ مہاجر بننے کے بعد شادی کا تصور اس کے ذہن میں دھندلا کر رہ گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب بندر بارش میں بھیگتا ہے تو اسے گھر بنانے کا خیال آتا ہے مگر بھورے انسان تھا اور بارش سے سر بچا سکتا تھا۔ اس لئے اسے گھر بنانے کی کیوں فکر ہوتی۔ ویسے بھورے کو شادی سے نفرت بھی نہ تھی البتہ شادی کرنے کے لئے جس قسم کی پاک دامن اور محبت کرنے والی بی بی کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے اب تک نظر نہ آئی تھی۔ اس لئے وہ زندگی سے خوش اور مطمئن تھا۔ مقدور بھر عیش کر رہا تھا۔ ملازمت میں بھی کوئی تکلیف نہ تھی سارا دن میلی پرانی آرام کرسی پر پڑا فون ریسیو کرتا یا پھر گایا کرتا۔ جب وہ سیتا پور میں تھا تو راتوں کو اپنی ٹولی کے ساتھ تھالی بجا کر بارہ ماسے گایا کرتا تھا۔ اس کے ساتھی اس کی سپاٹ آواز کی تعریف کرتے تھے۔ یہ وہی تعریف تھی جس نے آج تک اس کا پیچھا نہ چھوڑا تھا۔ نئے فلمی گانوں سے اسے بڑی نفرت تھی وجہ یہ تھی کہ بڑی کوشش کے باوجود ان ٹیڑھے میڑھے فلمی گانوں کی نقل نہ اتار سکا تھا۔ ان دھنوں کی نقل کرتے ہوئے اس کی آواز جواب دے جاتی اس لیے اسے اپنے وہی پرانے گانے جی جان سے پیارے تھے۔ سیتا پور چھوڑے دس

سال ہو گئے تھے۔ مگر وہ ان گیتوں کا ایک آدھ بول ہی بھول سکا تھا۔

لاہور میں بھورے بالکل اکیلا تھا۔ ماں باپ سیتا پور ہی میں مر چکے تھے اور خالہ جس نے اسے پالا تھا سیتا پور ہی میں رہ گئی تھی۔ خالہ نے اس کے صرف ایک خط کا جواب دیا تھا۔ اس کے بعد بھورے نے کئی خط لکھے مگر کوئی جواب نہ آیا تو اس نے سمجھ لیا کہ بیچاری بوڑھی مرکھپ گئی ہو گی۔ دکھ پالو تو جوان ہو ہو کر ستاتے ہیں مگر پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دو تو فرصت مل جاتی ہے' بھورے بھی کچھ اسی طبیعت کا آدمی تھا لیکن جب سے اس کو یہ محبت کا روگ لگا تو دنیا ہی بدل گئی' آیائیں اور اس کالی کلوٹی نرس کی لونڈیا اس کے سامنے مٹک مٹک کر تھک گئیں پر بھورے نے ان کو کوئی تحفہ نہ دیا۔ ایسا جی اچاٹ ہوا کہ پھر تفریحاً" بھی ان پر محبت کی نظر نہ ڈالی۔ رات اس کے کوارٹر میں آنے کا مژدہ سنا کر للچاتیں تو وہ جیسے بہرہ بن جاتا۔ اس طرح چار پیسوں کے لئے آخر کون پیچھے پھرتا رہتا۔ وہ سب بھی اسے پاگل سمجھ کر چھوڑ گئیں۔

پہلی بار جب اس نے بھورن کو بے دردی سے دھتکارا تھا تو بظاہر اسے محسوس نہ ہوا تھا مگر جب وہ تھکے تھکے قدم ڈالتی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو ذرا ہی دیر بعد بھورے کو ایسا لگا کہ ایک پھانس ہے جو دل کے پاس کھٹک رہی ہے۔

بھورے نے جی بہلانے کے لئے الاپنا شروع کیا۔

نہ تم سے دل کو لگاتے نہ غیر کہلاتے
گلوں میں بیٹھے گلزار کی ہوا کھاتے

ہوں —— ہوں —— ہوں —— ہوں —— ارے ہاں مفت ہوئے بدنام سنوریا تیرے لئے۔ پھر وہ لمبی سانس لے کر میلی پرانی آرام کی کرسی پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ آج جنے ساری فون کرنے والیاں کہاں مر گئیں۔ اس نے اپنی سیکنڈ ہینڈ گھڑی کی طرف دیکھا۔ دس بج گئے ابھی تو کلاسیں بھی نہ ختم ہوئی ہوں گی —— تم کو تو مسٹر بھورے یوں ہی جلدی مچی رہتی ہے ابھی وقت ہی کیا ہے۔ وہ پاجیوں کی طرح مسکرایا۔ نیچی کرسی پر بیٹھ کر اونچے پر ہاتھ مارنا بھورے کے بس میں نہ تھا مگر نظروں پر کون اونچ نیچ کی چھاپ لگا سکتا ہے۔ فون کرنے والیوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں مزے لوٹ لیا کرتا۔

فون کرنے والے بہت سے چہرے اس کے سامنے ناچ گئے۔ اس نے مسرت سے آنکھیں بند کر کے کرسی پر لیٹنے کے انداز سے پاؤں پھیلا دیئے مگر لمحے بعد پھر وہی اکتاہٹ اور افسردگی اس کے دل میں گھمسان کارن ڈالنے لگیں۔ آج تو کسی خیال سے بھی اسے

پہلی جیسی خوشی نہ مل رہی تھی۔ وہ پھر گانے لگا۔

ہوائیں کوچے سے ہر طرح کی ترے آئیں
سزائیں دل کے لگانے کی سینکڑوں پائیں

ہاں ہاں —— ہوں ہوں ——

مفت ہوئے بدنام سنوریا تیرے لئے

تیسرا مصرع بیتے ہوئے برسوں نے ذہن سے نکال پھینکا تھا۔

چلی گئی تو کیا ہو گیا؟ ایسی ایسی بہت پھرتی ہیں۔ مسٹر بھورے تم کو کیا کمی ہے؟ مایوسی کے دن میں اس نے مسرت کا جھنڈا لہرانا چاہا اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس سائیڈ پر سالی کیسی خاموشی رہتی ہے۔ آج بھورے کو یہ جگہ بری معلوم ہونے لگی۔ اس نے سوچا کہ وہ ادھر ہوتا' اس طرف کے ٹیلی فون پر اس کی ڈیوٹی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ ہر وقت آنے جانے والوں کا شور' عورتوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں سالے سارے برے خیال و بال بھاگ کھڑے ہوتے ہیں' دماغ میں تو بھس بھر جاتا ہے' انسان کی ذات سے نفرت ہو جاتی ہے اور یہ عورت ذات کیسی ڈھیٹ ہوتی ہے۔ بچہ جنتے ہوئے کتنا شور مچاتی ہے۔ چیخ چیخ کر کان کھا لیتی ہے جنم جنم کے لئے بچہ پیدا کرنے سے توبہ کرتی ہے اور پھر سال کے اندر پیٹ پھلائے اسی اسپتال میں آتی نظر پڑتی ہے۔ کیسا عجیب سا لگتا ہے۔

اور پھر جانے کہاں سے ایک خیال بھورے کے دماغ میں آ گھسا۔ جو میں نے جورن سے شادی کر لی ہوتی تو ایک وہ بھی یہاں آتی۔ میں ساری رات لیبر روم کے دروازے پر کھڑا اس کی چیخیں سنتا رہتا۔ جنے سنتا کہ بھاگ کھڑا ہوتا' چیخوں سے تو دل دکھتا ہے۔ بھورے نے لمبی ٹھنڈی سانس بھری۔ جنے کہاں چلی گئی ہو۔ اس عورت ذات کا دل تو دیکھو' اتنی بڑی دنیا بنا دی اور اس کی کوئی عزت نہیں۔ کیسا دھتکار دیا تم نے بھورے۔

زور سے گھنٹہ بجنے کی آواز آئی۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی اور مریضہ آ گئی ہے پرلی طرف کے گیٹ کا چوکیدار سامنے کے لان سے ہوتا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا۔ بھورے اچک کر کھڑا ہو گیا۔ "کتھے سے آ رہے ہو بادشاہو" اس نے ہنس کر ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے وقت کے لئے پنجابی کے تھوڑے سے لفظ سیکھ لئے تھے جو وہ اپنی زبان کے ساتھ ملا کر استعمال کر لیا کرتا۔ "آؤ دو سوٹے ہو جائیں۔ سگرٹ کے "بھورے نے جیب سے اگلا سگریٹ کی ڈبیا نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔

یار تیرے تو مزے ہیں' ٹھاٹھ سے بیٹھا رہتا ہے۔ "چوکیدار نے سگریٹ کا دھواں

اڑاتے ہوئے کہا۔ میرے پھاٹک سے ابھی ایک عورت کی لاش گئی ہے۔ بس جی خراب ہو گیا۔ ادھر وہ گئی ادھر دوسری آ گئی بچہ جننے۔"

ہاں!بھورے نے بجھی سی آواز میں کہا' اسے ایک دم خیال آیا کہ جب وہ پیدا ہوا تھا تو اس کی ماں بھی مر گئی تھی۔ یہ بات اس کی خالہ نے اسے بتائی تھی۔

یار عورت ذات کیسی جیالو ہوتی ہے؟ "بھورے نے لمبی ٹھنڈی سانس بھری۔ "لوگ تو یونہی بھی اس عورت ذات کے پیٹ میں بچہ ڈال دیتے ہیں۔ کتنا دکھ جھیلتی ہے یہ عورت۔"بھورے کا جی بھر رہا تھا۔ اسے پھر بھورن یاد آ رہی تھی۔

"جیالو اوئے رہنے دے' یہ عورت زاد بچہ نہ پیدا کرے تو جانو اس پر ساری دنیا کا دکھ پھٹ پڑتا ہے۔ اپنی خوشی سے کرتی ہے' پھر اتنی گندی ہوتی ہے یہ عورت ذات۔"چوکیدار نے نفرت سے شانے سکوڑے اور جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر سرگوشی کے انداز سے بولا۔"بیئر کی پوری بوتل لے آیا ہوں۔ دل کرے تو رات میرے کوارٹر میں آ جا' تجھے بھی چاند ستارے دکھا دوں۔"

بھورے صرف ہنس کر رہ گیا۔ اس وقت اسے چوکیدار کی کوئی بات اچھی نہ لگی تھی۔ اس وقت تو اسے اپنی ماں یاد آ رہی تھی۔ بھلا ماں کس طرح گندی ہو سکتی ہے۔ اور پھر یہ پینے پلانے کی بات۔ اس نے ایک دن پی تو تھی مگر ذرا سی پی کر گھوم گیا تھا۔ اسی وقت مس زیدی آ گئی تھیں۔ وہ کرسی سے بھی نہ کھڑا ہوا اور بیٹھا گاتا رہا تھا۔"کیسے تیرا انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو "مس زیدی نے اسے بڑے زور سے ڈانٹا تھا۔"تم کو کیا ہو گیا ہے۔ تمہاری رپورٹ ہوگی۔"

"دارو پلائے دی اپنے یار نے ماپھی دیو مس صاحب۔"نشے کی حالت میں وہ اردو انگریزی اور پنجابی کے سارے الفاظ بھول گیا تھا اور صرف اپنی مادری زبان یاد رہ گئی تھی۔ مس زیدی کو ایک دم ہنسی آ گئی تھی تو وہ گڑ گڑا کر رونے لگا تھا۔

"آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا' تم تو بہت اچھے ہو بھورے" مس زیدی فون کر کے چلی گئیں تو بھورے اس فکر میں دم بخود پڑا رہا تھا کہ کہیں اس کی شکایت نہ ہو جائے مگر مس زیدی نے شکایت کرنے کے بجائے خوب قہقہے لگائے تھے اور سب کو بتایا کہ بھورے پی کر ان کے تیر سیدھے کرا رہا تھا۔

ادھر ادھر کی باتوں کو یاد کرتے کرتے بھورے نے تھک کر سامنے دیکھنا شروع کر دیا۔ اوپر کی سیڑھیوں پر کھٹ کھٹ ہو رہی تھی۔ وہ سنبھل گیا۔ اس آواز سے وہ سمجھ جاتا کہ

کوئی فون کرنے آ رہا ہے۔ برآمدے کے اوپر والی منزل پر بہت سے کمرے تھے جہاں طالب علم اور ہاؤس سرجن لڑکیاں رہتی تھیں۔ وہ ان سب کے نام اور ہسٹریاں تک جانتا تھا۔ کون کسے فون کرتا ہے۔ کون کس کا دوست ہے۔ کون محبت میں کامیاب ہو گیا ہے اور کون ناکام۔ رات کس نے آنسو بہائے تھے۔ کس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں' کون سکون سے سویا تھا۔ کس کا ملنے والا آیا تھا۔ کون سی فلم دیکھی تھی۔ شادی کا کب ارادہ ہے۔

مس لال خاں مسکراتی ہوئی فون کے پاس آئیں تو بھورے کھڑا ہو گیا۔ ہلو' ناصر بول رہے ہو' ہوں ہوں۔ نہیں بھئی' ہائے میں مر گئی تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ اچھا کل ضرور آنا' خدا حافظ۔

مس لال خاں کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں آپ ہی آپ مندی جا رہی تھیں۔

مس لال خاں کے جانے کے بعد بھورے نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ سب یہی کرتے ہیں' سب ایک جیسے ہوتے ہیں بھورے۔ ظہوریا کب آئے گی؟ وہ آئے تو وہ اسے سینے سے لگا لے گا—— ارے! وہ اپنے اس خیال پر چونک پڑا۔ بھلا اسے یہ خیال آیا ہی کیوں' وہ تو خواہ مخواہ اسے یاد کر رہا ہے۔

رکھی آپا کی لڑکی کی بڑے ٹھسے سے اس کی طرف آ رہی تھی۔ بھورے نے شوق سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ لجاتی ہوئی اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ بھورے نے ادھر ادھر دیکھ کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

"ابھی بازار نہیں گئے' لاؤ گے میرا کپڑا؟" وہ اترا رہی تھی۔

بھورے نے اس کے بھرے بھرے جسم پر کئی چٹکیاں لے لیں—— لا دونگا ڈیئر۔

برآمدے کے پرلی طرف کوئی آ رہا تھا۔ لڑکی جیسے بڑی مصروفیت کے ساتھ جلدی سے آگے بڑھ گئی اور بھورے کو محسوس ہوا کہ اس کی طبیعت ذرا کھل گئی ہے۔

سکون کی ایک سانس لے کہ وہ کرسی پر پھیل کر لیٹ گیا۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ اس نے سوچا کہ کل آپا کی لونڈیا کو کچھ نہ کچھ ضرور لا دے گا۔ اسے اپنی انگلیوں میں چٹکیوں کی لذت محسوس ہو رہی تھی۔

ایک بار پھر گھنٹے کی تیز آواز گونجی تو اتنی مشکل سے پیدا کی ہوئی لذت ایک دم رفو چکر ہو گئی۔ اس کا جی دکھ گیا۔ اسی طرح تو ظہوریا بھی آتی ہو گی۔ اکیلی پڑی رہتی ہوگی اور کوئی دور دور پوچھنے والا نہ ہوتا ہو گا۔

اس کی نظر برآمدے کے اس ستون کی طرف اٹھ گئی جو اس کے ٹیلی فون سے تھوڑی

دور تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس وقت بھی بھورن وہاں لیٹی ہے۔۔۔

وہ برسات کی ایک دوپہر تھی۔ اس دن ہوا بند تھی اور مارے امس کے جی گھٹا جا رہا تھا۔ بھورے اپنی کرسی پر بیزار پڑا اونگھ رہا تھا۔ اس وقت اسے محسوس ہوا کہ کوئی دبے قدموں اس کے پاس سے گزر گیا ہے۔ اس نے آنکھ کھول دی۔ چوڑی چوڑی نیلی دھاری کی قمیض اور مردانہ سا پاجامہ پہنے جنرل وراڈ کی کوئی مریضہ ستون کے پاس دری کا ٹکڑا بچھا رہی تھی۔ وہ تو سمجھا تھا کہ کوئی اس کی اپنی ہو گی اور ذرا وقت مزے سے گزر جائے گا۔ اس نے بڑی بے اعتنائی سے منہ پھیر کر دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ جنرل وارڈ کی زچائیں گرمی سے گھبرا کر ادھر آجاتیں۔ کھلی فضا اور سناٹے میں ذرا دیر غفلت کی نیند سو کر چلی جاتیں۔

بادلوں کے ہلکے ہلکے ٹکڑے آسمان پر اس طرح پھیلے ہوئے تھے جیسے راہ میں دھول اڑ رہی ہو۔ سامنے لان میں بڑھی ہوئی گھاس پر ایک ہد ہد جانے کیا چگ رہا تھا اور بڑی اونچائی پر کوئی چیل پر پھیلائے اڑی جا رہی تھی۔ اس وقت بھورے نے اکتا کر آنکھ کھول دی۔ ساری قمیض پسینے سے تر ہو رہی تھی اور وہ عورت بھی اب اٹھ کر برآمدے کے ستون سے سر ٹیکے بیٹھی جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ بادلوں کے دوچار چھوٹے چھوٹے سیاہ ٹکڑے کہیں دور سے سفر کرتے ہوئے سامنے آگئے تھے۔

عورت ہولے ہولے گانے لگی۔

انبوا تلے ڈولا رکھ دے مسافر آئی ساون کی بہار رے

بھورے نے چونک کر ادھر دیکھا اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ عورت اسے سنانے کے لئے گا رہی ہے۔ اپنے محل میں گڑیاں کھیلت تھی' سیاں نے بھیجے کہار رے۔

عورت کی آواز ذرا سی اونچی ہو گئی مگر اس کا سر اسی طرح برآمدے کے ستون سے ٹکا ہوا تھا۔ ویسے تو بھورے کو اسپتال میں آکر بچے پیدا کرنے والی عورتوں سے ذرا دلچسپی نہ تھی مگر آج جانے کیوں اس عورت کا وجود اس کے لئے کشش کا باعث ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ عورت ہو گی مزے دار' کرسی سے اچک اچک کر دیکھنے کے باوجود اسے اس کا چہرہ نظر نہ پڑا۔ ستون اس کے چہرے کی آڑ کر رہا تھا۔

بھورے شرارت سے کھنکارا' اس وقت وہ بھول گیا تھا کہ اس حرکت پر اس کی شکایت بھی ہو سکتی ہے۔ اسے یقین تھا کہ عورت صرف اسے سنانے کے لئے گا رہی ہے۔ آخر اور بھی تو عورتیں تھیں کھانستی کراہتی آتیں اور لیٹتے ہی آنکھیں بند کر لیتیں۔ گانے کوئی نہ

بیٹھتا۔

کھنکارنے کی آواز پر عورت یوں چپ ہو گئی جیسے سچ مچ ڈولے میں سوار ہو کر سیاں کے گھر چلی گئی ہو۔ چند منٹ تک وہ یوں ہی سر نیکے خاموش بیٹھی رہی۔ پھر دری کا ٹکڑا سمیٹ کر کھڑی ہو گئی۔

جب وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بھورے کے پاس سے گزرنے لگی تو اس نے بڑی نفرت سے بھورے کی طرف دیکھا اور پھر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ ارے تو سیتا پور کا بھورے ناہیں ہے؟

اور تو بھورن ہے؟

دونوں کی نظروں میں اضطراب تھا۔ عورت نے شرما کر دوپٹہ ماتھے تک کھینچ لیا اور نظریں جھکا لیں۔ بھورے کرسی سے اچھلا اور پھر بیٹھ گیا۔ کلیجے پر چوٹ سی لگی۔

وقت نے پلٹ کر دیکھا۔ بھورے کی خالہ نے بھورن کی پیدائش پر ٹھیکرے میں پیسہ ڈال کر دیا تھا۔ اس طرح بھورن ساری برادری کی نظروں میں بھورے کی ہو گئی تھی اور جب بھورن بارہ سال کی ہوئی تھی تو بھورے کو دیکھ دیکھ کر شرمانے لگی تھی۔ وہ اپنی بھیگتی ہوئی مسوں پر ہاتھ پھیر کر سخت احمقوں کی طرح ہنستا تھا۔ پھر جب بھورن چودہ پندرہ برس کی ہو گئی تھی تو اپنے ساتھ کھیلنے والی لڑکیوں سے پیغام بھجواتی تھی کہ بھورن تیرا انتظار کر رہی ہے۔ ڈولا لے کر کب آئے گا۔ بھورے محنت مزدوری کر کے کوڑی کوڑی بچا رہا تھا کہ گھر آباد کر لے خالہ کے لئے خدمت کرنے کو کوئی آجائے اور پھر یہ کہ بھورن اسے اچھی بھی لگنے لگی تھی۔ اسی زمانے میں ملک آزاد ہو گیا۔ بھورے لاکھوں کمانے کے لئے لاہور آگیا اور کئی سال دھکے کھانے کے بعد اسپتال میں نوکر ہو گیا۔ لاہور کی رنگین زندگی اور تنہا شخص۔ بھورن تو خواب کی طرح یاد رہ گئی تھی اور سیتا پور—— بھلا کیا رکھا تھا۔ سیتا پور میں سارا دن سڑکوں پر دھول اڑا کرتی۔ راہ گیر درختوں تلے گٹھڑیاں' سرہانے رکھ کر سوتے رہتے اور درختوں پر بیٹھے ہوئے بندر اس تاک میں دیدے گھماتے رہتے کہ کیا اچک لے جائیں۔ بابو لوگوں کے تھوڑے سے بنگلے' پرانی وضع کے دو چار مندر' لڑکیوں کا ایک کالج جہاں رات گئے تک کیرتن کی آواز آتی رہتی۔ بھلا کون یاد رکھتا ہے اس سیتاپور کو؟

مگر اب جبکہ بھورن اس کے سامنے کھڑی تھی تو اس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ بھورن کسی دوسرے کی ہو گئی۔ وہ جیسے بھورے کی خالہ نے ایک آنہ ٹھیکرے میں ڈال کر بھورے کے لئے خرید لیا تھا اور اب اس کے ایک آنے کے بدلے میں اس سے وفاداری نہ پا کر

دکھ سے تلملا اٹھا تھا۔ اس اسپتال میں آنے کے بھلا کیا مطلب ہیں۔ یہی ناکہ بچہ پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یا پھر کسی زنانے مرض کا علاج۔

"کیسے آنے ہوا اسپتال میں؟" بھورے نے تصدیق چاہی۔

مگر بھورن کچھ نہ بولی۔ سر جھکائے ساکت کھڑی رہی' پھر نظریں اٹھا کر اور بھورے کو بڑی دکھی دکھی نظروں سے دیکھ کر لان کی طرف دیکھنے لگی جہاں ایک پیاسی ٹیٹری شور مچاتی اڑی جا رہی تھی۔

"مینہ برسے گا ٹیٹری چنک رہی ہے۔" بھورن نے دھیرے سے کہا۔

"ہوں!بھورے کو اپنے دکھ میں اچانک کمی کا احساس ہونے لگا۔ کیا کہتی تھی خالہ۔ ٹکے کی ہنڈیا گئی' کتے کی ذات پہچانی۔

"چاچا چاچی کہاں ہیں؟ بھورے نے دنیا کی باتیں کرنا شروع کر دیں مگر بھورن کی میلی پیلی آنکھوں میں ایک دم آنسو آ گئے۔ وہ بھورے کے قدموں کے پاس پکے فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ ایسی تھکی اور نڈھال نظر آ رہی تھی جیسے کوسوں دور سے چل کر آ رہی ہو' بھوکی پیاسی' پیروں میں چھالے۔۔۔اماں آتے ہی ہیضے میں مر گئی۔ دو سال ہوئے کہ بابو بھی ٹرک تلے آ کر اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس دوسرے بڑے اسپتال میں تین دن پڑا رہا تھا۔ اس نے دوپٹے کے پلو سے آنسو خشک کر لئے۔

بھورے نے نظریں جھکا لیں۔ بھورن کو اس حال میں دیکھ کر اسے بھی افسوس ہو رہا تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکا۔

صدیاں گزر گئیں مگر ان دائمی جدائیوں کے دکھوں کو ہلکا کرنے کے لئے آج تک کوئی لفظ ایجاد نہ ہو سکا۔

زینوں پر لوہے کی ہیل کھٹ کھٹ کر رہی تھی۔ بھورے سنبھل کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

مس رضیہ فون کرنے آ رہی تھیں۔ وہ کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ بھورن سر جھکائے اسی طرح بیٹھی رہی۔

کون ہے یہ؟مس رضیہ نے رسیور اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"اپنے سیتا پور کی ہے مس صاحب۔" بھورے نے کہا۔ بھورن نے نظریں جھکا لیں۔ یہ سر کی جندگی کچھ نہیں ہوتی' اپنے سیتا پور میں سارے لوگ جانتے تھے کہ بھورن بھورے کی کیا لگتی ہے۔ بھورن نے ٹھنڈی سانس بھری۔

مس رضیہ فون کر کے چلی گئیں تو بھورے پھر بیٹھ گیا۔ اس نے بھورن کی طرف دیکھا

جو بڑی معصومیت سے چہرہ اٹھائے جانے کس طرح اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ دھیرے دھیرے کہنے لگی "جب سے کھالہ کے پاس تیسرا کھط آیا تھا بس اسی روج سے میں بابو سے کہنے لگی تھی کہ تو بھی لاہور چل۔ تیرے بنا سیتاپور جنگل لگتا تھا۔ تو بہت یاد آتا تھا۔ اماں نے سادی کے جو کپڑے بنوائے تھے وہ اب تک کلیجے سے لگا کر رکھ چھوڑے ہیں۔ کبھی تن کو نہیں لگائے' بابو نے تجھے اس لاہور میں سب جگہ تلاش کیا پر تو نہ ملا۔ بڑے سہروں میں کتنا آدمی بستا ہے پر اماں کو اللہ جنت دے کہا کرتی تھی کہ جی سے ڈھونڈو تو کھدا بھی مل جاتا ہے۔ سچ کہتی تھی اماں' وہ مسکرانے لگی۔

چھوڑو ان باتوں کو اب' پرائی ہو کر ایسی باتیں کیوں کرتی ہے؟"بھورے جھلا اٹھا یہ عورت ذات بھی بڑی چترباز ہوتی ہے۔ اب نخرے کر رہی ہے۔

"یہ تو کہہ رہا ہے؟ بھورن نے جانے کیسی سرشاری سے آنکھیں بند کر لیں۔" میں تو جی جان سے تیری ہوں بھورے" وہ ساری جان سے کانپنے لگی۔ پہلے بیمار چہرے پر ہلکی سی سرخی رینگ گئی اور بھورے نے اپنے سیتاپور میں دیکھا کہ ایک چمپئی رنگ کی لڑکی سرخ اوڑھنی اوڑھے کواڑوں کی اوٹ سے اس کو تاک رہی ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لے۔

اس نے پوری آنکھیں کھول کر بھورن کو دیکھا۔ یہ جی جان کو لے کر کیا کرنا ہے۔ اب ایسی باتیں یاد کرنے سے کیا فائدہ ہوگا—" تم اسپتال کیوں آئی ہو؟"اس نے پھر اچانک سوال کیا۔

بھورن نے آنکھیں کھول دیں اور ادھر ادھر دیکھنے لگی— دیکھ اب تو بادل گھر کر آ گئے ہیں۔"

"اصلی بات کیوں چھپاتی ہے۔ کہہ دے نا کہ جب میں نہیں ملا تو تیرے باپ نے دوسرے کے ہاتھ پکڑا دیا' ایکٹرسوں والے نخرے نہ مار اب۔"اسے غصہ آ گیا تھا۔

واہ رے— اس نے غرور سے سر اونچا کر لیا— بھورن ایسی نہیں کہ ایک کے بعد دوسرا کسم کر لے۔ میری شادی تو تیرے ساتھ ہو چکی تھی۔ تیری کھاطر اپنا دیس چھوڑا' ماں باپ چھوٹے' ماں یہاں نہ آتی تو بیجہ کیوں ہوتا' بابو سڑک تلے کیوں آتا—" وہ رو پڑی — یہ سب تو جبردستی ہے' بابو کے بعد کون دیتا روٹی' کوٹھیوں میں کام کر کے پیٹ بھرتی تھی' پر بھورے یہ سہری بابو بڑے کھراب ہوتے ہیں۔ ہر سال اس اسپتال میں آ کر کچے بچے جنتی ہوں۔ مر مر کر جیتی ہوں۔ بابو صاحب اپنے کسی بیرے کھانسامنے کو میرا سوہر لکھا

جاتے ہیں۔ اس باری وہ کھانساماں کہتا تھا کہ بھورن ایسے کب تک چلے گا میرے ساتھ دو بول پڑھا لے۔ تجھے لے کر دور بھاگ جاؤں گا۔ پر میں ایسا کر سکتی تھی؟"—— وہ سسکیاں بھرنے لگی اور پھر ڈوبتی ہوئی آواز میں بولنے لگی—— "اب تو مل گیا ہے بھورے اب میں کہیں نہ جاؤں گی' دیکھ برتن مانجھ مانجھ کر ہاتھ گھس گئے۔ "اس نے بے بسی سے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ اس کی ہتھیلیوں میں مشقت کے گھٹے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے اپنا سر گھٹنے پر ٹیک لیا اور گھٹی گھٹی سسکیاں بھرنے لگی۔

بھورے چپ چاپ بیٹھا اسے روتے دیکھتا رہا۔ جیسے وہ کوئی راہ چلتا اجنبی تھا۔ ساری لگاوٹ اور حسد رفو چکر ہو چکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس بھورن سے اب اس کا کیا واسطہ ہو سکتا ہے۔ یہاں تو جانے کتنی اس کے پیچھے پھرتی ہیں۔ اس کی کون سے خواہش ہے جو پوری نہیں ہو جاتی۔ اس نے تو یہ کبھی سوچا نہ تھا کہ کوئی ایسی ویسی عورت اس کی بیوی بن جائے مگر اب یہ بھورن جانے کتنے حرامی بچے جن کر اسے بیتی باتیں یاد دلانے آئی ہے۔

روتے روتے بھورن نے خود ہی چپ ہو کر آنسو پونچھ لئے۔ شاید وہ انتظار کر رہی ہو گی کہ اب بھورے اسے چپ کرائے گا۔ اب اپنے ریشمی رومال سے آنسو پونچھے گا' اب اسے تسلی دے گا۔

آنسو پونچھ کر وہ اسے ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی اور بھورے اس سے نظریں بچا رہا تھا۔ بھلا بھورن بھورے کی بیوی بن سکتی ہے! بھورے جس کی اس برآمدے اور ٹیلی فون پر حکمرانی ہے۔ ذرا کبھی بھورن دیکھتی تو' وہ کس شان سے رسیور اٹھا کر ہلو کہتا ہے اور کتنی لڑکیاں اس کے پیچھے پھرتی ہیں۔

"تو پھر تو اسی خانساماں سے شادی کر لے بھورن۔" بھورے نے بڑی ہمدردی سے مشورہ دیا۔ "میں نے تجھ سے شادی کی تو لوگ کیا کہیں گے۔" وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"ارے یہ تو کہہ رہا ہے؟" اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بھورے کو دیکھا اور پھر کھڑی ہو گئی۔ جا رے میرا نام بھورن ہے۔

میری سادی جو ہوئی تھی سو ہو گئی۔ میں تیری جیسے نہیں ہوں۔ بادہ لے لے جو دوسری سادی کروں—— اس نے بڑے غرور سے سر جھٹکا—— "بھورن جندگی بھر تیرے نام پر بیٹھی رہے گی اور دوسروں کے بچے اسی اسپتال میں آ کر پیدا کرے گی۔ یہ سب کسمت کے کھیل ہیں رے۔"

وہ ایک بار پھر تڑپ کر روئی مگر جلدی سے آنسو پونچھ کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس کا کمزور جسم کانپ رہا تھا۔۔۔ اماں کو اللہ جنت نصیب کرے' وہ کہتی تھی بھورن ڈھونڈے تو کھدا مل جاتا ہے۔ جانے لوگ ایسی کہاوتیں کیوں بناتے ہیں اس نے مایوسی سے سر جھکا دیا۔ ایک لمحے تک یوں ہی کھڑی رہی۔ پھر اس نے بھورے کو ایسی نظروں سے دیکھا کہ اسے اپنا کلیجہ ہلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ مگر جب وہ کچھ کہنا چاہتا تھا تو بھورن بڑی تیزی سے اپنے جھانکڑ جیسے جسم کو لہراتی برآمدے کے اس سرے پر جا چکی تھی۔

بھورے دیر تک برآمدے کے اس موڑ کو دیکھتا رہا جہاں بھورن کھو گئی تھی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو جیسے چونک پڑا۔

"مس زیدی آج چھٹی پر ہیں' جی کہیں گئی ہیں۔ یہاں نہیں ہیں۔ بھورے نے پہلی بار اپنی ڈیوٹی سے بے ایمانی کی۔

پھر وہ بھورن کو ٹھکرانے والا پہلا دن یوں ہی اچاٹ اچاٹ سا گزر گیا۔ وہ لاکھ گاتا رہا۔

نہ تم سے دل کو لگاتے' نہ غیر کہلاتے
گلوں میں بیٹھتے' گلزار کی ہوا کھاتے

پھر بھی اس کا دل بجھا بجھا رہا۔ شام ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد وہ جیسے خود بخود کھنچتا ہوا جرنل وارڈ کی طرف چلا گیا۔ آیا نے اسے بتایا کہ اس نام کی عورت تو گھنٹہ پہلے چھٹی لے کر چلی گئی۔

چلی گئی تو کیا ہو گیا؟ وہ بھلا اسے پوچھنے آیا ہی کیوں تھا؟ بھورے نے اپنے آپ سے پوچھا اور پھر واپس ہوتے ہوئے اس نے لہک کر گانا چاہا، مگر گا نہ سکا۔ اس پر ایک دم مایوسی کا دورہ سا پڑنے لگا۔ ادھر ادھر پھرنے کے بجائے اپنی کوٹھری میں جا کر بے سدھ سا پڑ رہا۔

جب اندھیرا پڑنے لگا تو سیتاپور کی بھورن سرخ اوڑھنی اوڑھ کر کوٹھری کے ادھ کھلے دروازوں سے تانک جھانک کرنے لگی۔ بھورے بلبلا کر اٹھا اور زنجیر چڑھا کر اپنے حساب ایک بار پھر بھورن کو دھتکار دیا۔

باہر بڑے زور سے بارش ہو رہی تھی۔ کوئی ہولے ہولے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ بھورے کو یہ بھی وہم لگا۔ اس نے اپنے آپ کو دو چار موٹی موٹی گالیاں دیں اور کروٹ لے کر منہ چھپا لیا۔ وہ یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ کئی دن پہلے اس نے جمادارنی کی سب سے

چھوٹی بیٹی کو اپنی کوٹھری میں آنے کی دعوت دی تھی اور اب وہ باہر کھڑی اپنے اکلوتے بوسیدہ جوڑے کو نچوڑ نچوڑ کر بیتابی سے دروازے پیٹ رہی تھی۔ ظالم بارش کا ایک ایک قطرہ روپے کی طرح کھنک کر اسے چڑا رہا تھا۔

بھیگتے بھیگتے تھک کر جب ساتویں بیٹی واپس لوٹ رہی تھی تو مارے دکھ کے رو رو کر بھورے کو کوس رہی تھی—— مرجائے لاش اٹھے' ایک روپیہ دینے کا وعدہ کر کے مکر گیا۔

اور پھر یوں ہوا کہ پہلے دن اور پہلی رات والی کیفیت بھورے کے دل و دماغ پر نقش ہوتی چلی گئی۔ اس نے بھورن کو جھنجلا جھنجلا کر لاکھوں بار دھتکارا۔ جمادارنی کی ساتویں بیٹی کو ایک کے بدلے میں تین روپے دے ڈالے۔ کالی کلوٹی نرس کی لونڈیا کو جمپر کا ایک کپڑا بھی لا دیا۔ فرصت کے وقت خوب لہک لہک کر اپنے محبوب گانے بھی گاتا رہا مگر کہتے ہیں کہ پتھر کا لکھا ہوا نہیں مٹتا۔ بھورن کی محبت پتھر کی تحریر بن گئی—— بھورے میں تیری ہوں' بادہ لے لے جو دوسری سادی کروں' تیرے نام پر بیٹھی رہوں گی اور دوسروں کے بچے اسی اسپتال میں آکر پیدا کرتی رہوں گی۔

پھر—— برسات بیت گئی۔ سردیاں آکر گزر گئیں۔ بہار منہ موڑ گئی اور جب گرمیاں آ گئیں تو بھورے نے انگلیوں پر پورے مہینے گنے۔

اس دن جب گیٹ کے چوکیدار نے کسی حاملہ عورت کی آمد پر گھنٹہ بجایا تو بھورے بے تابی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ برآمدے کے قریبی موڑ کو کاٹ کر وہ ادھر پہنچ گیا جہاں آیائیں پہیوں والے اسٹریچر کو گھسیٹتی ہوئی لاتیں اور مریضہ کو اس پر ڈال کر لے جاتیں۔

دن میں کئی بار گھنٹہ بجتا۔ جانے کون کون آتا مگر بھورن نہ آئی۔ بھورے نے سوچا' ایسے کاموں میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ واپس آکر وہ بڑی امنگ سے گاتا۔

بچھڑے ہوئے ملیں گے پھر خالق نے گر ملا دیا

مئی جون کی گرمیاں گزر گئیں مگر بھورے کے انتظار میں کوئی فرق نہ آیا۔ مس لال خاں اپنے عاشق سے بے وفائی کر کے' کسی دوسرے سے شادی رچا کر اسپتال چھوڑ گئی تھیں۔ مس زیدی کو دوسرے اسپتال میں زیادہ بہتر جگہ مل گئی تھی۔ بہت سی پرانی لڑکیاں چلی گئیں' بہت سی نئی آ گئیں۔ جنرل وارڈ کی بھنگن کی سب سے چھوٹی ساتویں بیٹی جانے کس کے ساتھ بھاگ گئی تھی مگر بھورے کو ان باتوں سے کوئی مطلب نہ تھا۔ اس نے جانے کتنی بہت سی چیزیں بھورن کے لئے کوٹھری میں جمع کر رکھی تھیں جن میں ایک سرخ جوڑا بھی تھا۔

آج بادل چھا رہے تھے۔ پیاسی ٹیٹری چیختی ہوئی اڑی جا رہی تھی۔ بھورن دری کا ٹکڑا اٹھائے بھورے کے سامنے سے گزر کر ستون کے پاس جا رہی تھی۔ بھورے نے آنکھیں ملیں— کب آئے گی ظہوریا؟ کب آئے گی— اس نے ایک بار پھر انگلیوں پر دن گنے۔ پورے بارہ مہینے ہو رہے تھے۔

بھلا بھورے کو کیسے معلوم ہوتا کہ ایک مہینے پہلے سرخ کھدر کی چادر سے منہ چھپائے جو عورت تانگے پر آئی تھی اور جسے آیاؤں نے بڑی مشکل سے لاد کر اسٹریچر پر ڈالا تھا' وہ بھورن تھی' جس نے اپنا نام تمیزن لکھایا تھا اور جو خون کی انتہائی کمی کی وجہ سے مر گئی تھی اور صاحب کا نامزد شوہر بھورن کی لاش کو طالب علم لڑکیوں کے لئے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

پورے بارہ مہینے۔ بھورے نے سوچا کہ اب وہ ضرور آتی ہو گی— آج نہیں تو کل آ جائے گی۔ اس نے بڑے سکون سے پاؤں پھیلا دیئے اور لہک کر گانے لگا۔

بچھڑے ہوئے ملیں گے پھر خالق نے گر ملا دیا

٭٭٭

بانو قدسیہ

ذات کا محاسبہ

کھلی گٹھڑی کی طرح وہ بکھرا رہتا تھا۔ اس نے کئی راتیں ہمسائے کے چھتنارے درخت کو کھڑکی میں دیکھ کر گزاری تھیں۔ ذی شان کو اس درخت کے پتے ڈالیاں چاندنی راتوں میں خاموش چمک کے ساتھ بہت پراسرار وحدت لگتی تھیں۔ وہ سوچتا کہ اتنے سارے پتوں کے باوجود درخت کی اکائی کیسے قائم رہتی ہے۔ اگر یہ پتے ڈالیوں سے علیحدہ ہو جائیں تو ان بکھرے پتوں کو کیسے سمیٹا جا سکتا ہے۔

تب تک اسے معلوم نہیں تھا کہ پتے درخت کے اپنے وجود سے پیدا ہونے والے تھے اور وہ جن خواہشات کی وجہ سے بکھرا تھا وہ سب اس کے بیرون سے آئی تھیں۔

کبھی کبھی کار چلاتے ہوئے اسے احساس ہوتا کہ جس طرح جاپانی خودکشی کرتے ہیں اور ہار اکیری کرتے وقت اپنی کھوکھری کے ساتھ تمام انتڑیاں اور پیٹ کے عضلات نکال پھینکتے ہیں۔ ایسے ہی اس کے بھی کسی عمل سے اس کا انتڑپٹیا بکھر گیا اور اب وہ جلد اور پٹھوں کی مضبوط ڈھال نہیں تھی جس میں اس کے بکھرے ہوئے وجود کو منڈھا جاتا۔

اس بات کا ایک بار اسے ہلکا سا خیال ان چھ ماہ کی چھٹیوں میں آیا تھا۔ جب اس نے ایف اے کا امتحان دے کر بی اے کے داخلے سے پہلے اپنے لیے بہت لمبے چوڑے پلان بنائے تھے۔ صبح سوئمنگ پھر ورزش پھر گٹار کے سبق، شام کو فرنچ کی کلاسیں رائڈنگ وغیرہ تمام دوستوں کے ساتھ فرداً فرداً سچ کا رشتہ ماں باپ کی عزت، بہن بھائیوں سے محبت، رشتہ داروں کا پاس....

ایف۔ اے کے امتحانوں سے پہلے اسے نہ دوسروں سے اتنی توقعات تھیں نہ ہی وہ اپنے وجود کو اس قدر گانٹھ کر رکھتا تھا لیکن امتحانوں کے دنوں میں اس نے بڑی محنت کی پرچے اچھے ہوئے اور پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی ذات کا محاسبہ اور مواخذہ کیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ محاسبہ چاہے کسی غیر کا ہو یا اپنا ہو ہمیشہ کڑا ہوتا ہے۔ اس میں چونی دونی کی چھوٹ نہیں ملتی۔

اس محاسبے تلے وہ بہت جلد کثیرالمقاصد ہوتا چلا گیا لیکن ایف اے پاس تھا اس لیے اسے علم نہ ہو سکا کہ فوارے کی طرح وہ بہت سے چھیدوں میں سے نکل کر پھوار تو بن سکتا ہے آبشار کی صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ جب تمام تجارتوں کا گیدڑ بننے کی خاطر اسے اپنا سونا' کھانا پینا' آرام' گپ بازی ترک کرنا پڑتی تو اندر عاجز آ جانے کا خیال ابھرتا۔ اسے لگتا جیسے وہ کسی مبہم سے عارضے میں مبتلا ہے لیکن اس نے اپنے آپ سے ایسی توقعات وابستہ رکھی تھیں کہ اپنے بنائے ہوئے ضابطے سے باہر نکلنا اس کے بس کی بات بھی نہ تھی۔

ایک روز وہ الکٹرونک کی ہابی میں مشغول اپنے اردگرد بہت سے سرکٹوں کے کاغذ جیسی تاریں گتے کا دیا پھیلائے بیٹھا تھا کہ ماموں آ گئے۔ ماموں خوش زبان' متوسط طبقے کے کچھ بے فکرے کچھ ذمے دار آدمی تھے۔ انہوں نے اپنی کائنات اس قدر نہیں پھیلا رکھی تھی کہ اس کے نیچے انہیں خوف آنے لگے۔

"مچھلی کا شکار کھیلنے جا رہے ہیں' چلو گے؟"

"کہاں ماموں—— میں یہ چھوٹا سا سرکٹ مکمل کر لوں۔"

ماموں آرام سے کرسی میں بیٹھ گئے۔

"ذی شان!"

"جی ماموں"

"تم بہت اچھے آدمی ہو۔"

"تھینک یو ماموں۔"

"باوجود کہ تمہارے ابو امی نے تم پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ تم میں ایک اچھے انسان بننے کی تمام خوبیاں اور خرابیاں موجود ہیں۔"

"تھینک یو ماموں۔"

"بات یہ ہے بیٹا Activity بہت اچھی چیز ہے لیکن کثیرالمقاصد انسان اتنا ہی پراگندہ ہو جاتا ہے جس قدر ست الوجود کام سے نفرت کرنے والا پوستی—— اپنے آپ کو کہیں دھجیوں میں نہ بانٹ دینا—— سالم رہنا—— سالم۔"

وہ ماموں کی بات بالکل نہ سمجھتا تھا پھر بھی اس نے سوال کیا۔ وہ کیسے ماموں آج کی زندگی میں سالم کیسے رہا جا سکتا ہے۔"

"بس خواہشات کا جنگل نہ پالو—— آرزو کا ایک پودا ہو تو آدمی منزل تک بھی پہنچتا ہے اور بکھرتا بھی نہیں۔"

ذی شان چونکہ گوشت پوست کا بنا ہوا انسان تھا اور انسان جو بھی سیکھتا ہے یا تو ذاتی لگن سے سیکھتا ہے یا اپنے تجربے کی روشنی میں خوف سے سیکھتا ہے۔ اس لیے تجربے کی کمی کے باعث ذی شان کو ماموں کی باتیں کتابی لگتیں۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ ماموں متوسط طبقے کا آدمی تھا۔ اس کی قمیض کے کالر پر ہلکی سی میل ہوتی۔ ماموں کا رہن سہن معمولی تھا۔ ایسے لوگوں کی باتیں سن تو جا سکتی ہیں لیکن ان کی سچائی پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔

ذی شان کے لئے زندگی کی ایک دوڑ کی شکل اختیار کرتی گئی۔ ایسی دوڑ جو سیدھی نہیں تھی۔ کئی راستوں' کئی پگڈنڈیوں' کئی سرنگوں میں سے ہو کر نکلتی تھی۔ اپنی دستار بندی میں وہ اتنا مشغول تھا کہ اسے علم نہ ہو سکا کہ کب اس نے اکنامکس ایم۔ اے کر لیا۔ کس وقت وہ اعلیٰ قسم کا ڈیبیٹر بھی ہو گیا۔ اسے ڈراموں میں بھی ٹرافیاں مل گئیں فوٹو گرافی کے مقابلوں میں بھی اس کی تصویروں کو انعام ملنے لگا۔ کھیلوں میں بھی اس کا نام بولنے لگا۔ مختلف رسالوں میں اس کی غزلیں بھی چھپ چھپا کر قابل ذکر کہلانے لگیں۔ دو ایک اخباروں میں خصوصی نمائندہ بنے رہنے کی وجہ سے اس کی جنرل نالج شہری واقعات کے متعلق بہت بھرپور ہو گئی۔

اس کے ساتھ ساتھ ان چار سالوں میں اس نے تین چار ادھورے پورے عشق بھی کئے۔ ان محبتوں کا اس کی ذات پر گھمبیر اثر نہ ہو سکا کیونکہ جن لڑکیوں سے اس نے محبت کی تھی ان کے بھی عشق کے علاوہ کئی مشاغل تھے۔ وہ بھی کثیرالمقاصد تھیں اور پرانے زمانے کی محبوباؤں کی طرح نہ تو ہارسنگار ہی کو اپنا شعار سمجھتی تھیں نہ ہی اٹوانٹی کھٹوانٹی لے کر پڑی رہتی تھیں—— انہیں بھی کالج جانا ہوتا۔ شاپنگ کے لئے وقت نکالنا پڑتا۔ بیوٹی پارلر سے فیشن کرانے ہوتے۔ سہیلیوں مرجانیوں کا دل رکھنے کے لیے لمبے لمبے فون کرنے ہوتے۔ پھر سوشل لائف تھی۔ کچھ ان کے والدین کی کچھ ان کی اپنی—— کچھ اپنے خواب تھے شادی کے' کچھ خواب تھے Career کے—— ان لڑکیوں کے ساتھ جو معاشقے ہوئے ان میں زیادہ وقت فون پر گزرا' یا پھر اچھے ہوٹلوں میں جہاں زبان کے لطف کے ساتھ ساتھ خوشبوؤں' خوبصورت لباسوں کی چمک کے ارد گرد روشنیوں میں ایک دوسرے کے ٹیسٹ پر اعتراضات کے ساتھ ساتھ لڑائیاں بھی ہوئیں—— اچھی پیاری پیاری باتیں بھی کی گئیں —— اور آخر میں دوستوں کی طرح ایک دوسرے کو الوداع بھی کہا گیا۔

یہ شکم سیر قسم کے عشق نہیں تھے جو دکھ یا سکھ کی آخری سرحدوں کو چھوا کرتے ہیں۔ یہ نورا کشتی سے مشابہ تھے کہ خوب دھول دھپا کے بعد اکھاڑے سے پسینے میں شرابور نکلی

زخموں سے چور نکلے اور اپنے اپنے راستے پر یوں چل دیئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

انہی دنوں جب اس کی شادی کی باتیں کامن ٹاپک تھیں۔ رشتے بھی آ رہے تھے اور افیئرز بھی چل رہے تھے' اس کی پھوپھی زاد بہن کا رشتہ بھی آیا۔ پھوپھی عرصہ سے غیر تھیں۔ وہ اپنے سسرال میں رچ بس گئیں تھیں لیکن ذی شان کی لیاقتوں کے شہرے سن کر وہ بھی امیدوار تھیں کہ ان کی آراء کا کچھ جوڑ توڑ ذی شان سے ہو جائے۔ نام تو پھوپھی زاد کا پتہ نہیں نسرین آراء یا جہاں آراء تھا لیکن بلاتے سبھی اسے آراء تھے۔ ذی شان کو یہ دھان پان سی لڑکی شروع سے ہی لکڑی چیرنے والا آرا ہی لگی۔

آراء بالکل ماڈرن تھی۔ سطحی طور پر دلچسپ اور اندر سے ٹھس سی لڑکی۔ وہ میک اپ کپڑے' بی اے کی ڈگری' بیوٹی پارلر' وی سی آرا پر دیکھی ہوئی فلموں کا ملغوبہ تھی —— دو چار ملاقاتوں کے بعد کھلا کہ اس کی پسند ناپسند کچھ ذاتی نہ تھی بلکہ فلم ایکٹرسوں' شاعروں ادیبوں اور کرکٹروں کے انٹرویو پڑھ پڑھ کر مرتب کی گئی تھی۔ ایسے ہی اس کے کچھ نظریات تھے جو ہرگز کسی ذاتی کاوش یا تدبر کا نتیجہ نہ تھے بلکہ بڑوں کی محفلوں میں بیٹھ بیٹھ کر اخذ کیے گئے تھے —— وہ دیکھنے' سننے اور چاہنے میں بڑی جاذب تھی لیکن کچھ ملاقاتوں کے بعد اس روغنی ہانڈی کا اصلی پن ظاہر ہونے لگتا اور لوگ اسے پریشر کُکر کے زمانے میں بالکل ویسے ہی بھونتے جیسے وہ روغنی ہانڈی کو بھونتے ہیں۔

ذی شان کو آراء میں واقعی کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن کچھ ملاقاتیں دلچسپ رہیں اور پھر بخار ٹوٹ گیا۔ ان ہی دنوں وہ دو چار نوکریوں کے لیے بھی کوشش کر رہا تھا۔ ابا جی کی وہ زمین جو واہگے کے قریب تھی اس کی دیکھ بھال بھی اس کی ذمہ داری تھی۔ پھر دو لڑکیاں اور بھی تھیں جن کو کبھی کبھی ڈرائیو پر لے جانا' ہوٹل میں ٹریٹ دینا اس کا سردرد تھا۔

ان مشاغل کے علاوہ اس کی امی کی صحت بھی گر رہی تھی اور انہیں جملہ ڈاکٹروں کو دکھانا' دوائیاں لانا' ٹسٹ ایکسرے کرانا' امی کی دلجوئی اور رشتہ دار خواتین کو بیماری کی تفصیلات مہیا کرنا' اس کے مشاغل تھے۔ ان مشاغل کے علاوہ اسے وی سی آر پر فلمیں دیکھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ کرکٹ میچ اور وڈیو فلموں کو دیکھنے کے لیے جب اسے وقت نکالنا پڑتا تو کبھی کبھی بڑی الجھن کا سامنا ہوتا۔

ایسے ہی وقت میں جب وہ وی سی آر پر ایک دھماکے دار مار دھاڑ کی فلم دیکھ رہا تھا اور اس کی امی نے فون پر اپنی نند کو جواب دے دیا تھا تو آراء ان کے گھر آئی —— ذی شان کی تمام تر توجہ اس وقت فلم میں تھی لیکن آراء روٹھی ہوئی لگتی تھی۔ وہ اس کے

پاس آ کر صوفے پر بیٹھ گئی اور چپ چاپ مار دھاڑ کی فلم دیکھنے لگی۔

ذی شان کو معلوم نہیں تھا کہ اس کی امی اس رشتے کے لیے انکار کر چکی ہیں۔ اگر اسے معلوم بھی ہوتا تو بھی کچھ اتنی زیادہ حسرت اس کے دل میں جگہ نہ پاتی۔ وہ کبھی کبھی تکلف کے ساتھ آراء کو مسکرا کر دیکھ لیتا اور پھر فلم دیکھنے میں مشغول ہو جاتا۔ آراء کی حالت اس سے مختلف تھی۔ وہ اندر ہی اندر کچھ جملے بنا سنوار رہی تھی۔ کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی۔ کچھ بتانے پر آمادہ تھی۔

جب فلم میں وقفے کے بعد چند اشتہار آنے شروع ہو گئے تو ذی شان نے فراخدلی سے پوچھا:۔

"کیا حال ہیں؟"

"کیوں خیر تو ہے بڑی مایوس سی لگتی ہو۔"

آراء کی جانب سے بڑا لمبا خاموشی کا وقفہ آ گیا جس وقفے میں ذی شان نے اپنے اندر ہی اندر آنے والے چار گھنٹوں کا پروگرام مرتب کیا اور وہ روٹ بنایا جس پر کار لے جانے سے اسے دوہرے تہرے پھیرے پڑنے کا احتمال نہ ہو۔

"مامی جی نے تو انکار کر دیا ہے آج صبح۔"

وہ چند لمحے سمجھ نہ سکا کہ کس لیے کس کو اور کس بات سے مامی جی نے انکار کر دیا ہے۔

"آپ کو تو شاید کچھ فرق نہ پڑے۔"

اب بات کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنے لگی۔"

"آراء۔۔۔ دیکھو میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔۔۔ یہ بہتر ہے کہ اب میں تمہیں چھوٹا سا زخم دوں بہ نسبت اس کے کہ بعد میں تمہیں۔۔۔ ساری عمر تکلیف دیتا رہوں۔۔۔ ابھی میں Settle ہونا نہیں چاہتا۔ میں ابھی طے نہیں کر سکا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ کدھر اور کس کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔"

آراء یقیناً ایک ماڈرن لڑکی تھی لیکن ماڈرن لڑکیوں کے بھی کئی گریڈ ہوتے ہیں۔ اور اس کا گریڈ چپراسیوں کا سا تھا جو انکار سن کر زیادہ اصرار نہیں کر سکتے۔ وہ اٹھی۔۔۔ اور دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ پھر اس نے دو قدم ذی شان کی جانب بڑھائے اور کہا:

"ذی شان تمہاری Activities زیادہ ہیں۔ اتنے مشاغل ہوں تو آدمی بٹا رہتا ہے۔ کبھی کبھی خالی بیٹھ کر اپنے ساتھ بھی وقت گزارا کرو۔۔۔ کافی دھند چھٹ جاتی ہے اور دور

تک نظر آنے لگتا ہے— پھر فیصلے اپنے بھی ہوتے ہیں اور آسان بھی—"

"ذی شان نے آراء کی بات پر کوئی توجہ نہ دی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ آراء زیادہ تر باتیں نامور ادیبوں کے اقتباسات یاد کر کے کرتی ہے۔

آراء اس کی زندگی سے نکل گئی۔ غالباً وہ کبھی آئی ہی نہ تھی۔ اس کے بعد اس کی شادی ہو گئی اور شادی کے بعد مشاغل میں اور اضافہ ہو گیا۔

اس کی بیوی ایک کھاتے پیتے گھرانے کی خود ساختہ لاڈلی تھی۔ وہ بھی ایک متمول خاندان کا پڑھا لکھا خوبصورت فرد تھا۔

کبھی سسر کی گاڑی' کبھی باپ کی کار' کبھی اپنی کبھی بیوی عاتکہ کی گاڑی میں کئی جگہوں پر جانا پڑتا۔ کہیں کام' کہیں تفریح— لیکن مل جل آنا جانا سمیٹنا پھیلانا اس قدر تھا کہ فرصت کے لمحات سکڑتے گئے اور وہ اپنے آپ سے کبھی نہ مل سکا۔

ایک بعد طے پا گئی کہ پاکستان میں رہ کر خاطر خواہ ترقی نہیں ہو سکتی۔ یہاں وسائل اور مواقع کی بہت کمی ہے۔ یہ نہیں کہ ذی شان کو مالی طور پر کسی ترقی کی ضرورت تھی لیکن زندگی جمود کا نام بھی تو نہیں ہو سکتا۔

پاکستان میں ذی شان اور عاتکہ کی زندگی ایک روٹین کا شکار ہو چکی تھی اور اتنے سارے مشاغل کی پیروی نے انہیں چڑچڑی بلی کی طرح کھمبے کو نوچنا سکھا دیا تھا۔

جب بھی انہیں فرصت کا کچھ وقت ملتا وہ ایک دوسرے سے کسی نہ کسی طور کی شکایت ہی کرتے۔ کبھی تمام الجھنوں کی وجہ یہ تھی کہ پاکستان میں ٹریفک ٹھیک نہیں۔ یہاں کا تعلیمی نظام پسماندہ ہے۔ تمام سسٹم کام نہیں کرتے۔ وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔ پھر خاندان والے بے جا مداخلت کرتے ہیں۔ شخصی آزادی کا نام و نشان کہیں نہیں۔ دوست ریاکار منافق ہیں— اصلی رشتوں کی پہچان گم ہو گئی ہے۔ نقلی رشتے بہت زیادہ ہیں—!

دفتروں میں گپ بازی اور فائل سسٹم بہت زیادہ ہے۔ بیورو کریٹ کی سرداری ہے۔ ماں باپ مشفق کم ہیں' مطالباتی زیادہ ہیں۔ بہن بھائیوں کی اپنی اپنی دلچسپیاں ہیں۔ وہ اپنے اپنے مدار پر ہیں۔ غرضیکہ جب ذی شان اور عاتکہ کو پاکستان سے اور پاکستان میں بسنے والوں سے اتنی شکایات ہو گئیں کہ انہیں ان شکایات کا کوئی حل نہ مل سکا تو انہوں نے اپنی بے قراری کا حل صرف یہی سوچا کہ وہ لندن چلے جائیں اور وہاں قسمت آزمائیں۔

لندن جانے سے پہلے ایک روز پھوپھی جان سے ملنے گیا۔ آراء ایک کند قینچی سے گلاب کا پھول کاٹ کر اپنی ٹوکری میں ڈال رہی تھی۔ وہ ذی شان سے ایسے ملی جیسے ان

دونوں کے درمیان کبھی کچھ تھا ہی نہیں لیکن جب ذی شان چلنے لگا تو آراء کچھ چپ ہو گئی۔

"واپس کب آؤ گے؟"

"بس آتا جاتا رہوں گا۔"

"اچھا؟آراء نے سوالیہ نظروں کے ساتھ پوچھا۔

"بھئی آتا جاتا رہوں گا۔ یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ امی ابو سے ملنے آؤں گا ہی۔"

"کبھی کبھی اپنے آپ سے بھی مل لینا ذی شان—— تنہائی میں—— جو شخص اپنے ساتھ نہیں رہ سکتا وہ کسی کے ساتھ بھی نہیں رہ سکتا۔"

ذی شان نے آراء کی طرف دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ آراء ایسی باتیں اقتباسات سے اخذ کر کے بولا کرتی تھی اس لیے اس نے جب آراء کو خدا حافظ کہا تو ساتھ ہی اس کی بات کو بھی بھلا دیا۔

اس کے بعد پورے بیس سال تک اس کی ملاقات اپنے آپ سے نہ ہو سکی۔

لندن کی زندگی میں مشاغل اور بھی گوناگوں ہو گئے۔ پاکستان میں مالی' باورچی' دھوبی' جمعدارنی ایسے بہت سے وافر لوگ موجود تھے جو اس کی گھریلو زندگی کو سہل بناتے تھے۔ لندن میں یہ گھریلو کام بھی ان دونوں پر آ پڑے۔ عاتکہ اور وہ دونوں کام کرتے تھے۔ دونوں مل کر کھانا پکاتے تھے۔ دونوں مل کر صفائی کرتے تھے۔ دونوں مل کر بچے پالتے تھے۔ دونوں تمام چھٹیاں یورپ میں گزارتے تھے۔ چھٹیوں کا پروگرام بنایا—— سستے ٹکٹوں کی تلاش —— سستے ہوٹلوں کا سراغ—— ان گنت مصروفیات تھیں۔

گھر سے کام—— کام سے گھر—— پھر گھر پر گھریلو کام!

اس کی زندگی مکمل طور پر اپنی ضروریات' اپنے پیشے کی ضروریات' اپنے خاندان کی کفالت کی نذر ہو گئی اور بیس سال بعد اسے پتہ چلا کہ وہ اندر سے بکھر چکا ہے—— تب اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے دونوں بیٹوں کو لے کر واپس پاکستان چلا جائے گا۔

عاتکہ اس تبدیلی پر رضامند نہ تھی۔ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی تھی۔ پاکستان میں اسے اپنے ہاتھ سے اپنے ذاتی کام کرنے کی بھی عادت نہ تھی۔ مغرب میں رہنا اس نے اس لیے پسند کیا تھا کہ یہاں ذی شان اس کا گھریلو ملازم تھا۔ وہی Groceries لاتا کار چلاتا۔ تمام بل ادا کرتا' چونکہ ان کے فلیٹ میں لفٹ عموماً خراب رہتی تھی اس لیے تیسری

منزل پر تمام بھاری سامان اٹھا کر لے جانا بھی ذی شان کی شاندار ڈیوٹی تھی۔ مغرب میں کھاتے پیتے گھرانوں کے ایسے لڑکوں کے لیے مشکل زندگی تھی جو عیاش نہ تھے۔ پاکستان میں کوٹھی، کار، ملازم تمام چیزیں مہیا تھیں اور ان کے لیے کوئی جدوجہد یا تگ و دو نہ کرنا پڑتی تھی۔

ذی شان کے لیے مغرب کی زندگی ایک بڑی بیکار جدوجہد کا نام تھا۔ لمبی روٹین جس میں چھٹیاں بھی معمولات کے تحت آتیں لیکن عاتکہ پاکستان واپس نہ جانا چاہتی تھی وہ مغربی طرز معاشرت میں اپنے لیے ایک چھوٹی سی آزادی، ایک چھوٹا سا مقام حاصل کر چکی تھی۔ اس مقام اور آزادی کے لیے اسے بہت محنت کرنا پڑی تھی لیکن وہ واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔

جب ذی شان نے فیصلہ کر لیا کہ وہ پاکستان واپس جا کر بزنس کے امکانات دیکھے گا تو عاتکہ اور بچے پیچھے رہ گئے اور اس سفر کے دوران اسے دوبئی ایئرپورٹ پر آراء ملی — وہ ان بیس سالوں میں بھاری ہوگئی تھی لیکن اس کے چہرے پر بڑی شانتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کسی قسم کے گلے یا شکایتیں نہ تھیں۔ وہ دونوں ڈیوٹی فری شاپ پر سینٹ دیکھ رہے تھے جب اچانک ان کی نظریں ملیں۔

"ارے تم آراء!"

"ہائے ذی شان تم تو موٹے ہو رہے ہو اور بال بھی گرے کر لیے ہیں۔"

بڑی مدت کے بعد ملنے سے جو تپاک کی فضا پیدا ہوئی، اس کے تحت وہ دونوں لاؤنج میں ان ڈور پلانٹر میں گھری ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

"امریکہ — اور تم ذی شان؟"

"میں وطن — پاکستان۔"

"امریکہ میں رہتی ہو؟" — بڑی لمبی خاموشی کے بعد ذی شان نے سوال کیا — اسے کچھ دھندلا سا یاد تھا کہ آراء کا شوہر شکاگو میں کیش اینڈ کیری کا بزنس کرتا ہے۔

"ہاں۔"

"خوش ہو؟ امریکہ میں۔"

"ہاں — جس قدر خوشی ممکن ہے۔" آراء نے آہستہ سے کہا اور پھر چند ثانیے رک کر بولی:

"اور تم — تم خوش ہو لندن میں؟"

"پتہ نہیں — میں کچھ کہہ نہیں سکتا — مجھے لگتا ہے جیسے میری زندگی روٹین کی نذر ہوگئی ہے۔ چھوٹی چھوٹی دھجیوں میں بکھر گئی ہے — اچھا کھانا' صاف ستھرے گھر میں رہنا' اچھے بازاروں میں گھومنا — ہر وقت صفائی کا خیال رکھنا — زندگی کیا یہی کچھ ہے؟ اس کے کیا یہی معنی ہیں؟"

آراء مسکراتی رہی۔

"عاتکہ بھی کام ہی کرتی رہی ہے۔ میں بھی الجھا ہی رہا ہوں کاموں میں' حالانکہ اپنے وطن میں ہمیں سب کچھ میسر تھا — اور اس کے بدلے مجھے کیا ملا ہے؟ — اونچا معیار زندگی — لیکن معیار زندگی ہے کیا چیز؟ — اور جو کچھ مجھے ملا ہے' اس کے عوض میں اندر سے اس قدر کیوں بکھر گیا ہوں آراء — تم نے بھی تو ساری عمر امریکہ میں گزاری ہے کیا تم بھی اپنی زندگی کو اتنا بے معنی سمجھتی ہو — کیا تم بھی بکھری ہو اندر سے؟"

"نہیں۔"

"پر میں — میں کیوں اتنا کھوکھلا ہوگیا ہوں؟"

"اس لیے کہ تم کثیر المقاصد تھے ذی شان — ایک وقت میں کئی آرزوئیں پال کر جینے والا ٹوٹے گا نہیں تو اور کیا ہوگا؟"

"اور تم — تم بھی تو اس بے ہودہ دور کی پیداوار ہو' جب آرزوئیں ہر صبح ککرمتے کے کھیت کی طرح اگتی ہیں' تم نے اپنے آپ کو کیسے بچایا؟"

"اندر والے کو تو اندر ہی سے بچایا جاسکتا ہے ذی شان۔"

"پر کیسے؟ — کیسے؟"

"میں نے ساری عمر ایک ارمان پالا — اور اندر صرف اس کو سینچا۔ اس کی خاطر جیتی رہی — باقی ساری Activity تو فروعی تھی — جب خواہش ایک ہو اور اس کی سمت دیکھتے رہیں تو باقی بھاگ دوڑ اندر اثر نہیں کرتی۔"

"وہ ارمان — پورا ہوگیا تمہارا؟"

"نہیں — لیکن خواہش پوری ہو نہ ہو۔ یہ ضروری نہیں ہے۔ خواہش ایک ہی رہے — ایک وقت میں تو انتشار پیدا نہیں ہوتا — توڑ پھوڑ نہیں ہوتی۔"

ذی شان نے تعجب سے آراء کو دیکھا اور پھر ڈرتے ڈرتے سوال کیا:

"اور وہ خواہش — وہ ارمان کیا تھا؟ — کیا میں پوچھ سکتا ہوں۔"

آراء نے چند ثانیے ذی شان کو دیکھا جیسے بیس سال پیچھے لوٹ گئی ہو۔ ہلکا سا مسکرائی اور ڈیوٹی فری شاپ کی طرف بڑھتے ہوئے بولی:

"ذی شان! اگر تمہیں بھی معلوم نہیں تو بتانے سے فائدہ — اور پھر میں سوچتی ہوں، ارمان تو سینٹ کی بند شیشی کی طرح ہوتا ہے۔ اظہار ہو جائے تو خوشبو اڑ جاتی ہے۔ خواہش باقی نہیں رہتی۔"

آراء ڈیوٹی فری شاپ میں اس طرح داخل ہوگئی جیسے جھومتی جھامتی ہتھنی سندر بن میں غائب ہو جائے۔

ذی شان سوچتا رہا کہ اس آخری عمر میں — اتنے انتشار کے باوجود وہ کس اکلوتی خواہش کے دھاگے میں اپنی تسبیح کے دانے پرو سکتا ہے؟

***

جمیلہ ہاشمی

شیری

مہر کا تار اماں کے نام آیا "شیری کو برٹش ایرویز کی فلائٹ 32 سے لے لیجئے گا!"

سخت غصہ آیا میں نے اسے لکھا تھا۔ تم شیری کو یہاں کیوں بھجوا رہی ہو۔ اماں اپنا خیال تو ڈھنگ سے رکھ نہیں سکتیں۔ اس کا کیا کریں گی۔ تمیز سلیقے کا کوئی نوکر ان دنوں ملنا مشکل ہے اور جو ہیں وہ بھی بہتر جگہوں کی تلاش میں یہاں ان منے دل سے رہ رہے ہیں۔ جب تک پاپا تھے تو سب کچھ تھا اب تمہیں معلوم ہی نہیں ہو سکتا میں اکیلے یہ گھر کی کشتی کیسے کھے رہی ہوں۔ پریشانی اور شدید مصروفیت کا شکار رہتی ہوں امید ہے تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرو گی اور ضدی ہونے کے باوجود میری بات میں تم کو وزن معلوم ہو گا۔

میری بہن ہمیشہ کی بدتمیز بے مروت اور اپنے سامنے کسی کو کچھ نہ سمجھنے والی تھی اور مختصر نویس ہونے کے باوجود اس نے مجھے صفحوں کا کوسنوں طعنوں اور گالیوں سے بھرا خط لکھا تھا یہ کہ: "گھر پر اس کا بھی اتنا ہی حق تھا جتنا کسی اور کا تھا۔ شادی کے بعد لڑکیوں کا میکے سے کوئی ناطہ ٹوٹ تو نہیں جاتا کہ اسے بھی اپنے لئے اتنی سہولت لینے میں کوئی مانع نہیں ہو سکتا تھا۔ اماں بھی سب کی تھیں اور اگر ضرورت پڑے تو مدد بھی کر سکتی تھیں اور یہ کہ میں نے کب سے اپنے آپ کو اس گھر کا مالک تصور کرنا شروع کر دیا تھا۔ پاپا نہیں تھے تو کیا ہوا مکان پر تو اب بھی انہیں کا روپیہ صرف ہوتا تھا۔ شیری یہاں رہ سکتا تھا اور اماں خود ہی اس کے لئے مناسب دیکھ بھال کا بندوبست کر لیں گی۔ پھر آخر میں یہ کہ میری تنہا اجاڑ زندگی اور ویران دنوں کی ذمہ داری سوائے میرے اپنے کسی پر نہ تھی۔ میری تیز مزاجی اور زبان درازی اور دوسروں سے ضرورت سے زیادہ توقع رکھنے اور نالائق دوستوں کی وجہ سے معاملہ یہاں تک پہنچا تھا ورنہ وہ کرنل کیا برا تھا جو تمہارے پیچھے پھرا کرتا تھا یہ اور بات ہے کہ اس نے تم سے دوستی کے دوران دو چار اور لڑکیوں سے بھی تعلقات استوار کر رکھے تھے مگر تمہیں خود معلوم ہے تم پر تو مکمل بھروسہ آخر وقت تک نہیں کیا جا سکتا۔ تم تو بس خوب سے خوب تر کی تلاش میں سخت وفاداری کو کھوجتی رہی ہو، جو میری

جان اس جہان میں معدوم ہے۔ بھلا مردوں کو غلام بنا کر اور ان کا امتحان لے کر تم کبھی کسی نتیجے پر پہنچ سکی ہو! تم نے دنیا کے مردوں کو اپنے پاؤں میں رگیدا اور قدموں تلے دیکھنا چاہا ہے تم کو اپنے موہوم حسن پر کیا کیا ناز رہے ہیں جس نے دو کوڑی کو نہیں پوچھا۔ سمجھتی ہو تمہاری ان چمکتی ہوئی آنکھوں کے سحر میں کوئی گرفتار ہو گا۔ کبھی نہیں کبھی نہیں۔"

خط پڑھ کر میں نے سوچا ہٹاؤ مارو گولی اگر شیری کو وہ اماں کے پاس بھیجنا چاہتی ہے تو میری بلا سے میں نے اس بے ہودہ تحریر کا بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ جب وہ عقل کی بات سننے کی تاب ہی نہیں رکھتی تو کاہے سنائی جائے اور پھر مہر سے خط وکتابت کی اس لڑائی میں ہار ہمیشہ میری ہوتی تھی۔ وہ اماں کی لاڈلی بہن بھائیوں کی چہیتی تھی۔ رستم نے اسے گھر کا سکون دیا تھا۔ جو اس کی طاقت اور اس کا مان تھا۔ پھر اس کی بیٹی نور تو اس کی دیوانی تھی اور اس لئے وہ میری ویران زندگی کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔

اس کا تار پڑھ کر میں جل بھن گئی۔ اماں خود جاتی پھریں۔ شیری کو بلانے کراچی۔ کم از کم اس واہیات خط کے بعد میرا تو اس سارے واقعے سے کوئی سروکار ہی نہیں رہا تھا۔ اماں جانیں اور مہر جانے۔ پھر ایک سہ پہر جب میں ابھی دفتر سے آئی تھی' اماں اپنے سوجے گھٹنے اور سخت ٹانگیں گھسیٹتی آئیں۔ اے لڑکی سیٹ بک کروا لی ہے۔

کیوں!

لو اور سنو کیوں بھلا اس حالت میں مجھ سے کراچی جایا جائے گا۔ تمہارے والد کے بعد سے یوں بھی مجھے اکیلے کہیں جانا مصیبت لگتا ہے۔ سفر کرنے کا مزہ تو ان کے ساتھ تھا' پورا ڈبا اپنا ہے۔ بس چلے جا رہے ہیں۔ کھاتے پیتے ہنستے ہنساتے جیسے اپنے گھر میں ہوں۔ وہ یادوں میں گم سی ہو گئیں۔ گزرے زمانوں میں ریل کے ہچکولوں سے انہیں جیسے نیند آنے لگی ہو چپ چاپ دور دیکھتی ہوئی بیٹھی رہیں۔ پھر اچانک کہنے لگیں۔ "آخر تجھے جانا ہی پڑے گا۔ خرچ کا فکر نہ کر تو میرے لئے اتنا سا کام بھی نہیں کر سکتی؟"

بنا کوئی اور سوال کئے میں نے اسٹیشن فون کیا۔

فلائٹ لیٹ تھی میں انتظار گاہ میں لوگوں کے جم غفیر کے درمیان ٹہلتی رہی۔

دولت کی تلاش میں پرائے دیسوں کو جانے والوں کی آنکھوں میں آنسو اور خواب' بچے اور سامان' ٹرالیاں' قلی' گرجتے ہوئے' لینڈ کرتے جہاز گڑ گڑاہٹ سے سروں کے اوپر سے گزر کر منزلوں کو روانہ ہوتے ہوئے طیارے' آواز میں رونا ہنسی بچھڑنا وعدے چاہتیں مزید

آرزوئیں ایک گنگا جمنی بھیڑ۔

نئی روشنی کی تیز لڑکیاں عجیب تراش خراش کے لباس پہنے خود آگاہ بال جھلا جھلا کر سر کو گھما کر اپنے گردوپیش دیکھتی ہوئیں، کھنکتے قہقہے، گونجتی ہنسی تیز انگریزی اونچی گفتگو دکھاوا بناوٹ پسندیدہ نظروں کے حصار میں اپنے سحر سے آشنا جنہیں دیکھ کر بے اختیار سیٹی بجانے کو جی چاہے۔

لڑکے مضحکہ خیز چوہوں کی طرح فلموں کے ہیرو، لڑکیوں کے گروہوں کے گرد چکر کاٹتے ہوئے اپنے باپوں کے ساتھ دلچسپی سے عریاں نگاہوں سے اپنے گردوپیش نگاہ دوڑاتے نیچے سروں میں باتوں کے سیلاب میں بہتے ہوئے مگن مصروف، اوپر اوپر گھومتے پھرتے ہوئے گھاگ شکاریوں کے سارے داؤ پیچ سے آشنا۔

میں ٹہلتی ہوئی ذرا پرے جنگلے کے ساتھ دور چلی گئی اور اس سے سر لگا کر میلوں تک پھیلے ہوئے رن وے کی طرف دیکھنے لگی جہاں چھوٹے بڑے جہازوں کی بھیڑ تھی سیڑھیاں گھسیٹی اور لگائی جا رہی تھیں ایک بھگدڑ مچی تھی۔ عملے کے لوگ، موٹریں، سامان اور جانے کیا کیا۔ اس منظر سے تھک کر میں نے اپنے اطراف دیکھا۔

لڑکی کے رخسار، گھڑی گھڑی گلابی ہو جاتے کان سیبوں کی طرح سرخی سے چمکنے لگتے وہ دونوں چپ تھے ایک دوسرے سے بہت قریب بھی نہ تھے۔ لڑکا میری طرح اپنے سامنے دیکھ رہا تھا مگر جب وہ سر کو گھما کر اس کی طرف دیکھتا تو وہ یوں چھوئی موئی سی اپنے ہاتھوں تک انگلیوں کی پوروں تک رنگین ہو جاتی۔ ہائے یہ نگاہ کی رنگینی تھی۔ بھیگی ہوئی چڑی کی طرح کی یہ لڑکی رنگ میں ڈوبی تھی۔ سرشار، بے چین، پر سکون، وارفتہ۔

مجھے وقت گھسیٹ کر پیچھے لے گیا۔ اس جنگلے سے دور ان برآمدوں میں جہاں میں اونچی ایڑی کا جوتا پہنے کھٹ کھٹ کرتی چلتی تھی گویا زیبا اصفہانی کے دل پر چل رہی ہوں۔ زیبا کو اپنے حسن کا غرہ اور اپنے ایرانی ہونے پر ناز تھا۔ وہ ابھی نیا نیا آیا تھا اور لیکچر دیتے وقت جب وہ سمجھاتا اور سیدھا تمہاری آنکھوں میں دیکھتا تو دل سینے میں ڈول جاتا تھا۔ میں جسے اپنی شوخی پر اعتماد تھا سمجھتی رہی کہ وہ کہاں جائے گا چند دنوں میں اس کا غرور نیاز میں اور اس کا سر میرے قدموں میں ہو گا۔ ایسی چھوٹی چھوٹی فتوحات سے تو میرا دامن بھرا ہوا تھا۔ زیبا تو اسے درخور اعتنا ہی نہ سمجھتی تھی۔ چند دنوں بعد مجھے اور اچھا لگنے لگا وہ کلاس میں جب بھی زیبا کی طرف دیکھتا میں محسوس کرتی کہ زیبا کی لمبی پلکیں رخساروں پر جھالر کی طرح جھک جاتیں اور وہ گلابی ہو جاتی۔ عجیب خود فراموشی سے وہ اس کی نگاہ کا جواب دینے کے

بجائے اپنے سامنے دونوں ہاتھ رکھے ناخنوں کی طرف دیکھتی جس میں سرخی تیزی سے جھلکنے لگتی تھی۔ اچھا تو اس کھیل میں کہیں کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ یہ عجیب بے قاعدہ مثلث تھی۔ درمیان میں وہ تھا اور اس کی نگاہوں کی ساری روشنیاں اس کے لئے تھیں اور میں تھی جو اس کے لئے کچھ نہ تھی اور جس کا دل کلاس میں آنے سے پہلے بعد میں سارا دن یونہی دھڑکا کرتا تھا۔ ایک دہکتی ہوئی گرمی میرے سارے وجود کو تڑپاتی رہتی۔ مگر میرا حسن جہاں سوز بیکار میری آج تک کی فتوحات غلط تھیں۔ میں نے اتنی ذلت کبھی نہ اٹھائی تھی۔ میں اس کے پاس سے گزرتی بھی تو وہ میری طرف مڑ کر نہ دیکھتا روز میرے لئے ایک نیا مقابلہ ہوتا تھا۔ میں نے اپنا آپ آزمانا چاہا اور میں جہنم میں سے گزر گئی۔

میں نے اسے پیغام بھجوایا رات کو دروازہ کھلا رکھنا میں نے زیبا کا ایک خاص پیغام لے کر آؤں گی۔ وہ خوشی سے تقریباً دیوانہ ہو گیا تھا جیسے اس نے سرخ گلابوں کا عکس اندھیرے میں دیکھ لیا ہو۔ جیسے تاریک پانیوں پر ڈولتے کنول کے ہونٹوں کو سورج کی کرن چھوئے اور وہ ہولے ہولے کھلنے لگے۔ میرے سینے میں دل کو کوئی چپکے چپکے مسل رہا تھا۔ میں جیسے موت کے بند کواڑوں کو کھولنے جا رہی تھی۔ اپنے مقدر کے نوشتے کو پڑھنے کے لئے میں نے رو رو کر اسے اپنا حال دل سنایا میں نے کہا تھا زیبا ایک خواب ہے۔ تم اسے کبھی حاصل نہ کر سکو گے وہ پرائے دیس چلی جائے گی تو لوٹ کر نہیں آئے گی آ نہ سکے گی اس کا وطن کوئی اور تھا ــــ میں تمہاری زندگی سنوار دوں گی۔ میرے پاس ذرائع تھے خاندان تھا۔ وہ نگاہوں میں تمسخر لئے نہایت خاموشی سے میری باتیں سنتا رہا اس گھڑی مجھے لگتا تھا۔ میری روح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر کرچیاں ہو کر میری آنکھوں سے بہہ رہی ہے میں ٹوٹے ہوئے شیشے چبا رہی ہوں اور ابھی گر کر بے ہوش ہو جاؤں گی۔

اس نے ہنس کر کہا تھا "بی بی چاہت کو تم کیا سمجھتی ہو کہ جب چاہو قیمت چکا کر خرید لو۔ یا یہ چراغ ہے کہ جب تیلی دکھاؤ جلنے لگے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا اب تم جا سکتی ہو۔

جب وراڈن نے مجھے اس کے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا تو میرا رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ چہرہ آنسوؤں سے دھلا ہوا' آنکھیں دھندلائی ہوئی تھیں اور میں تقریباً گری جا رہی تھی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔

اس نے دو باتوں میں سے ایک کو چننے کا اختیار دیا گیا وہ مجھ سے شادی کر لے اور یہیں ٹھہرا رہے یا پھر خود استعفیٰ پیش کرے اور چلا جائے۔

ہائے کیسے اس نے انکار کر دیا تھا اور چپ چاپ چلا گیا تھا۔ اس نے میرے بدلے وہ ذلت قبول کر لی تھی۔ میری قیمت ذلت بھی کم تھی۔ ارزاں ارزاں بے قیمت میں۔ اس کے جانے کے بعد سے مردوں پر سے میرا اعتبار اٹھ گیا اپنے حسن کی چمک بھی دھندلی اور بیکار کا فسانہ لگی۔ میرے چاروں طرف خلا تھا جس میں لڑکیوں کے قہقہے گونجتے اور ان کی نگاہیں تیروں کی طرح میرے آر پار ہوتی جاتیں مگر میں سر اونچا کئے زیبا اصفہانی کے دل پر چلتی رہتی۔ بے پناہ خود اعتمادی کے ساتھ کیونکہ میں آگ کی محراب تلے سے گذر گئی تھی اور میں نے اپنا سارا ماضی سارا مستقبل جلا ڈالا تھا۔ میں نے محبت کی خوشبو کے بدلے انگارے سونگھے تھے اور دل جلن کی بو ساری عمر میرے دماغ میں تیرتی رہی ہے۔

ہائے مجھے کسی نے کبھی ایسے کیوں نہیں چاہا کہ میں رنگ سے بھیگی ہوئی چڑیا لگوں۔

برٹش ایرویز کی فلائٹ کے لینڈ کرنے کا اعلان کیا گیا۔

طیارہ رن وے کے دوسرے سرے پر ایک بڑے پرندے کی طرح اترا۔ پھر وہ اسے اور قریب لائے سیڑھیاں مسافروں کو لانے کے لئے' لاریاں' سامان کے لئے گاڑیاں رونق اور چہل پہل ہو گئی' پھر لوگ اپنے سامان کے ساتھ باہر آنے لگے۔ سب سے آخر میں وہ اسے لائے۔ خوبصورت پنجرے میں چمکتے ہوئے سنہرے بالوں والا روشن اور ذہین آنکھیں' تھوتھنی نہ بہت لمبی اور نہ ہی چھوٹی' صاف ستھرا دھلا دھلایا۔ بے حد اسمارٹ کالر پہنے بڑی بے پرواہی سے اپنے گردوپیش دیکھتا ہوا کبھی سر اپنی اگلی پھیلی ہوئی ٹانگوں پر رکھ لیتا اور آنکھیں بند کر لیتا۔ مجھے وہ بہت عمدہ لگا۔

میں نے پنجرے کے ساتھ ساتھ چلتے پکارا۔ شیری شیری۔

اس نے ہوا میں ناک اٹھائی کوئی مانوس سی بو سونگھی' غور سے مجھے دیکھا' عف عف کیا جیسے پکار کا جواب دے رہا ہو اور پھر منہ اپنی ٹانگ پر رکھ لیا اس کا سر ہل رہا تھا' جیسے وہ ہانپ رہا ہو۔ چل چل کر تھکا ہوا بیٹھا ہو۔ ائر ہوسٹس نے اس کی زنجیر مجھے تھمائی اس کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔

"کاش میں نے تمہاری بات مان لی ہوتی اور شیری کو نہ بھیجا ہوتا۔ اس سے جدا ہوتے وقت ہمارا دل کٹ کٹ گیا ہے۔ رستم اداس ہے۔ نور بہت روئی ہے اور میں تو باقاعدہ غم زدہ ہوں۔ جب وین اسے لینے آئی ہے تو یہ ان سے چھٹ کر گھر میں گھس گیا اور غسل خانے میں چھپ گیا۔ بڑی مشکل سے اسے گھسٹ کر نکالا گیا' یہ ہمیں بہت عزیز ہے۔ تقریباً ایک فرد کی حیثیت سے اس میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ یہ بہت محبت کرنے ولا ہے۔ اور

امید ہے تم اماں کے گھر میں ساری کوششوں کے باوجود اس سے نفرت نہیں کر سکو گی۔ تکلیف فرمائی کے لئے شکریہ۔ ہم لوگ کل جدہ روانہ ہونگے۔ الوداع' ائرپورٹ سے باہر آکر میں نے وہ زنجیر اس کے کالر میں اٹکائی اس نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا میرے ہاتھوں کو سونگھا۔ مہر کی اور میری مہک ایک سی ہونا چاہئے۔ اس نے بنا مزاحمت کے زنجیر کے ساتھ مجھے اپنا مالک تسلیم کر لیا۔ میں نے اسے بسکٹ دیا جو اس نے کھا لیا اور پانی پی کر ہم دونوں اماں کی طرف روانہ ہوئے۔

ٹرین میں وہ سیٹ پر بیٹھا شیشے کے ساتھ منہ لگا کر باہر جھانکتا رہا۔ کھیتوں ندی نالوں اور ان سب پر جھکا نیلا آسمان دھوپ روشنی کی طرح بھری ہوئی اور بہت تیز۔ وہ اس نئی زمین سے واقفیت پیدا کر رہا تھا۔ جس کی عام آدمی کو ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اس کے رنگوں اور خوشبوؤں اور بدلتے مناظر درختوں اور ہواؤں کو زیر کر رہا تھا۔ جہاں ٹمٹماتی بتیوں پر اور دور جلتے چراغوں پر سیاہ ابر آلود رات چھائی ہوئی تھی اور چاند ستاروں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا پھرتا تھا۔

شیری کی تنہائی اور غریب الوطنی نے میرے دل کو آنسوؤں سے بھر دیا۔

اماں بیماری کے بعد سے خواب آور گولیاں کھانے لگی تھیں اور اس لئے دن چڑھے تک سویا کرتیں' میں دفتر جانے کے تقریباً تیار ہو چکی ہوتی تو وہ شیری کہہ کر پکارتیں نہایت تمیزداری سے میز کے قریب نیچے بیٹھ کر وہ اپنے پیالے میں کبھی دودھ اور ڈبل روٹی کبھی گوشت کھاتا نہایت چبا کر آہستہ آہستہ جیسے کوئی آہٹ بھی نہ کرنا چاہتا ہو۔ اماں کہتیں مہر نے اسے کیا عمدہ پالا ہے آدمی کے بچوں سے زیادہ تمیزدار ہے۔

انہیں خواہی نخواہی مہر کی تعریف کرنے کی عادت سی تھی۔

موسم بدلا۔ درجہ حرارت بڑھنے لگا گرمی میں تیزی آتی گئی اور شیری بہت گھبرایا ہوا رہنے لگا۔ ہانپتا ہوا زبان لٹکتی ہوئی تیز سانس لیتا ہوا۔ اماں اسے اپنے ساتھ کمرے میں بند رکھتیں۔ شام کو مجھے کہتیں ذرا اسے ٹہلا دیا کر' بے چارا پردیس میں آن پھنسا ہے۔ مہر نے ظلم ڈھایا ہے۔ بھلا سرد ملکوں سے تو آکر یہاں تو لوگ یہ گرمی برداشت نہیں کر سکتے' یہ تو ذرا سا بے زبان جانور ہے۔

اور یوں شاموں کو جب گرم ریت کی ٹھنڈک ملنے لگتی' ہوا نرم نرم جھونکوں سے قابل برداشت ہو جاتی' شیری کو ٹہلانے لے جانے لگی۔ وہ سایوں پر بھونکتا' ٹڈوں کی چر چر سن کر خاموش کھڑا ہوتا جیسے کسی دور کے سیارے کی نغمگی یا کسی دیس کی موسیقی ہو پھر بھاگتا

اور اس کی چھوٹی سی دم اٹھی ہوئی ہوتی' گھاس پر الٹا لیٹ کر لوٹ لگاتا اور جگنوؤں کو پکڑنے کی کوشش کرتا۔ پھر عف عف کرتا اور میرے قدموں میں جھکتا پھر چک پھیریاں لیتا اور میرے ساتھ چلتا رہتا۔ بلیوں کے پیچھے بھاگنے میں اس کے سنہری بال سیدھے کھڑے ہو جاتے اور وہ تیزی سے ان پر جھپٹتا جب وہ دو بلیاں اکٹھی ہوتیں تو اس سے ذرا نہ ڈرتیں اسے تھپڑ مارتیں بیچارا چوں چوں کرتا اور دم دبا کر میری ٹانگوں سے لگ کر کھڑا ہوتا گویا پناہ گاہ میں ہو۔ کبھی چڑیوں کو دیکھ کر آنکھیں بند کر کے سوتا بن جاتا' وہ اس کی گردن پر آ بیٹھتیں جیسے اس کی پرواہ ہی نہ کرتی ہوں۔ کبھی ایک آدھ کو پنجے میں دبوچ کر بیٹھا رہتا۔ جب وہ دل کی طرح خوف سے دھڑکنے لگتی تو یک بیک اسے اڑا کر تماشا دیکھتا۔ اس کی طبیعت میں ضرر رسانی نہ تھی' اس لئے گھر میں جو مہمان آتا شیری سے اس کا تعارف کروایا جاتا۔ اماں اس کی نسل اور ملک اور اس کے انگریزی زبان سمجھنے سے بہت مرعوب تھیں پھر اور خوبیاں تمیزداری' عمدگی' کھیل اور کھانے کے آداب سب اس کی وقعت میں اضافہ تھے۔ اماں کے صبح دیر میں اٹھنے کی عادت نے مجھے شیری کی طرف زیادہ توجہ دینے پر مجبور کر دیا۔ میں تیار ہو رہی ہوتی تو وہ پاس ہی ڈولتا رہتا۔ میرے جوتے لا کر قریب رکھ دیتا۔ میرے ہاتھ سے کوئی چیز چھٹ جاتی تو لپک کر منہ میں اٹھا کر مجھے پکڑا دیتا اور اب میں اکثر اس کے بالوں میں کنگھی کر دیتی اور ان کے سنہرے ملائم بہاؤ کو محسوس کر کے میرا جی خوش ہوتا۔ اگر کبھی میں مہر کی پسندیدہ خوشبو لگا لیتی بس دیوانہ ہونے لگتا میرے گرد گھومتا میرے دامن پر اگلے دونوں پاؤں رکھ دیتا مجھے سونگھتا یوں ہمکتا جیسے گود میں آنا چاہتا ہو۔ مگر میں نے کسی بھی بات سے متاثر ہونے اور مہر کی کسی شے کو پسند نہ کرنے کی جی ہی جی میں قسم اٹھا رکھی تھی اور شیری کی یہ ساری حرکتیں مجھے چھو نہ سکتیں۔ البتہ جانور کی جو ممکن دیکھ بھال ہو سکتی تھی اس میں میں اماں کا ہاتھ بٹاتی اور یوں میں نے ہولے ہولے اس کا زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا۔

شدید گرمی کے دن تھے لو چل رہی تھی جھلسائے دیتی تھی۔ دفتر سے آکر میں سخت ٹھنڈے پانی سے نہالی اور تقریباً بے ہوش ہو گئی پھر یکدم تیز بخار آگیا۔ اماں گھبرا ہی گئی ہوں گی کہ انہوں نے ادھر ادھر میری دوستوں کو فون کئے۔ کئی دنوں ہذیانی کیفیت رہی اور پھر لوٹ پوٹ کر میں تندرست ہو گئی۔ شیری مجھے دبلا لگا اور بہت ہی بے آسرار اداس بھی۔ اس دن میں نے پاس بلا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کے پیالے میں گوشت

اماں کہنے لگیں اسے دیکھو تم بیمار کیا ہوئیں اس کا تو کھانا پینا ہی چھوٹ گیا۔ دن رات تمہارے پلنگ کی پائنتی کے نیچے بیٹھا رہتا' جیسے اسے تمہاری بیماری کی بہت فکر ہو اپنی اولاد سے بھی بڑھ کر'

ہنس کر میں نے شیری کی طرف دیکھا ایک احساس تشکر' اس بھرے پرے گھر میں کوئی تو ہے جو میرے لئے پریشان ہوا۔

اماں پھر بولیں چلو آج اس کے منہ پر رونق تو آئی مجھے تو سخت فکر لگ گئی تھی کہیں یہ مر ہی جائے۔ عجیب جانور ہے اپنے اصل مالکوں کو بھول کر تم سے اتنا ہل گیا ہے۔

میں نے چڑ چڑا کر اماں سے کہا کیا مطلب ہے آپ کا! مجھ سے اگر ایک جانور بھی مانوس ہو تو آپ کو اعتراض ہوتا ہے۔

ارے نہیں بد نصیب مجھے کسی بات پر اعتراض نہیں ہے اگر تجھ سے کوئی انسان ایسے مانوس ہو تو میرا بوجھ نہ ٹل جائے مگر تیری سخت طبیعت کی وجہ سے کوئی تیرے قریب ہی کیوں آئے گا ہر کسی کو تو کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے' لوگوں کو فرشتہ چاہتی ہے۔ ایسی عمر میں کون ایسا وفا دار ملے گا۔"

میری اور اماں کی خوب تو تو میں میں ہوئی کسی نے کھانا نہ کھایا ہم دونوں رقیبوں کی طرح ایک دوسرے پر چیختی رہیں۔ میرا جی چاہتا تھا خوب دھاڑیں مار مار کر روؤں اور دیواروں سے سر ٹکراؤں یا اس گھر کو آگ لگا دوں جو میرا قید خانہ بن گیا تھا۔ میں اس دن کو یاد کر کے اونچے اونچے بین کر کے روئی جب میں نے پاپا کی بیماری کی وجہ سے اماں کے مایوس کن خط پڑھ کر ایک دم امریکہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ مستقبل کے سنہرے اور روپہلے خوابوں کو اپنے پیچھے کشتیوں کی طرح جلا کر گھر واپس آگئی تھی اور اب اماں مجھی کو الزام دے رہی تھیں۔ دشمن کی طرح میری طبیعت اور میری عادتوں میں سو سو کیڑے نکالتی تھیں۔ امریکہ میں کیا کچھ نہیں تھا' مواقع' آزادی' چاہنے والے لوگ' نباہ کرنے کو تیار' میری رفاقت میں مسرت محسوس کرنے والے اور وہ بھی تو تھا میرا جرمن دوست۔

چھٹی کے دن اپنے کمرے میں جو اوپر کی منزل میں تھا' مجھے مدعو کرتا' وہ گٹار بجاتا' میں مشرقی کھانے پکاتی' پھر مل کر رائن وائن پیتے جرعہ جرعہ اور اپنے اپنے ملک کی کہانیاں لطیفے سناتے کبھی بحث چل نکلتی موسیقی اور آرٹ اور خدا جانے کیا کیا۔ اس کے کمرے کی کھڑکیاں جھیل کی طرف کھلتی تھیں۔ جہاں لوگ کشتی رانی کرتے۔ سکینٹنگ رنگ تھے'

فوارے تھے اور پارک میں لوگ نہایت پرانی دھنیں بجاتے تھے۔ کبھی کبھار ہم چپ چاپ بیٹھے رہتے۔ اتنی خوبصورتی اور تکمیل میں باتیں کرنا بے معنی لگتا۔ بس اس کمرے میں اس لمحے میں ہم دونوں زندہ ہیں یہ بہت تھا۔ اس نے کبھی مجھے نہیں کہا کہ وہ مجھے چاہتا ہے چونکہ میں دوسروں سے مختلف تھی اسے اچھی لگتی تھی وہ بہت سیدھا تھا اور مجھے کہا کرتا تھا: "تم اپنے دیس میں جا کر جب کسی سے شادی کرو گی تو وہ بہت خوش قسمت ہو گا۔ تم میں بہت خوبیاں ہیں مردوں کو سمجھنے کی' انہیں خوش رکھنے کی۔" ہم دونوں ہنستے رہتے وقت گزرتا رہا اور پھر وقت گزر گیا۔

آخری دن جب ہمارا امتحان ہو چکا تھا ہم وطنوں کو لوٹ رہے تھے۔ چھٹیاں گزر چکی تھیں گٹار میں رکے سب گیت گائے جا چکے تھے تو اس نے سیڑھیوں کے نیچے بڑی دوست داری سے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا۔

"کیا مجھ سے شادی کرو گی۔"

ہنس کر میں نے کہا تھا۔ "میں ساری عمر کھانا پکا کر تمہارا جی خوش نہیں کر سکتی۔ تم ہمیشہ مشرقی کھانوں کے دلدادہ نہیں رہو گے۔ گذری ہوئی صحبتوں اور ساتھ گذارے دنوں اور محبتوں کا شکریہ" وہ دیر تک میری آنکھوں میں دیکھتا رہا جہاں ہنسی ابل رہی تھی اور میرے رخسار انتہائی سردی کی وجہ سے گہرے گلابی ہو رہے تھے۔ پھر اس کا رنگ پھیکا پڑا اور زرد ہو گیا اور وہ کچھ کہے بنا اوپر کی طرف بڑھ گیا اور میں بھاری قدموں سے لوٹ آئی۔ اب بہت دیر ہو گئی تھی' اس نے اتنے لمبے عرصے میں کبھی بھی تو اشارے سے' کسی لفظ سے' یہ تک نہیں کہا تھا کہ مجھے چاہتا ہے۔ ہم بہت اچھے دوستوں کی طرح تھے۔ یہ میرا وہم تھا کہ اس کا رنگ اڑ گیا تھا اور کچھ کہے بنا مڑ جانے کا جواز یہ تھا کہ اسے جلدی تھی۔ میں نے ذہن میں بیکار کی تصویر کشی کبھی نہیں کی۔ سر کو جھٹک کر میں شام کی فلائٹ سے واپس وطن آ گئی اور اس ڈر سے کہ مبادا مجھے کوئی لوٹانہ دے میں نے اسے لوٹا ہی دیا۔ ہائے برباد شدہ۔ میں کچھ دن اماں اور میں روٹھے رہے' شیری اماں کے بلانے پر بھی ان کی طرف نہ جاتا۔ میرے سوا اسے کسی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اماں خوب جزبز ہوتیں مجھے کوستیں ایک دو بار انہوں نے شیری کو ہلکے سے تھپڑ بھی مارے' وہ پٹ کر آتا اور میرے پاؤں کے قریب نہایت سعادت مندی سے بیٹھ جاتا۔ زبان نکالے سر ہلاتا ہوا ڈرا ہوا بے بس سا اور مجھے اس کی غریب الوطنی پر پیار آتا پھر میں اسے سمجھانے لگتی۔

دیکھو شیری تمہیں گھبرانا نہیں چاہئے تم تو بہت بہادر بچے ہو یہ برا اور جدائی کا زمانہ

ہے' گزر جائے گا پھر تم اپنے وطن لوٹ جاؤ گے۔ جہاں ٹھنڈ ہو گی تم اپنے نرم اور گرم بستر میں لیٹو گے۔ تمہارے ساتھ نور کھیلا کرے گی۔ وہ تمہیں نہلانے لے جایا کرے گی وہ تم سے بہت پیار کرے گی' اصل محبت جس میں دل کا پھول کھلتا ہے اور کوئی تمہاری پٹائی نہیں کر سکے گا۔ تم نور کے پاس ہر جلنے والی آنکھ سے محفوظ ہو گے۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو ہوتے اور وہ میری ٹانگوں سے اپنا سر ملتا میرے پاؤں کو سونگھتا۔

کیا وہ ابھی تک نور کا اور مہر کا اور رستم کا PET تھا؟ کیا اس کے جانے سے میں اداس نہیں ہو جاؤں گی۔ میں سر کو جھٹکتی مجھے پرائے شیری سے جو محض وقت گزاری کے لئے یہاں بھیجا گیا تھا اس لگاؤ کا کوئی حق نہیں۔ میں اٹھ کر اوپر کے کاموں لگ جاتی وہ میرا پیچھا کرتا۔ میں کہتی شیری میرے پیچھے مت آؤ' وہیں بیٹھو وہ اپنی شفاف نگاہوں سے میری طرف تکتا رہتا۔ عجیب مخمصے میں پھنس گئی تھی میں۔ جب وہ نور کو دیکھے گا تو اس سے بھی یونہی چاہے گا۔ یہ انسیت کا چکر بھی کیا ہے بھلا۔

میں انسانی فرض سمجھ کر اس کی دیکھ بھال کرتی رہی اسے نہلانے لے جاتی رہی اس سے باتیں رہتی تاکہ وہ تنہائی محسوس نہ کرے۔ چند دنوں کے لئے مجھے کسی دوسرے شہر جانا پڑ گیا۔ پھر دوستوں کی ضد کی وجہ سے دو چار دن اور رکی رہی۔ گھر میں میرا تھا ہی کیا؟ اماں جن سے اکثر بات بے بات میرا جھگڑا ہو جاتا تھا۔ وہ مجھ سے خواہی نخواہی الجھتی تھیں اور میں بھی ان کی بات برداشت نہیں کرتی تھی۔ رسہ کشی چلی ہی رہتی۔ میں انہیں ایک بھاری بوجھ لگتی تھی۔ جسے محسوس کر کے ان کا جی دہلتا تھا وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر مجھ میں کوتاہیاں اور خامیاں نکالتیں۔ میرے اکیلے پن کو میری بد نصیبی شمار کرتیں۔ اصل حساب تو آدمی کا اپنے سے ہوتا ہے اور اماں کے اپنے حساب میں کہیں گڑبڑ ضرور تھی۔ مجھے دیکھ کر آہیں بھرتیں۔ بہت اداس اداس رہتیں مجھے کچھ بھلانے ہی نہ دیتیں حالانکہ ان کی دوسری بیٹیاں ان کے بیٹے اور بہوئیں کوئی سال دو سال میں ایک آدھ بار ہی اس گھر میں جھانکتا تھا۔ وہ ان سب کو یاد کر کے روتی رہتیں انہیں پکارتیں خط لکھتیں ان کے لئے دعائیں کرتیں اور میں غصے کے مارے اپنے کمرے میں ابلتی اور جلتی رہتی۔

آخر مجھے اسی قید خانے میں واپس آنا ہوتا تھا۔ میری واحد پناہ گاہ تھا۔

بھونک بھونک کر شیری نے برا حال کر لیا۔ خوشی سے پاگل ہو گیا۔ میرا بیگ اپنے قبضے میں کر لیا۔ پرس کو مارے غصے کے قالین پر گھسیٹتا رہا۔ صوفے پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور مجھے

کونے سے باہر جاتے دیکھ کر کود کر کندھوں پر دونوں اگلے پاؤں سے لٹک گیا۔ عجیب دیوانہ پن سے روتا رہا جیسے خوشی کے بوجھ تلے نہایت پریشان ہو۔ رات جب میں لیٹی ہوں دن بھر کی دھول جھاڑ کر خیالوں کی یورش سے بچنے کے لئے میں نے کروٹ بدلی تو شیری آنکھیں بند کئے میرے ساتھ لیٹا تھا۔ میں ہولے ہولے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ طمانیت سکون اور راحت کے شدید احساس کے ساتھ۔ پھر وہ اور قریب آگیا اور اس نے سر میرے سینے کے ساتھ لگا دیا۔ مجھے وہ لڑکا یاد آیا جو بحری سفر کے دوران جہاز کے عرشے پر مجھے ملا تھا۔

آغاز شباب میں قدم رکھتا ہوا الہڑ سا شرمایا ہوا سا وہ ہوا خوری کے درمیان مجھ سے باتیں کیا کرتا۔ بچوں کی سی بے ضرر باتیں سمندروں اور ہواؤں طوفانوں اور لہروں کی بادلوں اور آندھیوں کی جھکڑوں اور سمندری مخلوق کی' دریاؤں اور پہاڑوں سے اسے عشق تھا۔ رنگ اسے بے حد پسند تھے۔ مجھے خوبصورت کپڑے پہنے دیکھ کر کھل اٹھتا فرمائش کرتا کہ کل میں نیلے رنگ کی ساڑھی پہنوں یہ بے ضرر سی خواہش مجھے بھی خوش کرتی۔ اسے پھول اچھے لگتے تھے۔ مجھے کہتا اس رنگ میں تم ڈیزی لگ رہی ہو۔ عجیب دیوانہ سا بچہ تھا۔ بیک وقت سمجھدار بھی اور سیدھا بھی۔ ایک شام اس نے فرمائش کی کہ میں اس کے ساتھ ناچوں۔ لہروں کی تیز موسیقی پر ہم قدم سے قدم ملائے اوپر بانہوں کے سہارے جھولتے رہے اور جب ہم ایک نسبتاً تاریک گوشے میں گئے تو اس نے اپنا سر میرے سینے سے لگا دیا۔ مجھے اپنے کمزور بازوؤں کے حلقے میں لے لیا اور مجھ سے اسی طرح لگا کھڑا رہا۔ عجیب کیفیت تھی۔ سکون کی لہریں سرشاری کے ساتھ اس کے سر سے نکل کر میری ساری ہستی کو ہلکورے دے رہی تھیں۔ سمندر کی طرح اس کی معصوم چاہت نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ مجھ پر سے گزرنے لگی۔ سیپ میں بند موتی کی طرح وقت کی موجیں ہم پر سے بہتی رہیں۔

اور اب شیری میرے سینے سے لگا تھا۔ آنکھیں بند کئے گھبرا کر مجھ میں سکون ڈھونڈتا ہوا۔ یہ نور کا اور مہر کا اور رستم کا نہیں میرا شیری تھا اور میں نے تہیہ کر لیا کہ اب اسے کبھی نہیں لوٹاؤں گی' ہرگز نہیں۔

تعطیلات اور شدید گرمی کے دنوں میں وہ لوگ اماں سے ملنے آئے۔ شیری کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ اس ایک سال میں اس نے خوب قد نکالا تھا۔ اس کے ڈر کی وجہ سے کسی اجنبی کو گھر میں آنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ لوگوں نے آنا کم کر دیا تھا۔ اماں سخت خفا

تھیں۔ آخر سیزر بھی تو اس گھر میں رہا تھا ان دنوں خان صاحب زندہ تھے اور اسے انہوں نے سر پر نہیں چڑھایا تھا۔ مہر سے کہنے لگیں عجیب جنگلی ہو گیا ہے۔ تم اب کے اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں چپکے سے یہ سب سنتی رہی۔

میری طرف مڑ کر کہا "جب تم گھر نہیں ہوتی ہو اور میں اسے کھانے کو کوئی چیز دوں تو بالکل نہیں کھاتا مجھ پر بھونکتا ہے اور برآمدے میں بیٹھا رہتا ہے جب تم آتی ہو تو یہ دکھائی ہی نہیں دیتا چاہے بلیاں گھر میں بھری رہیں اور آوارہ کتے دوڑیں لگاتے رہیں۔

مگر اصلی مالکوں کے آنے پر بھی شیری نے کوئی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ دم ہلا کر ان کے گرد نہیں گھوما۔ نور سے بھی بس واجبی سا اظہار محبت کیا۔ وہ کھینچ کر باہر لے جاتی تو چلا جاتا اور پھر فوراً آکر میرے پلنگ کے نیچے گھس جاتا۔ وہ چیختی ہوئی مہر سے کہتی "مما شیری بہت بدل گیا ہے۔ بالکل جنگلی ہو گیا ہے۔"

اور مہر کہتی "تسلی رکھو بچے اب ہم اسے ساتھ لے جائیں گے تو اس کی پرانی خوش طبعی عود کر آئے گی۔ یہ تمہارا پیارا شیری بن جائے گا۔ میں چپ رہتی ان کے ارادوں پر جی ہی جی میں ہنستی اور کڑھتی' بھئی کیا' میں نے مہر کو منع کیا تھا کہ وہ اسے یہاں نہ بھجوائے اور میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ یہ ہمدردی کا ان دیکھا رشتہ جو اس کے اور میرے درمیان قائم ہوا تھا' اس میں حالات کا دخل تھا نہ شیری کا اور نہ میری مرضی کا۔ جیسے وقت کے سمندر پر بہتے دو تنکے کسی تند ہوا کے زور سے ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہو جائیں۔ محبتیں جو مجھ سے کی گئی گئیں ان میں میری مرضی تو شامل نہ تھی میرے لئے تو اب ہر شے بیکار تھی اور پھر کسی نے مجھے اتنا کب چاہا تھا کہ میں اس کے دامن سے لگ جاؤں۔ مجھے اس رات کی اپنی زرد روتی ہوئی صورت اکثر یاد آئی۔ وہ کون تھی؟ جس کے آنسوؤں میں اس کا دل بہہ گیا۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر احساس ذلت سے لوٹائے جانے کے درد سے اب بھی بیتاب ہو جاتی تھی۔

اس دن گرمی سخت تھی۔ نور اور رستم شیری کو ٹہلانے لے جانا چاہتے تھے۔ مجھے دخل دینے کا کوئی اختیار تو نہیں تھا مگر میں نے کہا تھا۔

"نور ابھی نہ لے جاؤ دن کو ذرا ٹھہرنے دو شام کو آنے دو ہوا میں خنکی ہو لے پھر جانا۔"

اس نے کندھے اچکائے باپ کی طرف دیکھا اور شیری کو میز کے نیچے سے نکالنے کے لئے اس کے کالر کو کھینچا۔ شیری نے زچ ہو کر اور کوئی راہ فرار نہ پا کر اس کے ہاتھ پر

کاٹ لیا۔ مہرنے چیخ چیخ کر گھر کو سر پر اٹھا لیا۔ سب ایک ساتھ چیخ رہے تھے نور شکست اور تکلیف کے احساس سے زمین پر لیٹ رہی تھی۔ اماں نے جو ان کے جی میں آیا کہا۔ اگلی تمام تلخیاں انہیں یاد آگئیں۔ خوب خوب انہوں نے مجھے کو کوسا اور گھر میں فضا ایک دم سخت کشیدہ ہو گئی۔ رات شیری نے لیٹ کر سختی سے سر میرے سینے کے ساتھ لگا دیا۔ وہ شاید اپنی غلطی پر نادم تھا اور اپنے آپ کو اتنے شورو غل کا قصور وار سمجھتا تھا۔

تم بے وقوف ہو بچے' وہ آخر چلے جاتے' نور نے بہر حال تم سے زیادتی کی ہے۔ تم بہت جلد باز ہو وہ دم سادھے پڑا رہا۔ میرے ہاتھ کے نیچے بالکل ساکن اور سویا ہوا اور نہایت خوش۔

سرگوشیوں میں باتیں ہوتیں' مجھ سے ہر بات چھپائی جاتی' اماں کی اور میری بول چال بند تھی۔ ہم دونوں میں اور شیری' گویا ذات برادری باہر کر دیئے گئے تھے۔ کھانا دو مرحلوں میں کھایا جاتا یا پھر میں اپنے کمرے میں کھاتی اور شیری کو بھی وہیں کھلاتی۔ جب میں کام پر چلی جاتی تب بھی کوئی اس کو نہیں بلاتا تھا آخر وہ کب تک میری پناہ میں رہے گا آخر اسے ان کے ساتھ ہی تو جانا تھا۔ جیسے جیسے ان کی روانگی کے دن قریب آرہے تھے میرا ارادہ بھی پختہ ہو گیا تھا۔

میں نے اپنے شیری کے لئے ریل میں سیٹ بک کروائی سامان اپنی ایک دوست کی معرفت اسٹیشن بھجوایا۔ اس دن شام کو معمول کے مطابق میں اسے ٹہلانے کے لئے باہر لے گئی اور ہم مخالف سمت میں اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ جب انہیں پتہ چلا تو کیا ہوا یہ ایک الگ داستان ہے۔ ان کی ہاؤ ہو کا نتیجہ یہ ہوا کہ مہرنے عدالت میں حدود آرڈیننس کے تحت میرے خلاف ایک مقدمہ دائر کر دیا جو اس کے چلے جانے اور عدم پیروی کی وجہ سے بالآخر خارج ہو گیا۔

شیری اور میں مری سے لوٹ آئے۔

اماں کچھ دنوں سخت خفا رہیں پھر جب برف پگھلی اور شدید تنہائی نے انہیں ہراساں کیا تو کہنے لگیں۔

"اچھا ہو شیری نہیں گیا تھوڑی رونق رہتی ہے۔"

میں اماں سے کیا کہتی کہ اماں اس ڈھنڈار بیکار زندگی میں اس خالی گھر میں میرے آنے پر کوئی تو ہوتا ہے جو محبت سے میری راہ دیکھتا ہے۔ اچھلتا کودتا اظہار شوق کرتا اور میرے پیچھے پھرتا ہے۔ میرے قدموں پر لوٹتا ہے۔ میرے سینے پر سر رکھ کر مجھے سکون دیتا ہے۔

ہمک کر میری بانہوں میں آنے کی کوشش کرتا ہے۔ مجھ پر اتنا حق سمجھتا ہے۔ بھلا ٹوٹ کر ایسا کسی نے مجھے کبھی چاہا ہے۔ ملنے والے کہتے ہیں جیسا تم شیری کو چاہتی ہو ایسا تو بہت کم مائیں اپنے بچوں کو چاہتی ہیں۔ "میں ان کی آواز میں چھپے طنز کو سمجھتی ہوں' مگر یہی محبت تو اب میری زندگی ہے وہ میرا محبوب میرا ہمدم میرا ساتھی ہے۔ جب سب طرف سناٹا ہوتا ہے تو اس سے اپنے دل کی باتیں کہتی ہوں اس کو کھوئی ہوئی چاہتوں کے تذکرے سنائی ہوں۔ محبتیں جو مجھ تک پہنچ نہ پائیں اور چھن گئیں۔ لگاؤ جو میرا مقدر نہ بن سکے۔ وہ سارے گزرے نوحے جو جانے والوں کے لئے میرے دل میں بندھے' میں نے شیری کو سنائے اس کے سینے میں میرے راز ہیں' وہ مکمل ساتھی ہے۔ چپ چاپ مجھے کام میں منہمک دیکھ کر تعرض نہ کرنے والا' میری کیفیات میری خوشی غم سب اس پر عیاں' وہ نبض کی طرح میرے دل کے ساتھ دھڑکتا ہوا۔ انسانوں کی محبتوں میں یہ گرمجوشی اور خود سپردگی کہاں ہوتی ہے۔ شیری تو میرے لئے جان سے گزر سکتا ہے۔"

مہر کے ساتھ مقدمہ کے سلسلے میں میں میری ایک مجسٹریٹ سے ملاقات ہوئی۔ میرے کاموں میں اس نے بہت دلچسپی لی پھر آہستہ آہستہ ہماری ملاقاتیں بڑھیں میں اپنے دفتر سے آتے ہوئے یا ادھر سے گزرتے ہوئے اس کے پاس چلی جاتی کافی کا پیالہ لے کر ادھر ادھر کی گپ ہوئی شیری کی باتیں اس کی ذہانت اس کی چالاکیاں گھر میں اس کی رونق زندگی میں اس کا مقام' وہ سنتا اور دلچسپی سے یہ سب سنتا مگر اس نے کبھی یہ نہیں کہا وہ شیری کو دیکھنا چاہتا ہے۔ عجیب آدمی تھا۔ اب میں نے الجھنے لگی تھی۔ بھلا وہ کیوں نہیں دیکھنا چاہتا۔ ہماری دوستی بڑھتی بھی رہی اور اس میں دراڑ بھی پڑتی گئی۔ میرا جی چاہتا وہ مجھ سے شیری کی باتیں پوچھے پھر میں نے محسوس کیا۔ جب میں شیری کی بات کرتی ہوں۔ وہ توجہ سے نہیں سنتا کوئی ادھر ادھر کی کہانی سنانے لگتا ہے۔ اپنی زندگی کے خلاؤں کا ذکر اپنے دکھوں اور ارمانوں کا تذکرہ اپنی دائم المریض بیوی کی بیماری کے عذاب کے قصے اپنی تنہائی کے کرب کا فسانہ اپنی خالی خولی بیکار کا المیہ جس میں پارسائی اور بے رنگی کے سوا کچھ نہ تھا۔ خدا کے ساتھ اپنے تعلقات کا کہتا جو کبھی استوار نہ ہو سکے تھے۔ خوابوں اور پرچھائیوں کی سی داستان۔ پتہ نہیں وہ مجھے کیا کہنا چاہتا تھا کیا سمجھانا چاہتا تھا؟ میں جو خوش وقتی گپ اور ذہنی آسودگی کے لئے اس کے پاس چلی جاتی تھی اس کی کیا مدد کر سکتی تھی بھلا۔ کیا ہلکی پھلکی دلچسپی کا دھارا کسی اور رخ پلٹنا چاہتا تھا۔ ایک دن اس نے پوچھا۔

"تم شیری سے ایک جانور سے اتنی شدید بے پناہ محبت کیوں کرنے لگی ہو جبکہ کئی اور

انسان اس سے زیادہ توجہ کے مستحق اور متمنی ہیں۔" اس کی ہنسی بڑی معنی خیز تھی۔ پہلی بار مجھے شدید ذہنی دھچکا لگا۔

"اور پتہ ہے لوگ کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ تمہارے متعلق" اس نے آنکھیں جھکا کر کہا۔

"لوگ کس کس کی کہانیاں نہیں کہتے جناب" میں کھڑی ہو گئی میں کانپتی رہی۔ غصے اور رنج سے۔ دنوں میں ادھر سے نہیں گزری پھر سنا اس کا تبادلہ ہو گیا۔ اس سال گرمی شدید پڑی، لگتا تھا قیامت اس سے زیادہ کیا ہو گی۔ ریت کے جھکڑ چلتے، آسمان زرد گرد کے بادلوں کے پیچھے چھپ گیا تھا جو نہ برستی تھی اور نہ ہٹتی تھی بس عجیب ریزہ ریزہ ہو کر وجود کو ہکاتی تھی اور گھٹن اتنی تھی کہ سانس رکتا ہوا لگتا تھا۔ کمروں میں بھی پناہ نہ ملتی، میں شیری کو دیکھتی کہ اس کی آنکھیں زرد ہوئی جاتی ہیں وہ بہت کم جاگتا اور نہلائے جانے کے باوجود گرمی کی لپٹیں اس کی سانس سے نکلتی تھیں۔ برف کا بلاک منگوا کر میں کمرے میں رکھتی آگ برساتا ہوا پنکھا اور کولر کچھ نہ کر سکتے۔ شیری دن بدن گھلتا جا رہا تھا میں اسے تسلی دیتی، جی سے لگاتی۔

"شیری ہمت پکڑو یہ ذرا سے سخت دن ہیں، نکل جائیں گے۔ موسم بدلے گا گرد چھٹ جائے گی، مزیدار سردی آئے گی اب کے دیکھنا خوب ہڈیوں کا گودا جمانے والی ٹھنڈ پڑے گی تمہارے وطن کی طرح میرے لاڈلے میں تمہارے لئے کڑھنے کے سوا اور کیا کر سکتی ہوں اگر اماں کا بڑھاپا نہ ہوتا گھر میں کوئی اور ہوتا میرے وسائل ہوتے تو میں تمہیں کسی ٹھنڈے پر سکون خطے میں لے جاتی میرے چاند حوصلہ رکھو" میں اس کے سنہرے بالوں پر ہاتھ پھیرتی جو اس کی کھال کو چھوتے تو بخار کا احساس ہوتا۔ وہ ذرا سی عف عف کرتا۔ میں بے تاب ہوتی میں کیا کر سکتی تھی۔ اپنے پیارے کے لئے اس اجنبی کے لئے اس پردیسی کے لئے۔

مہر کا تار آیا رستم کی طبیعت سخت خراب تھی وہ ہسپتال میں تھا۔ نور اکیلی تھی اور پردیس میں تھی اماں کو بلوایا تھا۔

اماں نے کہا تم چلی جاؤ نا آخر بہن ہو مجھ سے تو ہلا بھی نہیں جاتا میں اس کے کس کام کی ہوں گی۔ پچھلی باتیں بھول جاؤ۔ اسے معاف کر دو۔ شیری کو اس حال میں چھوڑتے ہوئے میرا دل اتھل پتھل ہو رہا تھا مگر مجبوری تھی ہائے میں کیا کروں۔

اماں نے کہا تم فکر نہ کرو میں یہاں گھر پر اس کی خوب دیکھ بھال کر لوں گی۔ روانہ

ہونے سے میں نے برف والے کو تاکید کی کہ وہ روز بلاک خود کمرے میں رکھ جایا کرے۔ الماری میں تقریباً سامنے میں نے دوائیاں۔ بسکٹ ضروری سامان رکھ دیا تاکہ ضرورت پڑنے پر ڈھونڈنے میں تکلیف نہ ہو۔ جاتے ہوئے میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ میں دروازے میں سے پلٹ آئی۔ شیری آنکھیں موندے لیٹا تھا اور گرمی کی شدت سے تپ رہا تھا۔ سینے سے لگا کر میں نے اس کے کان میں کہا شیری میں جلد لوٹ آؤں گی گھبرانا نہیں۔بس یوں سمجھو میں گئی اور آئی۔

جدہ میں خلاف توقع مجھے زیادہ دن ٹھہرنا پڑا رستم پر دل کا جان لیوا دورہ پڑا تھا اور وہ بہت آہستہ صحت یاب ہو رہا تھا۔

اماں کا فون آتا' مہر نہایت دھیمے سروں میں بات کرتی بڑی غم ناک ہوتی' مجھے بھی اس پر ترس آتا۔ کبھی کبھار کہتی اماں تمہارا پوچھ رہی تھیں' خیریت سے تھیں' رستم کے لئے نہایت فکر مند تھیں مگر اپنی صحت کی وجہ سے نہیں آ سکتیں۔ میں اس سے یہ نہ کہہ پاتی کہ اب کے جب اماں کا فون آئے تو شیری کا بھی پوچھ لینا۔

جس دن ڈاکٹروں نے اطمینان کا سانس لیا' اور رستم کی حالت کو خطرے سے باہر قرار دیا' مہر آنکھوں میں خوشی کے آنسو اور اس کے چہرے پر رونق آئی میں نے اس کے منع کرنے کے باوجود اپنی سیٹ بک کروا لی۔

آخر جلدی کیا ہے تمہیں' اماں کی خیریت تو معلوم ہو ہی جاتی ہے یہاں سے تار دے کر چھٹی بڑھوائی جا سکتی ہے۔ بس اب میں جانا چاہتی ہوں' شیری بیمار تھا۔

اپنی ساری کمینگی کو آواز میں بھر کر اس نے کہا "اوہ" اور پھر پلٹ کر تیزی سے کہنے لگی "اگر وہ نہ رہا تو تم بیوہ تو نہیں ہو جاؤ گی۔" میں اس کے گھر میں اس کے شوہر کی تیمارداری کے لئے مصیبت میں شریک ہونے کی خاطر اتنی دور سے آئی بیٹھی تھی اور وہ مجھے شیری کے طعنے دے رہی تھی۔ بنا اس سے مزید بات کئے میں سامان لے کر ائرپورٹ آ گئی۔

گھر میں سب طرف عجیب سناٹا تھا حالانکہ دن کے تقریباً دس بجے تھے اماں ابھی تک سوئی ہوئی تھیں۔ کمروں میں ادھر ادھر دیکھتی شیری کو پکارتی میں اندر آئی۔ شیری اپنے وجود کا سایہ لگ رہا تھا۔ سہما ہوا گھلا ہوا۔ اس کے پاس جھک کر میں نے پکارا' شیری دیکھو میں آگئی ہوں۔

نقاہت کی وجہ سے اس کی آنکھیں نہیں کھلیں۔ ہلکے سے عف کر کے رہ گیا۔ میں نے

اس کے سر کو سہلایا' شیری۔ شیری! میں نے زور سے پکارا۔ اماں کہنے لگیں تمہیں میں نے مہر سے کہلوایا تو تھا کہ شیری سخت بیمار ہے وہ بھی دکھی ہو رہی تھی۔

میں بھاگی ڈاکٹروں کو فون کئے دعا کرتی رہی خدا سے میں نے کہا۔

"دیکھ اگر تو نے مجھ سے شیری لے لیا تو میں تیری ہستی میں یقین کرنا چھوڑ دوں گی۔ اگر تجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تو مجھے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تیرا خیال ہے تیری اس دنیا میں محبت کی روشنی کے بنا پر جیا جا سکتا ہے؟ اتنے گہرے اندھیرے تو نے بنائے ہیں' کیا اجالے کی ایک کرن دینے کا بخل بھی نہیں کرنا چاہتا۔ تو سنتا ہے کہ نہیں یہ چاہنے والی آنکھیں ہیں انہیں بے نور نہ کر الفت بھرا دل ہے اسے دھڑکنے کے لئے چھوڑ دے۔"

مگر وہ آسانوں پر کہیں دور بیٹھا جانے کس تانے میں کونسا بانا پرونے میں مگن تھا کہ اس نے میری بات سنی ہی نہیں' پتہ نہیں وہ کیوں مجھ سے خفا تھا کہ اس نے میری تڑپ کا کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ ڈاکٹروں کی ساری بھاگ دوڑ بیکار گئی۔

مہر میں بیوہ ہو گئی۔

اماں نے کہا "وہ تو تمہارے جاتے ہی سخت بیمار ہوگیا تھا میں بے آس تھی مگر پتہ نہیں کیسے اتنے دن تمہارے انتظار میں جی لیا۔ اپنے طور پر میں ڈاکٹروں سے علاج کروایا تھا۔ تم سمجھتی نہیں ہو مجھے بھی اس کی بہت پرواہ تھی بڑی رونق رہتی تھی اس کی وجہ سے۔"

میرا دل ایک ویرانہ تھا جس تیز غم ناک آندھیوں کے شور کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ اذیت اور بے چارگی نے میرے دل کو مسل کر رکھ دیا۔ یہ ایک جانکاہ عذاب تھا۔ جس کا اس سے پہلے میں نے کبھی تجربہ نہیں کیا تھا' تب بھی نہیں جب میں نے اس کا دل زیبا کی طرف سے اپنی طرف لگانا چاہا تھا۔ بے خواب راتیں تاریک دن صرف ایک ہی خیال تھا ہائے شیری نے میرے لئے کتنی اذیت برداشت کی' آخر کیوں کی؟

اور اب وہ سب مجھے یاد آتے ہیں شیری کے پیچھے وہ سب۔

وہ جو کبھی میری راہوں سے گزرے میں جو کبھی ان کی راہوں میں آئی۔

کیا آدمی اتنی بے ریا بے لوث بے پایاں محبت کرنے اہل ہے؟

٭٭٭

خالدہ حسین

بایاں ہاتھ

جناب والا : میں سچ کہوں گی- بالکل سچ- پورا سچ- اور کچھ نہیں مگر سچ، گو کہ یہ سب کچھ کہتے ہوئے بھی میں نہیں جانتی کہ سچ کیا ہے- یہ تو ایک ایسی شبیہہ ہے جو کوئی ایک دیکھے تو سیاہ بالکل سیاہ نظر آتی ہے- کوئی دوسرا دیکھے تو روشن چمکتی دھوپ ایسی روشن، تو کیا یہ کوئی آنکھ کا نقص ہے- دونوں میں کون آشوب چشم کا شکار ہے- بہرحال یہ تو بالکل غیر متعلق سی بات بیچ میں آن پڑی تھی-

میں تو بات اس لمحے سے شروع کرنا چاہوں گی- جب اپنے حواس پر میرا ایمان اٹھ گیا- وہ دن بڑا تباہی کا دن تھا- صد حیف اس دن پر کہ جب میں نے ایک دم یہ جانا کہ دنیا سے رنگوں، خوشبوؤں اور آوازوں کا تنوع مر گیا- ہر چیز کا ذائقہ ایک سا ثقیل تہہ میں زبان پر جمنے لگا اور تمام لمس ایک سے مس ہو گئے- بس ایک مٹیالا، زرد نیند میں ڈوبا دن ہر چیز پر محیط ہو گیا- میں نے جو چیز منہ میں ڈالی ایک مٹیالا ذائقہ چھوڑ گئی- چیزوں کے رنگ ان مٹھی بھر ساعتوں میں ڈوب گئے اور اپنے پیاروں کے لمس دوردراز کے لاتعلق سانچے بن گئے-

کچھ دن تو میرے کنبے کے لوگ یہ سب کچھ دیکھتے اور برداشت کرتے رہے، پھر سب کو میرے چہرے کی لاتعلقی اور آنکھوں کے خالی پن سے کوفت ہونے لگی- میرے زوج نے تنگ آ کر کہا- مجھے لگتا ہے میں کسی پتھر کے ساتھ قید کاٹ رہا ہوں- مجھے اس کی یہ بات بہت پسند آئی- کیونکہ ایک عرصہ سے مجھے اپنا آپ سڑک کے کنارے کھڑے، گرد میں اٹے حرف مٹے سنگ میل کی طرح نظر آ رہا تھا- شاں شاں قریب سے تیز رفتار گاڑیاں گرد اڑاتی چلی جا رہی تھیں اور اب ہر طرف صرف شاں شاں کی مسلسل دبی ہوئی کبھی ابھرتی ہوئی گونج تھی- شاید یہ سب باتیں آپ کو نہایت غیر ضروری اور لاتعلق نظر آتی ہیں- مگر پھر آخر آنکھ کو کچھ تو دیکھنا- کان کو کچھ تو سننا ہے- اگر یہ نہیں تو اس کے علاوہ بھی اور جو کچھ بھی ہے یہی ہے- شاید اب میں آپ کو الجھا رہی ہوں- میں اس تمہید کو ختم کر کے

اب اصل واقعہ کی طرف آتی ہوں۔

جناب والا جیسا کہ میں نے عرض کیا وہ دن بڑا خرابی کا دن تھا۔ جب اپنے حواس پر سے میرا ایمان اٹھ گیا۔ کچھ روز تو میں اپنے آپ کو ملامت کرتی رہی۔ میں نے اپنے آپ کو خوب خوب کوسا کہ اے بنت حوا لعنت ہے تجھ پر جو تونے اپنے آپ کو یوں نفس کے حوالے کر دیا۔ ہاں یہ نفس کے حوالے کرنا نہیں تو اور کیا ہے کہ انسان ہوتے ہوئے کوئی اپنے حواس کی نعمتوں سے فیض یاب نہ ہو۔ جی لبھانے والے رنگ دیکھے نہ میٹھی سریلی صدائیں اس کے کان میں پڑیں۔ انواع و اقسام کے ذائقوں کے لئے اس کی زبان مر جائے۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ پر سو بار لعنت کی اور میں بہت روئی گڑگڑائی اپنے خالق کے حضور کہ بس اب ایک مہیب اندیشہ منہ کھولے میرے سامنے چلا آتا تھا۔ وہ اندیشہ ایک عجب اٹل ساعت کا تھا۔ نہ ٹلنے والی ساعت۔

میں نے بہت چاہا کہ میں ایک بار پھر وہی وجود بن جاؤں جو دراصل میں تھی۔ وہ جو دیکھنے والوں کو بہت بھاتا تھا۔ جو لطیف خوشبوؤں اور رنگوں کی شبیہہ تھی۔ اور روح پرور موسیقی کی لہر تھی۔ لیکن ایسا نہ ہوا میں نے سب سے۔ ان سب سے جو میری ذات کے ساتھ کوئی تعلق رکھتے تھے کہا دیکھو سائیں سائیں کرتا ایک مہیب آسیب منہ کھولے میرے سامنے چلا آتا ہے۔ اگر اس آسیب نے مجھے نگل لیا تو تم کیا کرو گے؟اور پھر مجھے اپنی اس بات پر خود ہی ہنسی بھی آگئی۔ دراصل کہنا تو مجھے یہ تھا کہ اگر اس آسیب نے مجھے نگل لیا میں کیا کروں گی؟ آخر دوسروں کے لئے اس آنے والی واردات کی کیا اہمیت ہو سکتی تھی اور پھر کونسا تعلق ایسا ہے کہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ جب مجھے یہ احساس ہوا تو میں اپنے خالق کی حضور بہت روئی۔ گڑگڑائی کہ مجھے اس آنکھ کے عذاب سے پناہ میں رکھ کہ یہ وہ کچھ دیکھتی ہے جو اسے نہیں دیکھنا چاہیے اور مجھے خود میری اپنی ذات سے پناہ میں رکھ کہ یہ بڑی سفاک ہے۔ جب اپنی جان پر ظلم کرنے پر آتی ہے تو ٹلتی نہیں۔ مگر جناب والا اب میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ اس وقت بھی دراصل یہ رونا' گڑگڑانا' کچھ عجب تھا کہ اندر سے جیسے گہرے خالی کنوئیں میں سے کوئی برابر کہتا تھا کہ ایسا نہ ہو تو اچھا۔ اسی طرح ٹھیک ہے۔ ایک تاریک تجسس پنجے کھولے مجھے پکڑنے کو پل پل بڑھ رہا تھا۔

جناب والا آپ ان باتوں سے یہ اندازہ لگایئے کہ میں ان دنوں نارمل زندگی بسر نہیں کر رہی تھی۔ جی نہیں ابھی مجھ میں اتنی روحانی منافقت تھی کہ میں تمام دنیاوی معمولات کو پورا کر سکوں۔ اور دیکھنے والوں کو محض اتنا احساس ہوتا تھا کہ اس عورت کا چہرہ ایک دم

سپاٹ اور خالی ہے۔ اور اس کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوتی ہے۔

بس یہ انہی دنوں کا ذکر ہے جب میں اپنے شہر کے اس بڑے اسٹور کے قریب سے گزری۔ ان دنوں اکیلے اکیلے سڑکوں پر پھرنا کچھ میرا معمول سا ہو گیا تھا۔ اس اسٹور کے باہر کھڑی ہو گئی اور اس کے بڑے بڑے شوکیسوں میں جھانکنے لگی۔ کچھ لمحے میں نے تمام چیزیں ایک لاتعلقی سے دیکھیں جو ایک عرصہ سے مجھ پر حاوی تھی۔ مگر پھر وہ عجیب واقعہ ہوا۔

جناب والا! مجھے یوں لگا جیسے کسی نے بجلی کا تیز جھٹکا لگایا ہو۔ اس سے بجلی کی تھرتھراہٹ سر سے لے کر میرے پاؤں کے ناخنوں تک پھیل گئی۔ پھر یکدم ایک عجیب طرح کی میٹھی آسودگی میرے تمام جسم میں بھر گئی اور مجھے اپنے گرد رنگ ہی رنگ خوشبوئیں ہی خوشبوئیں' سر ہی سر پھیلے نظر آئے۔ اتنی خوبصورت دنیا تو میں نے کبھی بھولے بسرے بچپن میں دیکھی ہو گی۔ جب کبھی ماں کا ہاتھ تھامے کھلونوں بھرے بازار سے گزری تھی اب مجھے حیرت تھی کہ دنیا ایک دم اتنی خوبصورت اتنی رنگین کیوں کر ہو گئی۔ شوکیس میں سجی خوبصورت بوتلوں اور ان پر لگے رنگا رنگ لیبل میر آنکھوں سے چپک گئے۔ وہاں ان شیشوں کے اندر رنگ و بو' حسن و موسیقی کی ایک دنیا آباد تھی۔ وہ دنیا جو میرے لئے مر چکی تھی۔ یہ دنیا خریدی تو جا سکتی تھی مگر اس کے بھاؤ تاؤ میں اس کے سراب ہو جانے کا خطرہ تھا۔ میں مسحور نظروں سے وہ سب کچھ دیکھتی رہی۔ مجھے وہ سات رنگا شیشہ یاد آ گیا۔ جو کبھی بچپن میں اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ مل کر روشنی کے سامنے رکھ کر دیکھتی تھی۔ کس قدر خوبصورت چمکتے' شفاف اور شگفتہ رنگ نکلے تھے اس میں سے۔ جی چاہتا تھا کہ ان کو انگلیوں سے چھو کر دیکھوں مٹھیوں میں قید کر لوں۔ وہ رنگ اکیلے اس سات رنگے شیشے میں سے نہ نکلتے تھے۔ ان کے ساتھ ہی وہ ایک خوشبوؤں سروں اور محبت بھرے لمحوں کی لہریں تھیں کہ گرد اگرد بننے لگی تھیں۔ اور جاتے جاتے ایک نیم بے ہوش اداسی دل کو دبائے جاتی تھیں۔ تو آج وہ سب رنگ و بو حسن و موسیقی کی دنیا اس شوکیس میں' اس سات رنگ میں بند تھی۔ میں نے شوکس کے شیشے کے ساتھ ناک چپکا دی تھی۔ اتنی بہت سی خوبصورت چیزیں گویا ایک جنت گم گشتہ تھی۔ اور اس جنت گم گشتہ کو پا لینے کا ایک جنون' میٹھی میٹھی لہریں بن کر میرے دل و دماغ کو جکڑ تا گیا میں ایک دھڑکتے لطیف جال میں لپٹ گئی کہ جس سے نکلنا اس خوبصورت دنیا کی موت تھی۔ دنیا جو برسوں بعد مجھے نظر آئی تھی۔ وہ ایک عجیب شوق انگیز لہر تھی کہ مجھے مست بناتی چلی گئی۔

بیگم صاحب اندر تشریف لے آیئے۔" اسٹور کے دروازے پر سے سیلزمین نے مجھے مخاطب کیا تھا۔ میں چونکی، کوئی انجانا فیصلہ ابہام کی حدوں کو کاٹنے والی سوچ، میرے ذہن میں داخل ہوئی۔ میں مسکراتی ہوئی اندر چلی گئی۔

جناب والا! میرا بیگ اس وقت بھی نقدی سے بوجھل تھا۔ مگر وہ آسیب منہ کھولے چلا آ رہا تھا۔ وہ اٹل ساعت آ چکی تھی۔ اور میں اس کے گھیر میں تھی۔ میں نے بہت سی چیزیں نکلوا کے دیکھیں۔ پھر میں خود ہی اپنی اس فنکارانہ چابک دستی پر حیران رہ گئی۔ میرے بائیں ہاتھ نے خوبصورت رنگ برنگی چیزیں خاموشی سے یوں پکڑیں کہ دائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو اور بیگ میں انڈیل لیں۔ سروں اور خوشبوؤں کی ایک دنیا میرے بیگ میں تھی۔ وہ ساتوں رنگ میری مٹھی میں اسیر تھے۔ بظاہر میں نے ایک معمولی سی بوتل پسند کر کے اس کی قیمت ادا کی اور اڑتے اڑتے قدموں کے ساتھ دکان سے نکل آئی۔ میں زمین پر نہیں گویا بادلوں پر چل رہی تھی۔ ایک رنگین امنگ میری آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ ایک خاص وحشی جذبہ میرے اندر رقصاں تھا۔

جناب ولا میرا جی چاہتا تھا۔ سڑکوں پر قہقہے لگاتی پھروں آج پھر دنیا اتنے بہت سے رنگوں اور خوشبوؤں سمیت زندہ ہو گئی تھی۔ گھر کی دہلیز پار کر کے میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ وہ بیگ کھولا اور رنگ و نور کی اس دنیا کو میز پر انڈیل دیا۔ ان سب چیزوں کو مختلف زاویوں سے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ان کے رنگوں کو آنکھوں میں بسایا۔ اور تب مدتوں رکے آنسو بہہ نکلے۔

میرے کنبے نے مجھے کبھی روتے کبھی ہنستے دیکھا اور میز پر لگے اس رنگ و نور کے انبار کو بھی۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" اس نے خوف اور نفرت بھری آواز میں کہا۔ تب میں چونکی اور میں نے سوچا اور خود سے پوچھا ہاں واقعی یہ تم نے کیا کیا؟ اور اس سوچ کے ساتھ ہی وہ رنگ و نور کی دنیا پھر مر گئی۔ وہ سب کچھ مردہ لکڑی میں سے نکلا برادہ بن گیا۔ اور تمام دنیا پر وہ میٹا لادن محیط ہو گیا۔ چنانچہ جناب والا میں نے وہ سب کچھ اٹھایا اور متعلقہ افسروں کو اس واردات کی اطلاع کی۔

مجھے اپنے بائیں ہاتھ کی جدائی کا دکھ نہیں۔ جب وہ ہاتھ مجھ سے الگ ہوا تو گویا سیاہ آسیب بھی میرا وجود چھوڑ گیا۔ تب میں نے شکر ادا کیا کہ مجھے اس بائیں ہاتھ سے نجات ملی۔ اور اب صرف وہ نور بھرا پاکیزہ دایاں ہاتھ میرا ساتھی تھا اور میں خوش تھی اور کہتی

تھی۔ اے بنت حوا تو خوش قسمت ہے کہ آج تیرے وجود کا سیاہ سایہ مٹ گیا۔ اب تیرا یہ مبارک روشن دایاں ہاتھ تیری اچھی اچھی خبریں سب کو دے گا۔

مگر جناب والا اب میں اصل واقعہ کی طرف آتی ہوں۔ یہ کل رات ہی کا ذکر ہے۔ میں اس مٹیالے دن اور مٹیالی رات کی عادی ہو چکی تھی۔ رنگ ونور، حسن و موسیقی کی اس دنیا کی تلاش میرے ذہن سے مٹ چکی تھی۔ وہ میرا بایاں ہاتھ سب منحوس یادیں اپنے ساتھ لے جا چکا تھا۔ اور میں سکھ کی نیند سوتی تھی۔ سکھ کی کی گہری نیند مگر کل رات سوئی تو اس گہری نیند سے میں ایک سرسراہٹ سے جاگ اٹھی جیسے میرے بستر میں کوئی جان دار چل رہا ہو۔ میں نے بیڈ لیمپ روشن کیا۔ اور یہ دیکھ کر میری پیشانی عرق ندامت میں ڈوب گئی کہ وہ سرسراتی، کلبلاتی چیز وہ میرا بایاں ہاتھ دوبارہ میرے بازو کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی اپنے آپ کو اس بائیں ہاتھ سے محفوظ رکھنے کی۔ مگر دیکھئے اب میں آپ کے سامنے ہوں۔ یہ پھر اسی طرح میری کلائی سے جڑا ہے۔ میرے وجود کا حصہ ہے جسے کبھی کاٹا نہ گیا ہو۔ جناب والا کیا آپ بھی یقین نہ کریں گے کہ یہ کٹا تھا مگر پھر زندہ ہو کر آن جڑا۔ صد حیف ہے میرے وجود پر کہ میں اپنے بائیں ہاتھ سے نجات نہ پا سکی۔

***

اختر جمال

زنانِ مصر اور زلیخا

"یوسف اور زلیخا کی کہانی مذہبی کتابوں میں رمز اور کنائے میں بیان ہوئی ہے لیکن بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے اس قصہ کو کہانی کی صورت میں نظم و نثر میں لکھا ہے مگر وہ سب چیزیں مردِ کے نقطۂ نظر کی ترجمان ہیں جس میں ہر چیز کا الزام کار عورت پر عائد کیا جاتا ہے۔ اس کہانی میں ان رمز و علامات کو نئے انداز سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔"

مصر کی سب خوبصورت اور معزز عورتوں نے کہا حاشا! یہ انسان نہیں کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔ اور انہوں نے یوسف کو دیکھ کر مارے حیرت کے اپنے انگوٹھے کاٹ لئے اور ان کے انگوٹھوں سے خون رسنے لگا۔ زلیخا نے کہا وہ ایک جیتا جاگتا آدمی ہے جو کھاتا پیتا اور سوتا ہے وہ فرشتہ نہیں۔ فرشتوں سے بڑا ہے۔ میں چاہتی ہوں تم سب اسے سجدہ کرو اس طرح تمہارے انگوٹھوں سے خون بہنا بند ہو جائے گا اور تمہارے زخم بھر جائیں گے۔

زلیخا بشر تھی اور بشر تو شک رشک اور حسد کا پتلا ہے۔ اس لئے زلیخا سوچ میں پڑ گئی کہ زنان مصر کی حیرت کی وجہ یوسف کا حسن ہے یا اسے یہاں دیکھنے کی حیرت میں خوف شامل ہے۔ زلیخا نے سوچا کہ آخر اس نے بھی تو یوسف کو دیکھ کر اپنے ہوش و حواس برقرار رکھے ہیں۔ پھر یہ عورتیں ہوش و حواس کیوں کھو بیٹھیں۔ عزیز مصر اور سارے دربار نے بھی یوسف کا حسن دیکھا تھا پھر آخر شہر کی معزز بیگمات نے اپنے انگوٹھے کیوں کاٹ لیے۔ کیا وہ یوسف سے ڈرتی ہیں؟ کیا وہ ان کے رازوں کا امین ہے اور اس لمحہ زلیخا بدگمانی میں مبتلا ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ یوسف ان عورتوں کو دیکھ کر گھبرا کیوں گیا تھا۔ وہ حیران اور پریشان سا جلدی سے وہاں سے نکل گیا تھا۔ اگر کھڑا ہو جاتا۔ ٹھہر جاتا تو شاید پھر وہ انگوٹھے نہ کاٹتیں۔ کیا یوسف ان عورتوں کو پہلے سے جانتا تھا۔ اس رمز کو جاننے کے لئے زلیخا مچل اٹھی۔ آخر انگوٹھے کاٹے جانے میں کیا مزہ ہے؟ پھر اس نے سوچا اب وہ یوسف کو لائے گی۔ اور ان سب عورتوں کو سجدے کا حکم دے گی دیکھیں وہ اسے سجدہ کرتی ہیں یا نہیں ——! زلیخا دوڑی دوڑی یوسف کے پیچھے پیچھے گئی اور بھاگتے ہوئے یوسف کا دامن پکڑ کر

بولی، ٹھہرو... وہ ایک لمحہ کو رکا۔ زلیخا نے کہا "ذرا میرے ساتھ اندر آؤ۔"

یوسف حیران پریشان گھبرایا تھا۔ وہ زلیخا کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ اس نے سوچا وہ ان سب عورتوں سے کیسے پیچھا چھڑائے اس نے دعا کی کہ خدا مجھے ان عورتوں کے شر سے محفوظ رکھے۔

زلیخا کی نیت کا حال خدا ہی جانتا تھا۔ وہ اتنی معصومیت سے اس کا دامن پکڑے اسے اندر بلا رہی تھی مگر یوسف زلیخا کو بھی مصر کی دوسری معزز عورتوں کی طرح سمجھا اور بھاگ کھڑا ہوا۔

تب زلیخا نے بھاگتے ہوئے یوسف کا دامن زور سے پکڑ لیا۔ یوسف تیزی سے دروازے کی طرف بھاگا۔ دامن کی دھجی پھٹ کر زلیخا کے ہاتھ میں رہ گئی۔ زلیخا اندر آئی تو اس نے دیکھا کہ مصر کی معزز بیگمات اپنے انگوٹھے پکڑے درد سے تڑپ رہی تھیں۔ زلیخا نے دامن کی وہ دھجی پھاڑ پھاڑ کر سب عورتوں کو بانٹ دی اور کہا کہ لو اپنے انگوٹھوں پر پٹی باندھ لو" عورتوں نے انگوٹھوں پر پٹیاں باندھ لیں تو خون بہنا بند ہو گیا اور ان کے انگوٹھے چمک اٹھے وہ پٹی روشن ہو گئی۔ اس لئے کہ یوسف کے دامن کی دھجی تو بس روشنی کی ایک لکیر تھی۔

زلیخا نے مسکرا کر ان عورتوں سے کہا۔"اگر تم انگوٹھے کی جگہ ہاتھ کاٹ دیتیں تو تمہارا پورا ہاتھ روشن ہو جاتا۔" پھر زلیخا نے باری باری سب عورتوں کو گلے لگایا اور وہ اپنے روشن انگوٹھوں کو دیکھتی ہوئی خوشی خوشی رخصت ہوئیں۔

جب کاہن اعظم کو بتایا گیا کہ مصر کی معزز عورتوں کے انگوٹھوں سے روشنی کی شعائیں نکلتی ہیں تو کاہن اعظم نے کہا وہ سب عصمت ماب عورتیں ہیں اور ان کے ساتھ مقدس روشنی ہے۔ یہ سن کر مصر کے شریف اور بڑے آدمی اپنی اپنی عورتوں پر فخر کرنے لگے اور ان عورتوں کو دیوداسیوں سے بھی بڑا مرتبہ دیا گیا تھا ہر طرف ان کی عصمت اور بزرگی کی دھوم مچ گئی۔

عزیز مصر نے زلیخا سے کہا کہ مصر کی سب عصمت ماب اور پاک دامن عورتوں کے انگوٹھے روشن ہو گئے ہیں تم اپنا انگوٹھا دکھاؤ۔" زلیخا نے مسکرا کر ہاتھ بڑھایا تو اس کا انگوٹھا روشن نہیں تھا وہ تو ایک معمولی ہاتھ تھا۔

تب عزیز مصر نے دکھ سے کہا۔"میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ آج مصر کے سب مردوں کے سامنے میرا سر جھک گیا۔" کاہن اعظم نے جب سنا کہ زلیخا کا ہاتھ ایک معمولی

عورت کا ہاتھ ہے۔ اور اس کے انگوٹھے سے روشنی کی شعائیں نہیں نکلتیں تو اس نے کہا۔" افسوس عزیز مصر کی بیوی ایسی ہو۔"

ادھر سب لوگوں نے یوسف کا پھٹا ہوا کرتا دیکھا تو زلیخا کے مجرم ہونے میں کسی کو شک نہ رہا۔ بزرگوں نے گواہی دی کہ کرتا پیچھے سے پھٹا ہے اس لئے زلیخا مجرم ہے۔

زلیخا کا دل دکھ سے بھر گیا اس نے سوچا کہ یوسف کے دل میں کوئی چور تھا۔ آخر وہ بھاگا کیوں کھڑا نہ رہا۔ اس کے ساتھ اندر کیوں نہ آیا نہ وہ بھاگتا نہ کرتا پھٹتا۔ مگر وہ کسی سے کیا کہتی وہ مجرم بنی خاموش کھڑی رہی۔

زلیخا کا جی چاہا کہ وہ ان سب بزرگوں کو یہ راز بتا دے کہ اگر وہ یوسف کا دامن نہ پھاڑتی تو ان سب عورتوں کے انگوٹھے روشن نہ ہوتے مگر وہ خاموش رہی اسے اپنی چھوٹی سی نیکی کا ڈھنڈورا پیٹنا اچھا نہ لگا۔ یہ کم ظرفی تھی اور لوگ نیت نہیں دیکھتے وہ ظاہر عمل دیکھتے ہیں اور اس کا نام انہوں نے انصاف رکھ لیا ہے لیکن زلیخا کو دکھ اس بات کا تھا کہ یوسف بھی اسے نہیں پہچانا اور وہ اسے غلط سمجھا۔ وہ تو سب کو اس کے سامنے سجدہ کرانا چاہتی تھی۔

زلیخا چپ رہی وہ کسی سے کیا کہتی کوئی اس کی بات سمجھنے والا نہ تھا۔

زلیخا پر تہمت لگ گئی حالانکہ اس کا انگوٹھا صحیح سالم تھا۔ شاید اس کا جرم یہی تھا کہ اس نے انگوٹھا نہیں کاٹا تھا اور یوسف کو دیکھ کر بھی اپنے ہوش و حواس برقرار رکھے تھے۔

عزیز مصر نے زلیخا کی روشن آنکھوں میں دیکھے بغیر نفرت سے منہ موڑ لیا اور بولا۔ "تم نے بری نظر سے غیر کی طرف دیکھا ہے۔" زلیخا نے کہا۔ "مجھے کوئی غیر نظر ہی نہیں آتا۔ پھر اس نے عزیز مصر اور سب بزرگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور اپنا سر بلند رکھا۔

پھر وہ سب یوسف کو سامنے لائے اور اس کا پیچھے سے پھٹا ہوا کرتا دکھایا گیا۔ یوسف نے زلیخا کی طرف دیکھا زلیخا مسکرائی۔ یوسف اپنا سر اونچا اٹھائے چل رہا تھا۔

عزیز مصر نے زلیخا سے کہا۔ "اب تم کیا کہتی ہو۔"

زلیخا مسکرا کر بولی۔ "بے شک یہ سچا ہے۔" اور اپنا سر جھکا لیا۔ زلیخا دل سے یوسف کی صداقت پر ایمان لے آئی تھی۔ اور وہ یوسف کے وہاں سے بھاگنے کا رمز سمجھ گئی تھی۔

عزیز مصر نے کہا۔ "تو مان گئی کہ تونے بری نگاہ سے غیر کو دیکھا ہے۔"

زلیخا نے پھر وہی بات دہرائی۔ "میں نے آج تک کسی غیر کو نہیں دیکھا مجھے غیر نظر ہی

نہیں آتا۔ میری آنکھیں تو بس آپ کو دیکھتی ہیں۔"

عزیز مصر نے کہا۔ لیکن میں تو یہاں ہوں۔"

زلیخا نے مسکرا کر یوسف کی طرف دیکھا اور بولی۔ "میں یہاں ہوں۔"

یوسف اس کی بات سمجھ گیا اور اس کا سر جھک گیا۔ اس نے کہا "مجھے جیل خانے جانا منظور ہے۔" زلیخا نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا لیا اور مسکرانے لگی۔

زلیخا اپنے محل میں آ کر سوچنے لگی کہ قافلے والے جب یوسف کو مصر لے کر آئے تو راستے میں انہوں نے جگہ جگہ پڑاؤ ڈالا ہو گا' کاش وہ گھوم پھر کر دیکھ سکتی کہ اور کہاں کہاں کن کن عورتوں نے مارے حیرت کے انگوٹھے کاٹے تھے۔ زلیخا کا جی چاہا کہ وہ ایک انعام مقرر کرے تاکہ سب عورتیں اسے اپنے کٹے ہوئے انگوٹھے دکھانے آئیں اور انعام لے لیں۔ پھر اس نے سوچا کہ انعام کے لالچ میں تو ہر ایک اپنا انگوٹھا کاٹ کر آ جائیں گی۔ اور یہ کام زلیخا کے مرتبہ اور شان کے خلاف تھا کہ وہ سارے جہاں کی عورتوں کے انگوٹھے دیکھتی پھرے اور پھر اس نے سوچا آخر یہ جان کر کیا کرے گی۔ اس کی بلا سے۔ ارے جہاں کی عورتیں اپنے انگوٹھے کاٹ ڈالیں۔ جیت اس وقت یوسف کی ہوتی اگر زلیخا بھی اپنا انگوٹھا کاٹ لیتی۔ مگر اس کا انگوٹھا سلامت ہے۔ اس لئے جیت اس کی ہوئی —— اور انصاف کے دن تو یوسف بھی اسے پہچان ہی لے گا——! اور وہ انصاف کے دن کا انتظار کرنے لگی۔

جیل خانے کا محافظ تنگ اور تاریک تہہ خانے کے حجرہ میں بند کرنے یوسف کو لے کر چلا۔ مگر جوں جوں تہہ خانے میں اترتا جاتا تھا اس کی آنکھیں چندھیائی جاتی تھیں اس نے سوچا سورج آسمان پر نکلتا ہے یا وہ زمین کی گہرائیوں میں کہیں دفن ہے اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ سورج اس کے ساتھ چل رہا ہے اس لئے کہ اس کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ اسے جیل خانے کا داروغہ بنے ہوئے سالہا سال ہوگئے تھے روشنی سے لا کر تاریکی میں بند کرنا اس کا کام تھا مگر آج پہلی مرتبہ اسے نیا کام دیا گیا تھا۔ روشنی کو قید کرنے کا کام۔

داروغہ نے تہہ خانے کے آخری تنگ اور تاریک حجرے کا دروازہ کھول کر یوسف کو اس میں بند کر دیا اور جب کوٹھڑی میں بڑا سا آہنی تالہ ڈال کر وہ مڑا تو گھبرا کر پھر دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کی درز سے روشنی کی شعاعیں نکل رہی تھیں اور وہ شعاعیں لوہے کے تالے کے آر پار نظر آ رہی تھیں۔ داروغہ حواس باختہ ہو کر وہاں سے چلا واپس

میں وہ قدم قدم پر ٹھوکر پہ ٹھوکر کھاتا تھا۔ اور گرتا تھا اسے تعجب تھا کہ جس اندھیرے حجرے میں وہ پل بھر میں داخل ہوا تھا اس حجرے سے واپسی میں وقت اتنا لمبا کیوں ہو گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ساری عمر اندھیرے غاروں میں دھکے کھاتا رہے گا۔ اور راستہ نہیں ملے گا۔ دروازہ نہیں آئے گا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ واپس جائے اور یوسف کے قدموں پر گر کر اس سے معافی مانگ لے مگر پھر عزیز مصر کے خوف سے وہ اندھیرے میں راستہ ٹٹول ٹٹول کر چلتا رہا۔

جب وہ قید خانے سے باہر نکلا تو رات کا وقت تھا۔ اس نے سوچا خدا جانے ایک رات گزری ہے یا اس سفر میں کئی راتیں گزر چکی ہیں۔ اس لئے کہ اس کی داڑھی کے کالے بال سفید ہو گئے تھے۔

اندھیری رات میں مصر کے بالا خانوں میں دیئے روشن نظر آئے تو اس نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا آج کوئی تہوار ہے۔ مصر کی سب عورتوں نے چراغاں کیوں کیا ہے۔"

لوگوں نے اسے بتایا کہ آج رات مصر میں اتنی تاریکی ہو گئی تھی جیسے کنعان کا چاند چھپ گیا۔ عزیز مصر نے اندھیرے سے گھبرا کر چراغاں کا حکم دیا۔ پھر بھی تاریکی دور نہ ہوئی تو مصر کی وہ سب پاک دامن عورتیں اپنے اپنے بالا خانوں پر ہاتھ اٹھا کر کھڑی ہو گئیں جن کے انگوٹھے روشن تھے اور یہ جو چراغوں کی لوئیں نظر آ رہی ہیں یہ مصر کی بزرگ اور نیک عورتوں کے انگوٹھے چمک رہے ہیں۔

زلیخا نے اس رات عجیب خواب دیکھا۔ مگر اس نے اپنے خواب کا کسی سے ذکر نہیں کیا۔ اور سوچا آج کی رات مقدر کو نیند آ رہی ہے۔ مگر وہ ضرور جاگے گا۔ تاریکی میں سارا مصر سو رہا تھا۔ روشن انگوٹھوں والی عورتیں بھی اپنی خوابگاہوں میں واپس چلی گئی تھیں اور گہری نیند میں تھیں۔ تقدیر کا فرشتہ بھی سو گیا تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ قلم اور کاغذ سوتے میں بھی اس کے پاس تھے۔ وہ نیند کی غفلت میں کچھ لکھ رہا تھا۔ زلیخا نے چپکے سے تقدیر کے فرشتہ کے ہاتھ سے قلم لے لیا اور کہا۔ "اپنی کہانی میں خود لکھوں گی۔" سارا مصر سو رہا تھا۔ زلیخا جاگ رہی تھی۔

زلیخا نے وہ خواب بھی سوتے ہوئے نہیں جاگتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ عجیب الجھن میں تھی کہ یہ عالم بیداری ہے یا عالم خواب اور آپ سے آپ اس کا سر ان دیکھے خدا کے سامنے جھک گیا۔ اس نے جھک کر سجدے میں ان دیکھے خدا سے اقرار کیا نہ میں ہوں نہ یوسف ہے بس تو ہے۔ اور یوسف تو تیرے اجالے کی کرن لایا تھا جو کچھ میں نے عزیز مصر

کے سامنے کہا تھا وہ تیرا ہی حکم تھا تو روز قیامت گواہ رہنا۔" پھر زلیخا نے سجدے سے سر اٹھا لیا اور سوچا اب میرا کسی سے کوئی واسطہ نہیں ہے نہ یوسف سے اور عزیز مصر ہے ــــــ؟ اور پھر زلیخا کے دل پر سے بوجھ ہٹ گیا اس کی روح سرور کے کیف میں ڈوب گئی۔ اسے گہری نیند آگئی۔

جب زلیخا کی آنکھ کھلی تو اس کے سیاہ بال سفید ہو چکے تھے اور اس کے چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں۔ اس کے گلابی ہونٹوں کی پنکھڑیاں مرجھا گئی تھیں۔ اس کا خوبصورت جسم کمان کا طرح خم ہو چلا تھا۔ مصر کی وہ سب عورتیں جو زلیخا کی ہم سن تھیں اپنے روشن انگوٹھوں کو دیکھ دیکھ کر خوشی سے مگن تھیں کہ غم اور بڑھاپا ان کے قریب سے بھی نہ گزرا تھا۔ ان کے بال کالے تھے اور ہونٹوں کی کلیاں ترو تازہ اس لئے کہ انہیں سچی مسرت اور عزت حاصل تھی۔ وہ مصر کی سب سے معزز عورتیں تھیں۔ مگر ان سب کے مرد عزیز مصر کی طرح بوڑھے ہو گئے تھے۔

ایک دن ان عورتوں نے زلیخا پر ترس کھا کر کہا۔ "اگر تم نے اپنا انگوٹھا کاٹ لیا ہوتا تو تم بھی آج جوان ہوتیں اور نہ یوسف قید ہوتا۔ ہم سب کی لونڈیاں اور غلام آزاد ہیں۔ مگر تم نے ایک انہونی بات کی ہے اور اس کی سزا بھگت رہی ہو۔

زلیخا بولی۔ "اگر میں اپنا انگوٹھا کاٹ لیتی تو دامن کون پھاڑتا اور پھر شائد تمہارے زخم کبھی مندمل نہ ہوتے۔" یہ سن کر انہوں نے سر جھکا لیا اور خاموش ہو گئیں۔

زلیخا ان کی باتوں پر مسکرانے لگی۔ وہ ان عورتوں کو کیا بتاتی کہ انہوں نے تو صرف انگوٹھے کاٹے تھے مگر جب زلیخا نے عزیز مصر سے یہ کہا تھا کہ میں نے آج تک کسی غیر کو نہیں دیکھا تو اس لمحہ اس نے اپنا سر کاٹ کر کر ہتھیلی پر رکھ لیا تھا۔ اور جب اس نے یوسف سے کہا تھا کہ "میں یہاں ہوں۔" تو اس کے جسم پر غرور کا سر نہیں تھا۔ اس کی انا ختم ہو چکی تھی۔ وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ وہ ایک لمحہ میں وہ سارا سفر طے کر چکی تھی وہ سفر جس کو طے کرنے کے لئے مجنوں نے ساری زندگی دشت کی خاک چھانی تھی۔ فرہاد نے نہر کھودی تھی۔ اور یوسف نے جیل خانے کی صعوبت گوارا کی۔ وہ سارا سفر زلیخا نے پلک جھپکاتے میں طے کر لیا تھا۔ عرفان کے اس لمحہ میں جب اس نے اپنا سر کاٹ کر ہتھیلی پر رکھا تھا۔ اس کا سارا وجود روشنی بن گیا تھا۔ مگر یہ سب باتیں وہ کسی کو نہیں سمجھا سکتی تھی' وہ خاموش رہی۔ زلیخا نے اپنی سہیلیوں کو جب اپنے بڑھاپے پر ترس کھاتے دیکھا تو کہا۔ "یہ بھی کتنی اچھی بات ہے کہ میں تمہیں اس بوڑھے جسم کی بدولت نظر آ رہی

ہوں' میں تو خود کو نظر بھی نہیں آتی۔ "بس وہی ہے۔"

اس کی ایک سہیلی ہنس کر بولی کون؟ یوسف؟"

زلیخا نے کہا۔ "تم یہ باتیں نہیں سمجھ سکتی ہو اس لئے اسے یوسف کہہ لو تو کوئی حرج نہیں ہے۔"

پھر زلیخا انہیں اپنے ساتھ لائی اور کہا۔ "دیکھو یہ الماریاں —— ان میں وہ سب لباس ٹنگے ہوئے ہیں جو ازل سے ابد تک کے ہیں۔ میں جو لباس چاہوں پہن سکتی ہوں۔ انوکھے دیسوں کے خوبصورت لباس! تم جسے میرا جسم سمجھ کر میرے بڑھاپے پر ترس کھا رہی ہو وہ تو میرا لباس ہے۔ "پھر اس نے انہیں وہ سب لباس پہن کر دکھائے۔ کبھی وہ سیتا بن گئی کبھی در و پدی' کبھی لیلیٰ کبھی شیریں پھر وہ ہنس کر بولی زندگی کے اس رواں دواں سمندر میں سے آخر میں تمہیں لباس کہاں تک نکال نکال کر دکھاؤں یہ ہیر ہے یہ سوہنی ہے۔ یہ قلو پطرہ ہے یہ انارکلی ہے اور یہ نور جہاں ہے —— اور یہ سب سے خوبصورت لباس یہ جوگیا رنگ کی ساری اور منکوں کی مالا —— یہ وہ جوگن ہے جس کا نام میرا تھا اور جس کے بول قیامت تک زندہ رہیں گے۔ پھر اس نے سب الماریاں بند کر دیں مصر کی سب عورتیں حیران پریشان تھیں جیسے کسی سحر میں ہوں۔ وہ کبھی آنکھیں ملتی تھیں اور کبھی کھولتی تھیں آخری الماری باقی رہ گئی تھی۔ زلیخا نے کہا میں اسے نہیں کھول سکتی اس میں عالم مثال کے لباس ہیں۔ وہ سب لباس جنہیں محبت نے جنم دیا ہے یہ وہ سب خیال ہیں جو کل حقیقت بنیں گے۔

عورتوں نے کہا۔ "یہ لباس کیسے ہیں۔؟"

زلیخا نے کہا۔ "عالم مثال میں نہ جسم ہے نہ خیال بس وہ لباس تو صرف ایک حکم ہے۔"

ایک عورت نے پوچھا حکم کیا ہے؟"

زلیخا بولی۔ "وہ روح ہے۔"

زلیخا نے کہا۔ تم سب موت سے ڈرتی ہو بڑھاپے سے خوف کھاتی ہو اور سدا جوان رہنے کی آرزو کرتی ہو۔ اب یہ لباس دیکھ کر تمہارا خوف دور ہوا یا نہیں؟"

عورت نے کہا۔ "ہاں اب ہمارے دلوں سے موت کا خوف جاتا رہا ہے۔"

زلیخا بولی۔ "موت کا دکھ اور خوف تو بانجھ زمین کا دکھ اور خوف ہے۔ وہ زمین جس پر پھل اور پھول آتے ہیں اسے موت کہاں "پھر وہ مسکرانے لگی۔ ایک عورت بولی۔" ہمیں

موت کے بارے میں بتاؤ- موت کیا ہے- "زلیخا نے کہا-" جسم سے جسم کا ملاپ موت ہے فنا ہے اور تم جسے فراق کہتی ہو وہ زندگی ہے- روح کا روح سے ملاپ ہوتا ہے-"

ایک عورت نے کہا- "کیا روح کا ملاپ زندگی میں ممکن ہے-"

زلیخا بولی "ہاں ممکن ہے مگر اس وقت جب تم جیتے جی جسم سے باہر نکل سکو اور یہ وہ راز ہے جو صرف خضر کو معلوم ہے اور وہ کسی کو نہیں بتاتا- آؤ میں تمہیں آب بقا کا راز بتاؤں تاکہ تم حیات جاوید پا لو-"

ایک عورت نے کہا- "حیات جاوید کیا ہے-"

زلیخا ہنس پڑی-" وہ ایک لمحہ ہے دید کا ایک لمحہ! دیکھ لینا اور پہچان لینا- اگر حیات کے لامتناہی سمندر میں وہ ایک لمحہ تمہیں حاصل ہو گیا تو تم جام جہاں نما کی مالک ہو-"

ایک عورت نے پوچھا "جام جہاں نما کیا ہے-"

زلیخا بولی "وہ تمہارا دل ہے اس آئینہ کو جتنی جلا دے سکوں گی اتنی ہی دور دیکھ سکو گی- ماضی، حال، مستقبل ایک لکیر کے سب روشن نقطے نظر آئیں گے پھر تم وقت کی قید میں نہیں ہو گی- وقت تمہاری قید میں ہوگا-"

ایک عورت نے کہا- "دیکھو تم سب مٹی کے کوزوں کی پروا کرنا چھوڑ دو- ہستی کے بازار میں ان کوزوں کی کمی نہیں جو چیز پیالے میں ہے وہ قیمتی ہے- وہ شراب ہی آب حیات ہے- وہ روشنی ہے—— وہ تمہاری روح ہے اور سچ روح کی غذا ہے!

ان عورتوں نے کہا اب ہم تمہاری باتیں سمجھ گئے ہم آج اپنے روشن انگوٹھوں کا حال اپنے شوہروں کو بتا دیں گے- یوسف سچا ہے- اور عزیز مصر کے سامنے تمہاری بے گناہی بھی ثابت ہو جائے گی- زلیخا نے محبت سے انہیں گلے لگایا اور بولی "تمہارا راز میرا راز ہے اگر تم نے یوسف کو چاہا اور پسند کیا تو میں خوش ہوں- اس لئے کہ یوسف مجھ سے الگ نہیں- نہ میں یوسف سے جدا ہوں- تم نے اسے چاہا تو مجھے چاہا——! اور میری بے گناہی اور سب پر تو ثابت ہے عزیز مصر کے ساتھ میں نے زندگی گزاری ہے وہ مجھے جانتا ہے- تم سب جانتی ہو—— مصر کے سب لوگ جانتے ہیں مگر میری بے گناہی یوسف پر انصاف کے روز ثابت ہوگی جب اسے میری نیت کا حال معلوم ہوگا-"

اس رات ان سب معزز اور پاک دامن عورتوں نے اپنے اپنے خاوندوں کو اپنے انگوٹھے زخمی ہونے کا حال سنایا اور کہا یوسف بھی سچا ہے اور زلیخا بھی سچی ہے اور پاکدامن ہے- "ان سب کے انگوٹھوں کی روشنی یکایک غائب ہو گئی تو ان مردوں نے کہا "کاش تم

نے اپنی زبانوں پر تالا ہی رکھا ہوتا تو اچھا تھا۔"

عورتوں نے مردوں سے کہا کہ "وہ روشنی اپنے مقام پر واپس آ گئی ہے۔ اور اب وہ ہمارے دلوں میں ہے۔"

جب انہوں نے زلیخا کی باتیں اپنے مردوں کو سنائیں تو وہ بولے اگر مصر کے کاہنوں نے زلیخا کی باتیں سن لیں تو وہ اسے بھی جیل خانے میں ڈلوا دیں گے یا اس سے بدتر کوئی سزا دیں گے۔ عورت ناقص العقل ہوتی ہے۔ اس کی بات مان کر تم نے انگوٹھوں کی مقدس روشنی کھو دی۔ وہ جو بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہی ہے اس سے پوچھو کہ آج تک کوئی عورت پیغمبر یا اوتار ہوئی ہے؟ عورتیں یہ سن کر چپ ہو گئیں۔

جب وہ عورتیں زلیخا کے پاس آئیں تو انہوں نے اپنے مردوں کی باتیں سنائیں۔ زلیخا ان کی باتیں مسکرا مسکرا کر سنتی رہی پھر بولی عورت نے پیغمبر اور اوتار ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اس لئے کہ دعویٰ کرنا عورت کو زیب نہیں دیتا۔ سورج دنیا سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس روشنی ہے وہ تو سب کو روشنی دیتا ہے عورت پیغمبر اور اوتار پیدا کرتی ہے۔"

پھر ان عورتوں نے کہا۔ "وہ سب کہتے ہیں عورت کی عقل ناقص ہے۔"

زلیخا بولی۔ "یہ سچ کہتے ہیں عورت عقل میں ناقص ہے اور عشق میں کامل ہے۔ مرد عقل میں کامل بنتا ہے مگر وہ عشق میں ناقص ہے۔ اور جو عشق میں کامل ہو اسے نظر آتا ہے حقیقت کا عرفان دید ہے نہ کہ شنید! مردوں کا علم ظاہر کا ہے اور عورتوں کا علم باطن کا ہے۔ ظاہر کو باطن کا علم نہیں اس لئے وہ عورت کو ناقص العقل کہتے ہیں مگر باطن کو ظاہر کا حال معلوم ہے اس لئے عورت کوئی دعویٰ نہیں کرتی نہ کسی بات کا برا مانتی ہے۔ وہ ہنس کر چپ ہو جاتی ہے۔"

ان مردوں نے جب یہ سنا کہ زلیخا ان کی باتوں پر ہنس کر چپ ہو جاتی ہے تو وہ کھسیانے ہو گئے اور الٹا اپنی تقدیر کو کوسنے لگے کہ انہوں نے روشن انگوٹھوں والی عورتوں سے شادی کرنے کی بجائے معمولی عورتوں سے شادی کیوں نہ کی جو ان کی ہر بات بلا چون و چرا مانتیں اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر ان کے پیچھے چلا کرتیں۔

عزیز مصر نے اس رات ایک خواب دیکھا اور دوسرے دن اپنے مصاحبوں کے آگے بیان کیا اور پھر وہ غلام جو اسے شراب پلانے پر مامور تھا دوزانو ہو کر بولا کہ اسے خوابوں کی تعبیر بتانے والے کا پتہ معلوم ہے اور اس نے یوسف کا حال بیان کیا۔

عزیز مصر نے یوسف کی رہائی کا حکم دیا اور سالہا سال بعد وہ خوابوں کا حال جاننے

والے اور ان کی تعبیر بتانے والا جیل خانے سے باہر آیا وہ جیل خانے جا کر وقت کی دھوپ چھاؤں سے محفوظ تھا۔ وہاں وقت ٹھہر گیا تھا۔ حسن صحت جوانی سب چیزیں وقت کے ساتھ ٹھہر گئی تھیں اور یوسف وہی یوسف تھا۔

مگر زلیخا وہ زلیخا نہیں تھی۔ اور جس طرح پھل پک کر درخت سے لٹک جاتا ہے اس طرح وہ جیتے جی جسم کی قید میں سے نکل آئی تھی فنا کی منزل سے گزر کر بقاء کی اس منزل میں تھی جہاں سب لباس اس کی الماریوں میں بند تھے مگر اسے اپنا بوڑھا جھریوں والا لباس پسند تھا۔ اگر وہ لباس بدل لیتی تو عزیز مصر اور دوسرے لوگ اسے نہ پہچانتے اور یوسف کے جیل خانے سے آنے تک وہ اس لباس میں رہنا چاہتی تھی تاکہ یوسف کا امتحان لے سکے اور دیکھ سکے کہ یوسف اسے پہچانتا ہے یا نہیں۔

جب یوسف زلیخا کے سامنے آیا تو وہ اسے نہیں پہچانا۔ وہ بیگانوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے سے خاموش گزر گئے۔

پھر قحط سالی کا دور آیا تو عزیز مصر کے خواب کی تعبیر لوگوں نے حرف بہ حرف پوری ہوتی دیکھ لی۔ عزیز مصر نے یوسف کو اپنے تخت کا وارث بنایا کیونکہ وہی انہیں قحط بیماری اور اندھیرے سے نجات دلانے والا تھا اور اسے یوسف پر بھروسہ تھا اور مصر کے لوگ اسے اپنا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔

اور جب یعقوب کی آنکھیں روشن ہوئیں اور اس نے یوسف کو اس کے خواب کا مطلب سمجھایا تو سب کے سر اس کے سامنے جھک گئے۔

سب کے خواب سچ بن کر ظاہر ہوئے مگر زلیخا نے اپنے خواب کا کسی سے ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے خواب کی تعبیر جاننا چاہتی تھی اور خوابوں کی تعبیر بتانے والا یوسف تھا جو اسے پہچانتا نہ تھا۔ اس لئے اپنے خوابوں کی تعبیر پوچھنے جانا زلیخا کو کچھ اچھا نہ لگا۔ پھر اس نے سوچا کہ اس کے خواب کی تعبیر بھی اسی طرح ایک دن سامنے آئے گی جس طرح سب کے خوابوں کی تعبیر سامنے آئی ہے اور اس دن سے یوسف پہچان لے گا۔

کچھ عرصہ بعد یوسف نے اپنے محل میں دعوت کی جس میں سب معزز لوگ مدعو تھے اس دعوت میں وہ عورتیں بھی تھیں جن کے انگوٹھوں کا ایک زمانے میں بڑا چرچا تھا ان کے خاوند بھی ساتھ تھے اور اس دعوت میں یوسف نے عزیز مصر کی بیوہ کو بھی بلایا تھا۔

جب زلیخا ان سب عورتوں کے درمیان بیٹھی تو یوسف کی اس پر نظر پڑی اور وہ سوچ میں پڑ گیا۔

زلیخا نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یوسف کو آج یاد دلائے گی کہ وہ کون ہے اور ایک لمحہ کے لئے زلیخا نے وہ لباس پہن لیا جسے اتار کر اس نے مصر کی ملکہ کا لباس پہنا تھا وہ لباس کنعان کی اس دوشیزہ کا تھا جو یوسف کے ساتھ لڑکپن میں بھیڑیں اور بکریاں چرایا کرتی تھیں اور جب ایک دفعہ اس نے یوسف کے بھائیوں کو کنوئیں میں دھکا دے کر اسے گراتے دیکھا تو اسے نکالنے دوڑ پڑی تھی۔ اس کے بھائی جا چکے تھے وہ بیقراری کے عالم میں کنوئیں میں کود گئی۔ اور جب وہاں اس نے یوسف کو زندہ سلامت چودھویں کے چاند کی طرح چمکتے دیکھا تو اسے اتنی خوشی ہوئی اس خوشی کی تاب نہ لا کر اس نے اپنی جان دے دی۔ یا پھر یہ ہوا کہ یوسف کے پاس جا کر اس نے دوسرا جسم بیکار سمجھ کر پھینک دیا ہو۔

یوسف نے اس لمحہ زلیخا کو پہچان لیا! قید خانے کا پورا عرصہ گزار کر یوسف وہ راز سمجھا جو زلیخا عزیز مصر اور سب بزرگوں کی موجودگی میں سمجھانا چاہتی تھی جب زلیخا نے کہا تھا کہ میں یہاں ہوں تو یوسف نے سوچا تھا کہ زلیخا نے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے مگر آج جب اس نے زلیخا کو کنعان کی دوشیزہ کے پرانے لباس میں دیکھا جو کنوئیں میں رہ گیا تھا تو وہ اس لمحہ اس جملے کا مطلب سمجھ گیا کہ میں یہاں ہوں۔"

جب حقیقت بے نقاب ہوئی تو کنوئیں سے نکال کر مصر کے بازار میں لایا جانا۔ سب عورتوں کے انگوٹھے کاٹنا اور زلیخا کا دامن پکڑنا سب باتیں اس کی سمجھ میں آ گئیں۔ زلیخا کا وہ لباس بہت خوبصورت تھا اور مصر کی سب معزز عورتوں کے ملبوسات بہت خوبصورت تھے اور اس لئے یوسف نے ان کے شر سے بچنے کی دعا کی تھی۔ یوسف نے سوچا کہ کاش زلیخا اس وقت رمز اور اشارے میں بات نہ کرتی اور وہ بتا دیتی کہ وہ کون ہے تو پھر مصر کے تخت پر بیٹھنے کے بعد وہ سالہا سال غم نہ کرتا کہ وہ مصر کا بادشاہ ہونے کے بجائے کنعان کا ایک فقیر ہوتا۔ اس نے سوچا کنوئیں سے عزیز مصر کے محل تک اسے جو چیز لائی تھی وہ کنعان کی مٹی کی خوشبو تھی جس مین اس کی روح مقید تھی۔ اور وہ سارے عرصہ اپنی روح کو تلاش کرتا رہا۔ اب اگر مصر کی عورتوں نے اپنے انگوٹھے کاٹ لئے تو اس میں اس کا کیا قصور تھا۔

جب زلیخا نے دیکھا کہ اسے یوسف نے پہچان لیا تو غم کا بوجھ اس کی روح سے ہٹ گیا اور اس کا دل خوشی سے بھر گیا۔ اس کا رواں رواں کھل اٹھا۔

مصر کے لوگوں نے جب اس لمحہ زلیخا کو پھول کی طرح ہنستے دیکھا تو وہ بولے کہ یوسف کو دیکھ کر زلیخا خوشی سے جواں ہو گئی ہے یہ بات سن کر یوسف بھی مسکرانے لگا اور زلیخا

بھی مسکرانے لگی۔ اس لئے اپنی حقیقت وہ خود جانتی تھی یا پھر یوسف جانتا تھا۔

یوسف بے قرار ہو کر مسند سے اترا اور چاہا کہ ہاتھ پکڑ کے اسے مسند پر اپنے برابر جگہ دے۔ مگر زلیخا محبت اور وقت کے رمز سے آشنا تھی وہ یوسف کو وہ لباس کیسے دے دیتی جو عزیز مصر کی ملکیت تھا۔

یوسف نے ہاتھ بڑھا کر لمحہ کو اپنی گرفت میں لینا چاہا۔ سورج اور چاند ٹھہر گئے۔ لمحہ اس کی گرفت میں آگیا۔ اس نے زلیخا کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر پکڑ کر فوراً ہی چھوڑ دیا۔

یوسف اگر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسی طرح کھڑا رہتا تو وقت کا وہ لمحہ ہمیشہ کے لئے ٹھہر جاتا اور سورج چاند تو سفر کرنے کے لئے ہیں۔ یوسف کو وہ ایک لمحہ مصر کی بادشاہت سے زیادہ قیمتی معلوم ہوا جب اس نے وقت کو گرفت میں لے لیا تھا۔

اور جب یوسف نے زلیخا کا ہاتھ پکڑا تو زلیخا اپنے خواب کی تعبیر جان گئی' زلیخا نے دیکھا کہ وہ تو صرف روشنی تھا جسم نہیں تھا اور یوسف نے زلیخا کا ہاتھ پکڑ کر محسوس کر لیا تھا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی ہاتھ نہیں ہے اور اسی لئے اس نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہی چھوڑ دیا تھا۔ لمحہ کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا تھا۔ چاند اور سورج کو سفر کرنے دیا تھا۔

سب لوگ حیران اور پریشان کبھی یوسف کو دیکھ رہے تھے اور کبھی زلیخا کو اور ان کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ اور پھر ان سب کی حیرت دور کرنے کو یوسف نے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا کہ وہ پھٹا پرانا کرتا لے آئے جسے آنکھوں پر رکھتے ہی اس کے باپ کی آنکھیں روشن ہو گئی تھیں۔

یوسف کا چھوٹا بھائی وہ کرتا لے آیا تو سب نے دیکھا یہ وہی کرتا تھا جس کا دامن پیچھے سے پھٹا ہوا تھا۔

سب کے سامنے یوسف نے وہ پرانا پھٹا ہوا کرتا پہنا تو سب کو آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہاں یوسف کے بجائے انہیں نور کا ایک ہالہ نظر آیا تب یہ رمزان کی سمجھ میں آگیا سالہا سال پہلے یوسف نے اپنے باپ کو جو پھٹا پرانا کرتا بھیجا تھا تو اسے روشنی بھیجی تھی۔ زلیخا نے اپنا سر جھکا لیا اور یوسف سے بولی تو سچا ہے میں ہی نادان تھی کاش میں نے یہ کرتا نہ پھاڑا ہوتا۔

یوسف نے مسکرا کر کہا اگر تو وہ کرتا نہ پھاڑتی تو روشنی کرتے ہی میں رہتی تو نے وہ کرتا پھاڑا تو روشنی ہر طرف پھیلی گئی جب تک میں اپنے جسم کی قید میں تھا روشنی بھی قید تھی۔" پھر اس نے سب کو مخاطب کر کے کہا۔" ہم جب تک اپنی قید سے باہر نہ نکلیں خود

بھی تاریکی میں رہتے ہیں اور جب اپنی قید سے باہر آجاتے ہیں تو سب کو روشنی میں لے آتے ہیں۔"

اور اس لمحہ مصر کے لوگوں نے روشنی سے چکا چوند میں چند ھیائی ہوئی آنکھیں مل مل کر دیکھا تو وہاں نہ یوسف تھا اور نہ زلیخا تھی بس ہر طرف روشنی ہی روشنی تھی۔

***

الطاف فاطمہ

سون گڑیاں

تب وہ دن بھر کی تھکی ماری دبے پاؤں اس کوٹھڑی کی طرف بڑھتی' جہاں دن بھر اور رات گئے تک کام خدمت میں مصروف رہنے کے بعد آرام کرتی' اور پھر ایک بار ادھر ادھر نظر ڈالنے کے بعد کہ آس پاس کوئی جاگتا یا دیکھتا تو نہیں' وہ کوٹھڑی کے کواڑ بند کر لیتی' طاق پر سے ڈبہ اٹھاتی' اور کھول کر کوٹھڑی کے بیچوں بیچ دھر دیتی' اور پھر یکے بعد دیگرے گڑیاں نکل نکل کر اپنے اپنے کار سے لگ جاتیں۔ پہلے سقہ آتا' اور پانی چھڑک جاتا۔ پھر خاکروب آتا' اور جھاڑو لگا جاتا۔ فراش فرش بچھاتا۔ مسند تکیہ لگاتا' محفل سج جاتی' تب سون گڑیاں زرق برق لباسوں میں نمودار ہوتیں' اور رقص و سرود' ناؤ نوش کی محفل گرم ہوتی۔ تمام رات یوں گزرتی' اور صبح کا ستارہ ڈوبنے سے پہلے سون گڑیاں بے دم ہو کر گر پڑتیں۔ محفل درہم برہم ہوتی' اور جو جہاں ہوتا' وہیں رہ جاتا۔

تب وہ بی بی سرد آہ بھرتی۔ گڑیوں کو سمیٹ کر ڈبے میں رکھتی' اور کہتی:

"جو بی بی تھی' لونڈی بنی' جو لونڈی تھی سو بی بی بنی۔"

تو بس میں یہ کہانی یہیں تک سن پاتا تھا کہ بے سدھ ہو جاتا تھا۔ ہر رات میں نے اس امید پر یہ کہانی سننے کی ضد کی۔ کبھی تو سون گڑیوں کے انجام تک کہانی پہنچے گی ہی' اور ہر رات میں اس بی بی کے اس فقرے تک پہنچتے پہنچتے قصہ کہانی اور پریوں کے اصل دیس یعنی خواب کی دنیا میں پہنچ جاتا۔

اور اب ذہن میں اتنی دیکھی اور ان دیکھی' سنی اور ان سنی کہانیاں گڈمڈ ہیں کہ میں خود یہ تمیز نہیں کر پاتا کہ ان میں سے کون سی کہانیاں میں نے سنی ہیں' اور کون سی دیکھی ہیں۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میرے اندر اب حقیقتیں بھی کہانی بن کر آتی ہیں' اور اب نہیں کہہ سکتا کہ آگے جو بات میں بیان کروں گا وہ کس کہانی' کس داستان کا حصہ ہے۔ یہ کہانی اگر مجھے کسی نے نہیں سنائی' تو پھر یہ میرے اندر کہاں سے آئی ہے۔ اور یہ قصہ میرے اندر کچھ اس انداز میں سر اٹھاتا ہے۔

"وہ کہ اس ویرانے میں دشت نوردی کرتا تھا۔ بھوک لگتی تھی تو کھجور کے چند دانے نوش فرماتا' اور چھاگل سے چند گھونٹ پانی لے کر حلق تر کرتا۔ اور پھر آسمان کی طرف منہ اٹھا کر دیکھتا ہی چلا جاتا کہ ایسے ویرانوں میں آسمان اور بھی نیلا اور پراسرار نظر آتا ہے ـــــ پھر یوں ہوا کہ ایک صبح وہ یونہی فرش ریگ پر پاؤں پھیلائے بیٹھا تھا کہ پچھم یعنی مغرب کی جانب سے ایک آہنی چڑیا پرواز کرتی ہوئی اس طرف آئی' اور حد نظر کے اس طرف ٹھہر گئی۔ پھر ایک مرد سفید فام گندم گوں بالوں اور کنجی آنکھوں والا اس کی طرف تیز قدموں چلتا ہوا آیا ـــــ اور اس کی پھیلی ہوئی ٹانگ کو اپنی چھڑی سے چھو کر یوں گویا ہوا۔

اے جوان رعنا۔ یوں ٹانگ پسار کر بے فکری سے بیٹھا ہے۔ اٹھ کہ تیری دولت اس ریگ زار کے قلب میں موجیں مار رہی ہے۔ اٹھ کہ تیری جبین ستارہ ہوش مندی ـــــ نہیں میں بھولا۔ ستارۂ مراد مندی سے دمک رہی ہے۔ اے حاتم! مژدہ ہو کہ دونوں ہاتھوں سے دولت لٹائے گا' اور اپنے کاسہ لیسوں کی حرص و آز کا تماشہ کرے گا۔

تب وہ جوان نہایت حقارت سے یوں گویا ہوا کہ تیری تمام باتوں سے جھوٹ اور مکر کی بو آتی ہے۔ اول تو یہ کہ یہ عاجز عمر کے اس دور کو طے کر چکا ہے' جبکہ اس کو جوان رعنا کے لقب سے مخاطب کیا جائے۔ دوم یہ کہ تو نے مجھے حاتم کے نام سے پکارا کہ حاتم نام ایک شخص ہو گزرا ہے۔ بہت پہلے قبیلہ طے میں کہ اس کی داد و دہش کا چرچا سارے مشرق میں ہے۔ کہاں حاتم طائی' کہاں یہ عاجز و بے نوا' تب وہ سفید فام اس کی حقارت پر بڑے صبر سے مسکرایا' اور گویا ہوا مرد دانا کی بات کو مان۔ چون و چرا سے کام نہ لے۔ تیرے حصے کی دولت اور رعنائی کو ڈھونڈنا میرا کام ہے' اور تیرا کام فقط اس کو دونوں ہاتھوں سے لٹانا اور اس درجہ پھینکنا ہے کہ حاتم طائی کو بھی شرما دے تو مجھے فقط اجازت دے کہ کہ میں تیری دولت کی تلاش میں کنوؤں میں بانس ڈالوں' اور ان کو اچھی طرح کھنگالوں۔"

تو بس یہ کچھ اسی قسم کا قصہ تھا' جو کچھ دن سے میرے تحت شعور یا نہ معلوم کون سے شعور میں بھٹک رہا تھا۔ مگر ان دنوں کہ جب میں ابھی کالج میں زیر تعلیم تھا' اور گریجویشن کی تیاری کر رہا تھا' میرے خیال میں کبھی نہ آتا تھا۔ اور پھر جب میں نے امتحان میں تھرڈ ڈویژن لی۔ جب بھی ذہن کے کسی گوشے سے کبھی اس گوشے نے سر نہ اٹھایا' تو خیر اس وقت کی بات اور تھی' اور میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میری یہ تھرڈ ڈویژن اونٹ کے گلے میں بلی بن جائے گی۔ پھر پے در پے مجھ پر یہ انکشافات ہوئے کہ کلرکی کی پوسٹ

کے لئے میں نے درخواست خود ٹائپ کی تھی' اس کے لئے پانچ سو فرسٹ' بارہ سو سیکنڈ اور ہزاروں تھرڈ ڈویژن والے خواہاں تھے۔ چنانچہ اس پوسٹ کو اس لئے ابالش کر دیا گیا کہ جب ایک انار سو بیماریوں کی چارہ گری نہیں کر سکتا' تو اس کو خورد برد کر دینا ہی مناسب ہے۔ کلرکی کی اس نایاب پوسٹ کے علاوہ میں نے بحری' بری اور فضائی افواج کی بھرتی کے دفاتر سے بھی ہر قسم کے فارم حاصل کر کے پر کیئے تھے کہ سنا تھا کہ یہاں بھرتی کا بازار گرم اور نفری کی مانگ شدید ہوتی ہے۔ مگر وائے ناکامی اور ان دفاتر کے یکے بعد دیگرے کئی انٹرویو دینے کے بعد مجھ پر چند ضروری انکشافات ہوئے' یعنی یہ کہ میری نظر حد سے زیادہ کمزور ہے' اس لئے کم پاور والے بلب میں رات گئے تک غلط رخ بیٹھ کر پڑھنے کی بناء پر میری عینک کے شیشوں کے نمبر نفی کی جانب زیادہ مائل ہیں۔ پھر یہ کہ میرا قد کافی چھوٹا نکلا' یا پھر ضرورت سے زیادہ لمبا نکلا۔ اسی طرح میرا وزن بھی غیر مستقل پایا گیا' اور ان کے علاوہ جو میں نے پرائیوٹ انٹرویو دیئے' ان کے نتائج حسب ذیل رہے :

1- اس پوسٹ پر سلیکشن تو پہلے ہی ہو چکا تھا' اور یہ اشتہار تو فقط یہ جائزہ لینے کے لئے دیا گیا تھا کہ ملک میں بے روز گاری کے اعدادوشمار کیا ہیں۔
2- آپ کو دھکا دے کر اس دروازے میں داخل کرنے والا کوئی نہ تھا۔
3- عرصے تک بیمار رہنے کی بناء پر آپ کے اعصاب مشتعل یا پھر مضمحل ہو چکے ہیں' اور ایسی صورت میں ہم آپ کو ملک و قوم کی خدمت کا اہل نہیں سمجھتے۔

خلاصہ یہ کہ ہمیں افسوس ہے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ افسوس تو مجھے بھی تھا کہ اب مجھ میں سوتیلے چچا کی وہ چبھتی ہوئی نظریں برداشت کرنے کی قوت بھی گھٹتی جا رہی تھی۔ وہ مجھ پر اس لئے ڈالتے تھے کہ میرے دونوں ٹیوشنوں کی مجموعی آمدنی صرف تیس روپے بنتی تھی' اور یہ کہ مکان کا سارا کرایہ ان کو ہی دینا پڑتا تھا۔ ہم نے بجلی کے بل بھی ایک مدت سے ادا نہیں کئے تھے' اور سب سے زیادہ یہ کہ ہم ماں بیٹا ان ہی کی چھت تلے بیٹھ کر بغیر بگھری دال سے تندروی روٹیاں کھاتے تھے' تو ان کے وقار کو صدمہ پہنچتا تھا۔ چنانچہ وہ میرے دل سے بہی خواہ تھے' اور یہ ان کی دلی آرزو تھی کہ میرے کھانے میں کم سے کم ڈالڈا گھی ہی شامل ہو۔

تو یہ ٹھیک ہی تھا کہ وہ ان دنوں میری ماں پر بری طرح گرجتے برستے تھے کہ اپنے ساتھ لڑکے کے دماغ بھی عرش معلی پر پہنچا رہی ہے' اور جو یہ سوچو کہ میرے لڑکے کی برابری کرو' تو میرے لڑکے کی بات اور ہے میں نے ان پر احسان کیا تھا۔ بس احسان ہی سمجھو۔ وہ

احسان کی تفصیلات میں جانے سے انکاری تھے۔

تو انہوں نے یہ گرما گرمی جن دنوں دکھائی' ان دنوں شہر میں ایک عجیب و غریب ہوٹل کھلنے کا چرچا تھا' کہ اس کے متعلق جو بھی بات سنی' ایسی کہ یقین نہ آئے۔ ایسے جیسے احمقوں کی خیالی جنت کی بات' اور چچا نے اپنی یا میری اس جنت کا ذکر کئی دن اس طرح لگاتار کیا کہ مجھے ان کی اور اپنی دونوں ہی کی دماغی صحت پر شک ہونے لگا۔ اور پھر ایک دن وہ آیا کہ وہ میری ماں پر پچھلے تمام دنوں سے زیادہ بڑھ چڑھ کر گرجے برسے' اور پھر انہوں نے ان کو دھمکی دی کہ عدم تعاون کی صورت میں ان کا آخری فعل یہ ہو گا کہ وہ ہمارا سامان اٹھا کر گلی میں پھینک دیں گے۔

چنانچہ پھر خشک ہونٹوں' سوکھی آنکھوں اور تھرتھراتے جسم کے ساتھ ماں نے عہد کیا کہ وہ جس بات میں ان کا تعاون مانگتے ہیں' وہ ان کو ملے گا۔ البتہ بات تو پتہ چلے کہ کیا ہے۔

چنانچہ وہ بات یہ پتہ چلی کہ بھرتی ہونے کے بعد میں اپنا چھوٹا سا ٹرنک اٹھا کر تیز گام کی تلاش میں اسٹیشن کی جانب روانہ ہوا تاکہ بڑے شہر جا کر اس بڑے ہوٹل میں ویٹر اور بٹلر کی باقاعدہ تربیت لینے اور بحیثیت اپرنٹس کام کرنے کے بعد یہاں واپس آکر اپنے اس معزز عہدے کا چارج سنبھالوں کہ ایک تھرڈ ڈویژن میں پاس گریجویٹ تو اس تنخواہ کا تصور خواب و خیال میں بھی نہیں کر سکتا۔

تب میں نے اس شہر کی جاگتی جگاتی راتوں میں بارہا سون گڑیوں کی کہانی کو نہیں معلوم کہ سنا' دیکھا یا سوچا تھا' اور میرا خیال تھا کہ یہ سون گڑیاں اور ان کا خیال مجھے فقط اسی شہر کی روشن راتوں میں ستاتا ہے' جس کی سڑکیں اور شاہراہیں دن کو نسبتاً خاموش اور چپ چاپ نظر آتی ہیں۔

میں اس نئی زندگی میں خاصا فٹ ہو گیا تھا' اس لئے کہ اب وہ گھٹنوں پر سے گھسی ہوئی پتلون میں نے ایک سائل کو دے دی تھی' اور مارکیٹ کی دوکانوں میں سجی رہنے والی کئی پتلونیں اب میرے اپنی ملکیت تھیں' اور پھر یہ کہ ٹریننگ اور کام کے دوران ہم کو عجیب و غریب قطع کی اور رنگوں کی یونیفارم پہننے کو ملتی تھیں' جن میں ہمارے رنگ روپ تو خاصے چمک جاتے تھے۔ لیکن ان کو پہن کر ہم میں سے اکثر کو اپنے اسکول اور کالج کے دنوں میں مسخروں اور احمقوں کے وہ بہروپ اور لباس یاد آجاتے تھے' جن کو پہن کر ہم کالج اسٹیج پر دندناتے پھرتے تھے' اور ناظرین پر اپنے ٹیلنٹ (Talent) کی دھاک بٹھایا کرتے۔ چند خر دماغ لڑکے ہمارے تربیتی گروپ میں ایسے بھی شامل تھے' جو اس رنگا رنگ یونیفارم،

کو نہ پہننے اور محض سفید قمیض پتلون میں سروس کرنے پر مصر ہوئے۔ یہ ایک اچھا خاصا ہنگامہ رہا' تاوقتیکہ ان کے ہاتھ میں برخواستگی کے پروانے نہ تھما دیئے گئے۔ ہم جیسوں نے ان کو حیرت کی نظر سے دیکھا وہ اپنی مارکیٹ سے خریدی پتلونوں کے بنڈل سمیت اس وسیع و عریض شہر کی سڑکوں پر دھکے کھانے روانہ ہو گئے۔

تو چنانچہ ایک دن ایسا بھی آیا کہ میں چند سو روپوں کے علاوہ کٹ پیس کے کئی اچھے ٹکڑوں اور احمر کے حلوے سمیت پھر اپنے شہر واپس آیا' اور دوسرے دن اپنی والدہ سمیت اس موجودہ فلیٹ یعنی دو کمروں میں منتقل ہو گیا۔

اس فلیٹ کے فرش صاف ہیں' اور اس میں ایک نئے بنے ہوئے نعمت خانے میں کئی طرح کی کھانے کی چیزیں رکھی مل جاتی ہیں۔ دیوار میں جو الماریاں ہیں' اس میں سچ مچ کے کپڑے یعنی میرے اپنے خریدے اور سلوائے ہوئے لباس موجود ہیں۔ مگر اب قصہ یہ ہے کہ فرزانہ مجھ سے نہیں ملتی۔ پہلے وہ چچا کے گھر آتی تھی تو میں اس کے ڈر سے اپنے پرانے جوتے اور خستہ کوٹ چھپاتا پھرتا تھا' اور اب تو میرے دو جوڑے جوتے سامنے ہی شوریک پر رکھے رہتے ہیں' اور میرا اوور کوٹ سامنے کھونٹی پر ٹنگا ہوا ہے۔

مگر فرزانہ بدستور ناراض ہے۔

وہ مجھے ملتی تو میں اس سے کہتا' آؤ تمہیں سون گڑیوں کی کہانی سناؤں۔ مگر یہ کچھ ایسا چلتا پھرتا وقت ہے کہ کون کسی کی سنتا ہے' اور کون سننے کے قابل بات بولتا ہے۔ اور اب تو مجھے اتنی بھی تمیز نہیں کہ کون سی کہانی سنی تھی' کون سی دیکھی تھی' اور کون سی خود سوچی تھی۔

زندگی کی روازوی میں ساری کہانیاں گڈمڈ ہو رہی ہیں' اور ہم صبح سے رات تک مختلف شفٹوں کی شکل میں رنگ برنگی مسخری وردیوں میں بے تحاشا کھانوں سے لبریز ظروف سے لدی پھندی میزوں کے ارد گرد منڈلاتے' اور کھانے والوں کو چندھیاتے رہتے ہیں' جو اس فکر میں رہتے ہیں کہ کس طرح اپنے دس روپے فی کس کو زیادہ وصول کر لیں۔

ہم یہاں کھانے والوں کو چندھیائیں' یا پھر ان کے سامانوں اور مقفل کمروں کے رکھ رکھاؤ کا خیال رکھیں' جو ادھر سوئمنگ پول کے ادھر ادھر رنگ برنگی کرسیوں پر کم لباسی اور بے فکری کے ساتھ دھوپ میں پڑے (Tan) ہو رہے ہیں' یعنی اپنے آپ کو بھورا کر رہے ہیں' مگر کیوں؟ گندم گوں بالوں' کنجی آنکھوں والے سفید فام کس خبط میں مبتلا ہیں؟ میں نے ابھی ابھی سوچا تھا' اور ساتھ ہی میرے ذہن میں وہ کہانی ابھری ہے۔ میں اور

میرے ساتھی جو ہر وقت اس خوف میں مبتلا ہیں کہ کبھی کہیں ان میزوں پر آکر وہ لوگ نہ بیٹھ جائیں، جو ہمارے ہم جماعت ہم پیالہ ہم نوالہ ہوا کرتے تھے، تو پھر اس خیال سے بچنے کے لئے ہم خوب سوچتے ہیں، حتیٰ کہ چیزیں جو ہمیں پکڑائی جاتی ہیں، ہمارے ہاتھوں سے پھسل پھسل جاتی ہیں۔

تو چنانچہ پھر وہ کہانی یوں گڈمڈ ہوئی کہ ان دنوں میں حاتم دوراں کی آمد آمد کا غلغلہ بلند ہوا کہ اس کو کسی مرد دانا نے مژدہ دیا تھا۔ اور دولت کو دونوں ہاتھوں سے لٹانے کی تلقین کی تھی۔ پھر اس کا شکار یہ ٹھہرا کہ سردیاں گرم مشرقی علاقوں کے سیرو شکار میں گزرتیں، اور گرمیاں ارض مغرب کے نشاط خانوں میں اور باقی وقت اسی ویرانے میں شکرے، چڑیوں کے شکار میں گزر جاتا، لیکن اس کے اردگرد لوگ جمع رہتے کہ وہ اہل طمع کا تماشہ کرے۔

چنانچہ وہ جوان رعنا کہ اپنی عمر کے چالیس سے اوپر کئی سال گزار چکا تھا، آیا اور بڑی شان سے آیا پھر اس نے اہل طمع کا تماشہ کیا، اور ہم نے اس کا اور سب کا تماشہ کیا کہ اس دور کے حاتم کا دستور بھی نیا تھا۔ کہ جس کے پاس ہے، اس کو دیا جائے گا۔

چنانچہ جس کے پاس تھا، انہوں نے اس کے گرد حلقے کو تنگ کیا، اور پھر اس حلقے میں سون گڑیوں کا عمل دخل ہوا کہ نئے حاتم کے اردگرد حلقہ ڈالنے والوں اور مصاحبین کو محفل طرب بھی جمانا تھی۔

چنانچہ سون گڑیوں کی کہانی میرے ذہن میں یوں گڈمڈ ہوئی کہ اب آدھی رات کو کوئی بی بی ڈبہ نہ کھولتی بلکہ یوں ہوتا کہ آدھا پہر دن ہونے کے بعد ہم ازسرنو میزیں سجاتے۔ پھول دانوں کے پھول بدلتے مشروبات کے دور تیار کرتے۔ اور تب وہ مرد حاتم اور اس کے ساتھی نیچے آتے، اور سون گڑیاں ازخود نظر فریب اور دلربا لباسوں میں آکر اس کے اردگرد گھیرا ڈال لیتیں، اور اس حلقے کے باہر ایک اور گھیرا تیار ہوتا کہ وہ اہل عرض اور اہل طمع اور مرد حاتم کے ساتھی سون گڑیوں کے ساتھ ہنگامہ و ناؤ نوش تیار کرتے، اور اچھا وقت گزراتے اور اچھا ہاتھ مارتے۔ یہ سب کچھ ہوتا، مگر مرد حاتم اس سب کے عین وسط میں ایک ننھے سے نیوکلس کے مانند تنہا اپنے گرد عمل ضربی کو تیزی سے مصروف کار دیکھتا، تماشہ کرتا، اور مسکراتا، کہ اس کا کام اور مقصد ہنگامہ ناؤ نوش برپا کرنا نہ تھا، بلکہ اہل عرض کا تماشہ کرنا تھا، اور سون گڑیوں کی بے بضاعتی پر مسکراتا تھا وہ اہل غرض اور اس کے مصاحبین کے درمیان وسیلہ بن کر اپنے آپ میں بہت بالا تھیں۔

کہانی جب یوں گڈمڈ ہوئی، تو میں اپنے ساتھی کو کہ میں اور وہ مرد حاتم کی شب و روز

خدمت پر مامور ہوئے تھے کہتا۔

دوست میں تم کو ان گڑیوں کی کہانی نہیں سنا سکتا، جو آدھی رات کو ٹین کی صندوقچی سے نکل کر طرب جماتی تھیں۔ اب تم ان سون گڑیوں کو دیکھو کہ دن کے اجالے اور شام کے جھٹ پٹے میں بے محابا محفلیں برپا کرتی ہیں اور کسی کو ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ ادھر ادھر دیکھ کر اطمینان کرے کہ کوئی دیکھتا تو نہیں، اور یوں میرے ذہن میں ان سنی کہانی ابھرتی کہ مجھے اعتراف ہے کہ داد و دہش کے اس سلسلے میں میرا بھی حصہ رہا۔ اور میری ساری جیبیں بہت گرم رہنے لگیں۔ تب ہم نے ایک اور فلیٹ بدلا، اور میں نے اور میری ماں نے سوتیلے چچا سے یوں ترک تعلق کیا کہ مبادا وہ اپنے اس احسان کے بدلے چکانے ہمارے پاس آجائیں، جو انہوں نے آخری مرتبہ وہ ہنگامہ کر کے مجھے یہاں فٹ کروا کر کیا تھا۔

لیکن فرزانہ کا معاملہ قدرے پیچیدہ تھا کہ ہمارے نئے فلیٹ میں پہنچنے کے بعد اس کے رویہ میں نرمی آگئی تھی، اور اس نے بار بار یہ کہنا چھوڑ دیا تھا، کہ "مگر تمہاری عزت کیا ہے۔"

اب تو کئی بار وہ خود مجھ سے ملنے آئی تھی، مگر قصہ یہ ہے کہ میں نے سون گڑیوں کی کہانی "چشم دید" طور پر دیکھی اور ان کی قوتوں اور بالادستی کا نظارہ کیا۔ اب مجھے صبح کا ستارہ ڈوبنے سے پہلے ٹین کی پٹاری کو بند کرتے کرتے۔ جو رنڈی تھی، سو بیوی بنی، جو بیوی تھی، وہ باندی بنی۔ کہنے والی خاتون سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ میرا تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے والے تمام دوستوں کا فیصلہ یہی تھا کہ اس ڈگری اور ایسی احمق خاتون کہ بیوی سے لونڈی بن جائے، کے مقابلے میں سون گڑیوں بدرجہا بہتر ثابت ہوتی ہیں۔

مگر یہ رموز فرزانہ جیسی لڑکیوں کی سمجھ میں کب آسکتے ہیں کہ صبح صبح کالی نقاب منہ پہ ڈال کر اور داہنے ہاتھ میں نوٹس کی کاپی اٹھا کر وہ اپنے مستقبل کے اجالوں کی تلاش میں بسوں کے دھکے اور کنڈیکٹروں کی گھرکیاں کھانے گھر سے نکل پڑتی ہیں۔

جب کہ سون گڑیاں۔

خیر سون گڑیوں کی بات اور ہے میں ایسی ہی ایک پٹاری کی تلاش میں ہوں کہ جس میں ایک یا کئی سو گڑیاں بند ہوں۔

***

ام عمارہ

درد افزوں سہی

ناجیہ میری جان! اب چپ ہو جاؤ پیاری!! کیا تم نے ان نرگسی کٹوروں کی ساری شراب ضائع کر دینے کی قسم کھائی ہے جنہیں تمہارے محبوب نے ساغر شراب اور بادۂ گلابی سے تشبیہ دی ہے اور جن کے بارے میں وہ اب تک کہتا رہا ہے کہ ناجیہ کی آنکھیں تو ایسی ہیں جیسے کنول کی پنکھڑیوں پر بھونرے، بیٹھے ہوں۔

ذرا سوچو تو جب اسے پتہ چلے گا کہ ناجیہ نے اپنی آنکھیں رو رو کر خراب کر لی ہیں اور اب وہ آنکھیں اپنی تمام دلکشی کھو چکی ہیں تو یقین جانو اسے بہت رنج ہو گا۔ کیونکہ اسے تمہارے ساتھ تمہاری آنکھیں بھی بہت پیاری ہیں۔

ہاں ہاں! یہ ٹھیک ہے کہ اب آنکھیں اس کی نہیں ہو سکیں گی۔ لیکن پیاری میں سچ کہتی ہوں (کم از کم میرے خیال میں) تمہارے محبوب کا پیار بھونرے کا نہیں جو پھول سے اس کا طالب ہو بلکہ اس کا پیار تو بلبل کا ہے، لیکن بھئی بلبل کا پیار سچا سہی لیکن اس کی تشبیہ پرانی اور روایتی ہے، اور میں اسے کسی نئی چیز سے تشبیہ دینا چاہتی ہوں، اس لئے ڈیر ! تم ذرا چپ ہو کر کوئی نئی تشبیہ سوچنے میں میری مدد کرو، اچھا تو تم کہہ رہی ہو کہ "مارے غم کے میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے اور میرے دماغ میں کسی نئی چیز کے سوچنے کی صلاحیت نہیں" خیر بھئی مت سوچو لیکن تم مجھے بھی تو سوچنے کی مہلت نہیں دے رہی ہو۔ سوچو تو میری جان!! میں تمہیں کب سے کہہ رہی ہوں کہ آخر یہ صرف تمہارے ہی ساتھ تو نہیں ہوا۔ بلکہ ہمارے اس فرسودہ معاشرے میں تو ہمیشہ سے ایسا ہوتا آیا ہے۔

مت روؤ بھئی ! مت رو !! اب میرا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ اگر تم اسی طرح روتی رہیں تو میرے سوچنے کی تمامتر صلاحتیں یکدم مفقود ہو جائیں گی۔

اور پھر یہ کوئی ایسا غم بھی تو نہیں جیسے ہمارے آس پاس یہ ہزاروں غم جو بکھرے پڑے ہیں کبھی تم نے ان کے بارے میں بھی سوچنے کی کوشش کی۔ آخر ان دکھوں کی بھی تو کوئی وجہ ہو گی۔ آؤ نا پیاری ہم اپنا غم بھلا کر ان بے شمار غموں کے بارے میں سوچیں جو

ہمارے ارد گرد بکھرے پڑے ہیں۔ کیا کہا؟ تمہیں ان دکھوں کے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں کیونکہ تمہیں اپنا غم بہت ہے؟ لیکن ڈیر تمہارا غم تو یہی ہے نا کہ تمہیں نیر سے الگ کیا جا رہا ہے اور یہ تمہارے لیے بہت کٹھن ہے۔

مگر سوچو تو اس کے سوا تمہاری امی بیچاری کر بھی کیا سکتی تھیں۔ تمہارے علاوہ اور کوئی دوسرا سہارا بھی تو ان کا نہیں تھا جس کا وہ آسرا کرتیں۔ وہ تو ایسا کرنے پر مجبور تھیں۔ ان کو تمہارے علاوہ ارشد' حامد اور ناشیہ کا بھی تو خیال ہے' جن کے لئے تمہارے ابو کچھ بھی نہیں کر گئے۔ اس لئے اگر تمہاری امی نے تمہیں نیر سے منسلک کرنے کی بجائے اس سے الگ کر دیا تو کیا بے جا ہے! تمہیں تو اپنی اس قربانی پر خوش ہونا چاہیے جس سے تمہارے معصوم بہن بھائی کا بھلا ہو۔ تو تم کہہ رہی تھیں کہ "تم اتنی بہادر نہیں ہو کہ اپنی خوشی دوسروں کی ضرورت پر قربان کر کے خوش رہ سکو۔" لیکن میری جان! اب رونے سے کیا فائدہ' جبکہ تم اچھی طرح جان رہی ہو کہ بات اپنے قابو سے نکل چکی ہے۔ اب تو تمہیں خوش ہی رہنا چاہئے۔ سنو تو بھئی —— میری طرف دیکھو نا —— میں کیا کہہ رہی ہوں —— اونہہ —— تم تو بس روئے جا رہی ہو۔ میری کچھ سنتیں ہی نہیں —— دیکھو تم —— آخر اسی بلڈنگ میں تمہارے فلیٹ کے اردگرد بہت سے لوگ بھی بستے ہیں جو تم سے کہیں زیادہ دکھی ہیں لیکن پھر بھی وہ اپنے آپ کو خوش و خرم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تمہاری طرح رو رو کر اپنے دکھوں کا اعلان نہیں کرتے۔

اسی چائے کے ایجنٹ اور اس کی بیوی کو لے لو نا جو تمہارے فلیٹ کے بعد والے میں رہتے ہیں۔ کتنے ہیں وہ۔ اس کی بیوی کے خمیدہ لبوں پر ہمیشہ ایک کراہ پنہاں رہتی ہے۔ بتاؤ تو تم نے آج تک یہ سوچا کہ آخر وہ بارہا اتنی اداس کیوں رہتی ہے اور ایک اداس مسکراہٹ اس کے چہرے پر کیوں رقصاں رہتی ہے جبکہ اس نے تمہیں بتایا کہ اس کا شوہر کبھی اس کا محبوب بھی رہ چکا ہے۔ لیکن وہ آج اپنے محبوب کے ساتھ زندگی گذار کر بھی کیوں خوش نہیں ہے۔ بظاہر تو کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی لیکن جہاں تک میرا خیال ہے اقتصادی بدحالی نے ان کی محبت کی کمر توڑ دی ہے۔ کیونکہ جب کل میں تمہارے کمرے میں تھی تو ان کی گفتگو کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس لئے کہ وہ اس کمرے میں گفتگو کر رہے تھے جو تمہارے کمرے سے ملا ہوا ہے اور ان کی آواز اتنی بلند تھی کہ انسان ان کی ساری باتیں سننے پر مجبور ہو جائے۔ اس کی بیوی ایک ساری کا تقاضا کر رہی تھی جس کے لانے کا وعدہ ایک ہفتہ قبل کر چکا تھا لیکن اس کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ

جارجٹ کی ایک معمولی سی ساری لا کر اپنی بیوی کو خوش کر سکتا۔

اور اب اس کی محبوبہ یا بیوی جو کھو اس سے بدگمان ہوتی جا رہی ہے کہ اب وہ اس سے ویسی محبت نہیں کرتا ہے جیسی پہلے کیا کرتا تھا۔ اس کی بیوی یہ نہیں سوچتی کہ اس کا محبوب سیدھا سادا سا ایجنٹ ہے جو اس کے لیے جان تو دے سکتا ہے لیکن اس کی نت نئی فرمائشیں پوری نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ ایک محبوب نہیں بھائی بھی ہے۔ اور صرف بھائی ہی نہیں' بیٹا بھی ہے اور بیک وقت بیٹا' بھائی اور محبوب بننے کے لئے کمپنی کی ایجنٹی کافی نہیں اور اسی لیے وہ بہت ساری چیزیں جان بوجھ کر بھول جاتا ہے اور اس کی بیوی اس سے بدگمان ہوتی جا رہی ہے کہ وہ اس سے اتنا پیار نہیں کرتا جتنا کہ پہلے کرتا تھا۔ بقول تمہارے بارہا ان دونوں کی ان بن ہو جاتی ہے اور وہ ہفتوں ایک دوسرے سے روٹھے رہتے ہیں اور اس درمیان اس کی خوبصورت بیوی مسلسل پریشان اور روکھی سی دکھائی ہے۔ اس کے لبوں کی وہ اداس مسکراہٹ کہیں کھو جاتی ہے اور وہ بھی اداس اداس رہتا ہے اور پھر جب وہ آپس میں میل کر لیتے ہیں تو جیسے ان کی زندگی میں بہار آ جاتی ہے۔ وہ چہکنے لگتے ہیں لیکن چہکنا بھی ان کا گھڑی دو گھڑی کا ہوتا ہے۔

اور پھر وہی اداسی وہی خاموشی ان کے درمیان تیرتی رہتی ہے تو کیا سچ مچ وہ اپنی بیوی کو اب نہیں چاہتا ہے۔ نہیں بھئی یہ بات نہیں ہے' وہ اب بھی اسے چاہتا ہو گا۔ وہ ان خوابوں کو جو (شادی سے پہلے اس نے دیکھے ہوں گے) اپنی زندگی میں سمو کر اسے خوشگوار سے خوشگوار تر بنا دینا چاہتا ہو گا۔ لیکن موجودہ بدحالی اس کی خوشگوار زندگی اور محبت کی دنیا میں ایک مسلسل عذاب بن کر شامل ہو چکی ہے' جس کی بدولت وہ خوش و خرم رہنے کی کوشش کرتے ہوئے بھی خوش نہیں رہ سکتا۔ اور یہ ان دونوں کے لئے کتنے صدمے کی بات ہے کہ وہ ایک دوسرے کے قریب رہتے ہوئے بھی خوش نہیں ہیں۔ اور اسے کتنا دکھ ہوتا ہو گا جب وہ یہ دیکھتا ہو گا کہ اس کی بیوی کے لبوں پر مسکراہٹ کی جگہ ایک نہ مٹنے والی کراہ قبضہ جمائے ہوئے ہے۔ دیکھو تو ڈیر! وہ کتنے دکھی ہیں۔ اگرچہ بظاہر ان کا کوئی دکھ نہیں ہے۔ لیکن حالات نے انہیں دکھی بنا دیا کیوں؟ میں سچ کہہ رہی ہوں نا۔ اسی طرح ہو سکتا تھا کہ تم بھی اپنے محبوب کے ساتھ خوش نہ رہ سکتیں کیونکہ تم بھی اس ایجنٹ کی بیوی سے کچھ کم عقلمند نہیں ہو' اور یہ صرف تم پر ہی موقوف نہیں' اس قسم کی سب لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ کیا۔؟ اوہ —— کوئی بات نہیں —— میں جیسی بھی ہوں تم لوگوں سے مختلف —— یہ تو ماننا ہی پڑے گا۔ بہرحال میں کہتی ہوں بھئی کہ تم سچ مچ نیر کے ساتھ خوش

نہیں رہ سکتی تھیں کیونکہ وہ بھی ایک معمولی انسان ہے جو تمہارا محبوب ہے۔ اپنی امی کا پیارا بیٹا ہے اور شیما کا پیارا پیارا بھیا ہے اور صرف ایک سو پچاس روپے حاصل کرتا ہے جو اس کے اپنے اخراجات کے لئے مشکل سے کافی ہوتے ہیں۔ کیا کہا؟ "تم اس کے ساتھ ہر حال میں خوش رہ سکتی تھیں۔" اتنی جذباتی مت بنو! تم جانتی ہو نا کہ زندگی کے تقاضے خواب و خیال نہیں

اور تم اپنی ضروریات تو نہیں بھلا سکتی تھیں۔ تمہیں ان کو پورا کرنے کی خواہش ہوتی اور جب بیچارا نیر کسی مجبوری کی بناء پر تمہاری فرمائشیں پوری کرنے سے قاصر رہتا تو تم اداس ہو جاتیں کہ تمہارا محبوب اب تم سے ویسی محبت نہیں کرتا جیسی پہلے کرتا تھا اور تم بدگمان ہو جاتیں اور یہ بدگمانیاں دن بدن ترقی کرتی رہتیں۔ یہاں تک کہ تمہارے درمیان بدگمانیوں کی ایک بڑی خلیج حائل ہو جاتی (جیسی کہ اس ایجنٹ اور اس کی بیوی کے درمیان حائل ہے) لیکن تم یہ بھلا کاہے کو سوچتیں کہ نیر ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ اس کے سامنے تمہاری خواہشوں کے علاوہ چند ایسی ضرورتیں بھی ہیں جن کے تقاضے اسے تمہاری خواہشوں پر ترجیح دینے پر مجبور کرتے ہیں۔ اگرچہ اسے یہ سوچ کر افسوس بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ بیوی کی معمولی سی خواہش بھی نہیں پوری کر سکا۔ مگر تم تو بس یہی سوچتیں کہ نیر اب تم سے ویسی محبت نہیں کرتا جیسی پہلے کرتا تھا۔

تم کہہ رہی ہو کہ مجھے کیا پتہ کہ تم یہ سب کچھ نہیں سوچتیں، تو پیاری یہ تو مجھے اسی وقت پتہ چل گیا تھا جب معلوم ہوا کہ تم نے یہ سنکر کہ تمہیں عبید کے ساتھ منسلک کیا جا رہا ہے اپنی امی کے خلاف احتجاجاً رونا شروع کر دیا۔ میں تو پہلے ہی سے جانتی ہوں کہ تم جذباتی ہو اور جذبات کی رو میں بہہ جانا تمہاری پرانی عادت ہے۔ بس تمہیں عبید کے بارے میں خبر ملی اور تم نے واویلا مچا دی۔ یہ ٹھیک ہے بھئی کہ یہ چیز تمہارے لیے ناقابل برداشت ہے اور تمہاری امی ایک طرح سے تم پر ظلم کر رہی ہیں۔ ہاں! ہاں!! یہ بھی ٹھیک ہے کہ وہ تمہاری معصومیت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ لیکن میری جان! بہت سی مجبوریاں ایسی بھی انسان پر آ پڑتی ہیں کہ وہ بے بس ہو جاتا ہے اور جائز و ناجائز کچھ بھی نہیں دیکھتا۔

مثلاً ایک بہت بھوکے انسان کے سامنے روٹی کا ٹکڑا پھینک دو اور پھر دیکھو کہ وہ آنکھ بند کر کے روٹی پر کیسے جھپٹ پڑتا ہے، بالکل اسی طرح تمہاری امی نے کیا ہے اور انہوں نے جو بھی کیا مجبوریوں کے تحت کیا اور اسی برتے پر کیا کہ ناجیہ یقیناً بہت آسانی سے

برداشت کر سکتی ہے۔ ارے نہیں بھئی! مجھے تمہاری امی نے اپنی وکالت کرنے نہیں بھیجا ہے بلکہ میں تم سے خود کہہ رہی ہوں کہ آنسوؤں کی بارش کو روک کر ذرا ٹھنڈے دل سے کچھ سمجھنے کی کوشش کرو کہ آخر تمہاری امی نے ایسا کیوں کیا اور وہ کونسی وجہ تھی جس نے انہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا۔ تم کہتی ہو کہ وہ نیر کو ناپسند کرتی ہوں گی' اس لیے انہوں نے ایسا کیا؟ درحقیقت ایسا نہیں ہے میری بنو' ایک حد تک تمہاری امی نے ضرورتوں کے تحت تمہیں نیر سے الگ کر دیا ہے کیونکہ انہیں تمہاری خوشی کے ساتھ ساتھ تمہارے بہن بھائی کا مستقبل بھی عزیز تھا۔ جب انہیں تمہاری خوشی منظور تھی تو نیر کو پسند اور ناپسند کرنے کا ذکر بیکار ہے جیسا کہ انہوں نے بتایا وہ بارہا سوچا کرتی تھیں کہ انہیں نیر کے ساتھ بیاہ دیں گے لیکن حامد' ارشد اور ناصیہ کی نوخیز جانیں ان سے اپنے نشوونما کے بارے میں بار بار کہہ رہی تھیں کہ "اگر تم نے ناجیہ کی خواہش پوری کر دی تو ہمارا کیا بنے گا۔ "ابو" تو ہمارے لئے کچھ بھی نہیں کر گئے ہیں۔ اگر تم آپا کی خوشی کا خیال نہ کرو تو ان کی بدولت ہمارا مستقبل بھی سنور سکتا ہے' کیونکہ عبید بھائی کافی دولت مند ہیں اگرچہ تمہاری امی نے ان سوالوں کو پس پشت ڈالنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن حالات نے انہیں پریشان بنا رکھا تھا اور وہ ان مستقبل تقاضوں کو جو سوتے جاگتے ان کے دماغ میں سوئیاں سی چبھوتے رہتے تھے' باوجود کوشش کے بھی ان سے منہ نہ موڑ سکیں' جنہیں سوچ سوچ کر بوکھلا جاتی تھیں پھر انہوں نے ایک فیصلہ کر لیا اور تم ہو کہ اس فیصلے کو سن کر بے سوچے سمجھے روئے جا رہی ہو۔ اور میں ہوں کہ تمہارے ساتھ مستقل مغزماری کر رہی ہوں تم بس ایک ہی رٹ لگائے جا رہی ہو' امی نے مجھ پر ظلم کیا ہے' میں انہیں کبھی معاف نہیں کر سکتی۔" میں کہتی ہوں ناجیہ تم پر تو وہی مثال صادق آتی ہے کہ "ساری رام کہانی کہہ سنائی پھر سیتا کس کی جورو۔" اگر تمہاری امی نے ظلم بھی کیا اور بے بس ہو کر۔ انہوں نے صرف تمہاری خوشی پر تین جانیں قربان کرنے کی بجائے اگر تمہاری خوشی ان تین زندگیوں پر قربان کر دی تو کیا غلط کیا۔

اب تم کہہ رہی ہو کہ "امی نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ مجھے کوئی شکایت نہیں۔" لیکن تم تو اب تک روئے جا رہی ہو۔ سنو تو بہن—— آخر کب تک تم یونہی روتی رہو گی۔ دیکھو تو ڈیر!—— تمہیں سمجھاتے سمجھاتے میرا حلق سوکھ گیا۔ اوہ تمہیں افسوس ہے کہ نیر کہے گا کہ ناجیہ نے بیوفائی کی' وہ تم سے بدگمان ہو جائے گا اور آزردہ ہو کر تم سے پھر کبھی نہیں ملے گا؟ مگر ڈارلنگ! عبید سے شادی کے بعد تو اس سے ملنے کا سوال ہی تمہارے لیے بیکار

ہے اور تمہاری بے وفائی کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ کبھی بھی تمہیں بے وفا نہیں کہے گا' کیونکہ میرے خیال میں (کم از کم) نیر تمہاری طرح جذبات کی رو میں بہہ جانے والا انسان نہیں اور زندگی کے ٹھوس اور اہم مسائل کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ اگر وہ یہ سب کچھ سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو اب سے کتنے ہی دن پہلے جب تمہارے ابو زندہ تھے اور نیر ایک ٹائپسٹ کی بجائے اپنے کالج کا ہونہار طالب علم تھا تو تم سے شادی کر کے اپنا گھروندہ بسائے رہتا۔ لیکن اس وقت اس کے سامنے کچھ ایسے حل طلب مسائل تھے جنہوں نے اس وقت اسے شادی کرنے کی اجازت نہیں دی اور وہ تمہاری طرف انتظار بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ اور اب جبکہ وہ ایک سو پچاس روپے کا ٹائپسٹ ہو چکا ہے اور کسی حد تک تم سے شادی کرنے کے لیے تیار بھی ہے تو تم لوگوں کی حالت اس لائق نہیں ہے۔

وہ بھی حالات کا غلام رہ چکا ہے اور جانتا ہے کہ زندگی کے تقاضے بہت اہم ہوتے ہیں اور کسی قیمت پر بھی انہیں پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا ہے۔ اسی لیے وہ تم سے بدگمان نہیں ہوگا کیونکہ تم لوگوں کی حالت اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔

تم ٹھیک کہہ رہی ہو کہ اس واقعہ سے تمہاری زندگی مجسم درد ہو جائے گی اور اس درد کی وجہ سے اس میں ایک نہ جانے والی تلخی آجائے گی لیکن ناجیہ میری پیاری یہ تو تم اچھی طرح جانتی ہو نا کہ دوسری صورت میں بھی بہت سے غموں کا سامان ہے اور شاید اس درد کی صلاحیت بھی مٹ جائے۔ مفلسی کا علاج بھی تو کرنا ہے۔ درد افزوں سہی ناقابل درماں نہ سہی

***

رشیدہ رضویہ

بیس منٹ کی جنت

جوتے کے تسمے جب نہیں کھلے۔ تو شوہر نے سنگھار میز سے قینچی اٹھا کر تسمے ہی کاٹ ڈالے۔ تقریباً پندرہ منٹ سے وہ تسموں سے الجھ رہا تھا۔ اب یہ تو بیوی کا فرض تھا کہ اس کام میں اس کی معاون ثابت ہوتی۔ جب کہ بیچارے کے جوتے پانی میں تر بھیگی بلی کی نچی کھچی سی دم کی مانند ہو گئے تھے۔ اور قیمتی پتلون کے پائینچوں پر یہ گھٹنوں تک کیچڑ لگا تھا۔ سڑک پر بہتے پانی کے گندے تالاب میں جب موٹر پھنس گئی تھی' تو اسے خود ہی دھکے لگانا پڑے تھے۔ کسی کو اس کی پریشانی کی قطعی پروا نہ تھی۔ ہر شخص اپنی فکروں کے پختہ مزار خود ہی اپنے کندھوں پر اٹھائے اٹھائے پھر رہا تھا۔

جوتے دور پھینک کر شوہر کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ پانی میں بھیگا بھیگا وہ کس قدر مضحکہ خیز نظر آرہا تھا۔ گویا دم کٹا لومڑ ہو۔ جو اپنی دم کٹنے کا افسوس کرتا ہو۔ لمحہ بھر کے لئے عونیہ کو ہنسی آگئی۔ عونیہ پلنگ کے نیچے فرش پہ بچھی دری پہ گاؤ تکیہ لگائے لیٹی تھی۔ پلنگ پرانی وضع کا تھا۔ لمبی لمبی ٹانگوں والا' چوڑا چوڑا' جس کے نیچے دنیا بھر کی چیزیں سما جائیں۔ اور جس کی چادر نیچے لٹک کر تمام اشیا کو اپنے اندر چھپا لے۔ یہ پلنگ دراصل عونیہ کی نانی اماں کا تھا۔ نانی اماں سے عونیہ کی اماں کو ملا۔ اور اب عونیہ کی تحویل میں تھا۔ اس پلنگ نے خواہ مخواہ جگہ گھیر رکھی تھی۔ آج کل زمانہ تھا ایسے لمبے چوڑ پلنگوں کا۔ اور پلنگوں کے لئے بڑی بڑی اساطیری داستانوں جیسی خواب گاہوں کا۔ جائداد ٹیکس کے اضافے بھلا ایسی عشرت کی اجازت دیتے تھے؟ ان دنوں تو چھوٹے گھروں اور ہلکے ہلکے فرنیچر کا رواج تھا۔ لیکن عونیہ کو ہلکے فرنیچر سے ہلکے پن۔ چھچھورپن اور جانے کس کس "پن" کی بو آتی تھی۔ فرنیچر ہو۔ تو وہی وکٹورین عہد کا بھاری بھرکم اور گھر ہو تو وہی محرابوں والا۔ اونچے اونچے درختوں میں گھرا گھرایا۔ جہاں چمگادڑیں رہتی ہوں۔ مکڑیاں جالے تنتی ہوں۔ جس سے بے شمار کہانیاں وابستہ ہوں۔ اور جہاں بھوت پریت کے رہنے کا گمان ہو۔ ارے بھئی عونیہ بیگم! یہ بھلا پرانی روایات سے چپکے رہنا کہاں کی عقلمندی ہے۔

شوہر نے غصے سے پلنگ کو دیکھا۔ اس کا جی چاہتا تھا۔ کہ پلنگ پہ زور زور یوں سے کودے کہ یہ ٹوٹ ٹوٹ جائے۔ کسی منتشر اور غیر مطمئن معاشرے کی مانند بکھر بکھر جائے۔ لیکن اس پلنگ سے ہی تو زندگی وابستہ تھی۔ زندگی کی شدت اور وجود کا احساس چند لمحوں کے لئے اسی پلنگ پر تو ملتا تھا۔

بالوں میں کنگھی کر کے وہ کمرے سے باہر نکلا۔ اسے چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ لیکن خانساماں غائب تھا۔ اور آیا برآمدے میں تینوں بچوں کو لئے بیٹھی کوئی کہانی سنا رہی تھی۔ کہانیاں زندگی سے بنتی ہیں۔ واقعات انسانوں کی ہر جنبش و حرکت سے جنم لیتے ہیں۔ لیکن شوہر کے لئے کہانیوں اور واقعات کا وقت نہ رہا تھا۔ وہ چائے تیار کر کے بغیر دودھ اور چینی پینے لگا۔ کیونکہ گھر میں دودھ نہ تھا۔ کہ دودھ والا آیا ہی نہیں تھا۔ اور چینی دان خالی پڑا تھا۔ کہ چینی کے بھرے مرتبان عونیہ بیگم نے اپنی کپڑوں کی الماری میں ٹھونس رکھے تھے۔ اور الماری کو قفل لگا تھا۔ اور چابی نہ جانے کہاں تھی۔

ہا ہا! زندگی بھی کس قدر تنگ ہو گئی تھی۔ اور شوہر کو یقین کامل تھا کہ ایک ایسا وقت بھی آئے گا۔ جب کہ کھانا بھی اسے خود تیار کرنا پڑے گا۔ اور بچے بھی خود ہی پالنا پڑیں گے۔ جل جل کر اور کڑھ کڑھ کر وہ کالی چائے ہی پیتا گیا۔

بارش بدستور ہو رہی تھی۔ دریچوں کے شیشوں پر قطرے بڑی فرمانبرداری سے بہہ رہے تھے۔ اندھیرا سا ہر طرف پھیلتا جا رہا تھا۔ فضا میں محض بارش کی آواز تھی۔ ورنہ ایک کیف آور سی خاموشی تھی۔ آیا کی کہانی اور بچوں کی شرارت بھری آوازیں بھی پس منظر میں چلی گئی تھیں۔ عونیہ بچوں کی جانب سے مطمئن تھی۔ اسے معلوم تھا کہ آیا بچوں کو کھلا پلا کر سلا دے گی۔ لمحہ بھر کے لئے اس کا دل ضرور چاہا کہ اٹھ کر ذرا بچوں کو اور شوہر کو دیکھے۔ لیکن پھر یہ ارادہ کتاب کے ختم ہونے پہ ملتوی کر دیا۔ جانے کون سی بد ذوقی کی کتاب تھی، نہ تو جاسوسی کی تھی، نہ کوئی ترغیبی سنسنی خیز کتاب تھی۔ ارے کیا اسٹاک ایکسچینج یا بجٹ کی کوئی کتاب تھی۔

غالبا کسی ڈرامے ورامے کی کتاب تھی۔ جب کہ ڈراموں اور مکالمات کا وقت بھی گزر چکا تھا اور شوہر کالی چائے پینے کے بعد اب کمرے میں آکر پلنگ کو گھور رہا تھا۔ عونیہ نے چادر لے ایک ایک سوراخ سے جھانک کر شوہر کو دیکھا، اور پھر بے نیازی سے کتاب پہ نگاہیں جما دیں۔ شوہر کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ عونیہ کہاں چھپی بیٹھی ہے۔ گھر آتے ہی اس نے عونیہ کو آوازیں دی تھیں، اور جواب نہ پا کر سوچا تھا کہ اس بارش میں ہی نکل گئی

ہے، کسی سہیلی کے گھر!

شوہر کا دل شدت سے چاہتا تھا' اس بھیگی تنہائی میں کوئی اس کے پاس بیٹھ کر تسکین کی باتیں کرے۔ عونیہ کی ہمدردی میں تو ایسی بے نیازی اور لاتعلقی تھی کہ اس کی تمام تر لطافت و الفت خود ساختہ محسوس ہوتی تھی' لیکن عونیہ ہنستی تھی' کہ اس عظیم جنگل میں جس کا نام دنیا ہے تو یہاں جو درندے رہتے ہیں ان میں محض ریاکاری اور مبالغہ پایا جاتا ہے۔ ایاز احمد یعنی شوہر نامدار بھی تو ایک ایسا مبالغہ ہے کہ کسی المیہ کا کھیل کا کوئی کردار محسوس ہوتا ہے' جسے ہمدردی اور ملامت کی کوئی ضرورت نہ ہو تو ریاکاری اور مبالغے سے بہتر ہے کہ انسان بے نیازی اور لاتعلقی اختیار کر لے۔

لیکن میں محض ایاز احمد ہی نہیں ہوں' بلکہ شوہر بھی ہوں' مارے غصے کے شوہر نے ٹی وی کھول دیا' کس قدر حیرت انگیز بات تھی کہ ٹی۔ وی پاکستان کے شہروں میں بھی آگیا تھا' اور کراچی میں بھی سال بھر سے کام کر رہا تھا' لیکن زیادہ حیرت انگیز بات تو یہ تھی کہ وہ عونیہ جو لندن میں کوئی بھی ٹی وی کھیل دیکھنا نہ بھولتی تھی۔ کراچی ٹی وی کے کھیل مطلق نہ دیکھتی تھی' اور شوہر کو ٹی وی پر نگاہیں جمائے دیکھ کر بدمزہ ہو جاتی تھی' اور لوگ افسوس کرتے رہ جاتے تھے' کہ ایاز احمد کی بیوی کس قدر سپاٹ اور روکھی پھیکی ہے' زندگی کے مختلف رنگ کھیل کی صورت میں دیکھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتی تھی۔

اب اس روز ہی عونیہ بیگم نے اتنے ڈھیروں لوگوں کی موجودگی میں کتنی بد ذوقی کا ثبوت دیا تھا۔ ستمبر کا کوئی دن تھا بارش بھی ہو رہی تھی' لیکن بارش میں شدت نہ تھی' بس ہلکی ہلکی سی پھوار تھی' جانو سمندر کی پر سکون لہروں پر دھیرے دھیرے ہوا چل رہی ہو' گھنے درختوں کے نیچے سومنگ پول کے کنارے پھیلی زندگی بڑی مسرور اور مطمئن تھی' ہر طرف شگفتگی اور بشاشت ہی بشاشت تھی' بچے بڑے سب ہی تالاب میں تیر رہے تھے' عونیہ کا دل چاہتا تھا' وہ بھی تالاب میں کود جائے لیکن وہ تیراکی کا لباس ہمراہ نہیں لائی تھی' اور پھر وہ اس حالت میں بھی نہ تھی کہ ہلکی پھلکی تتلیوں کی مانند پانی کی نیلی سطح پہ پرواز کرتی چلی جائے' اور چاکلیٹ آئس کریم کھاتے کھاتے وہ ایک کتاب بھی پڑھ رہی تھی' یہ کتاب جانے کس کی داستان حیات تھی' کبھی کبھی اس کا بھی دل چاہتا تھا کہ اپنی کہانی سنائے' لیکن اس کی تو کوئی کہانی ہی نہیں تھی' کہانی تو دکھوں اور غموں کی ہوتی ہے' سسکتی' دم توڑتی زندگی کی ہوتی ہے جسے لوگ شہرت حاصل کرنے کے بعد مزید شہرت حاصل کرنے اور لوگوں کی نگاہوں میں ایک اونچے انسان کا درجہ لینے کے لئے اپنی کہانی بنا کر مبالغے کے

ساتھ پیش کرتے ہیں' لیکن عونیہ کے پاس ایسی کوئی بات نہ تھی اور جب وہ پیچھے پلٹ کر دیکھتی' تو ایک شاندار ورثے اور اطمینان و آسودگی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا' اس کا دکھ بھی۔ وہ بہت غور کرتی تو کوئی دکھ سمجھ میں نہ آتا تھا' اس کے لئے دکھ کا لفظ بھی چاکلیٹ آئس کریم کی مانند تھا۔

سومنگ پول کنارے بیٹھی وہ آئس کریم کھاتی رہی' ایاز دونوں بچے لئے تیر رہا تھا' یا بچوں کو تیرنا سکھا رہا تھا۔ یہ سومنگ پول دیوار کے اندر تھا اور دیوار کے دوسری جانب سبزہ پر کرسیاں بچھی تھیں' کسی تقریب کا اہتمام تھا اور کوئی صاحب تقریر فرما رہے تھے' آواز ہوا کے ذریعے عونیہ کے کانوں تک آ رہی تھی اور اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی مولوی نکاح پڑھا رہا ہے۔

اب اس کلب میں نکاح بھی ہونے لگے' تجسس سے عونیہ نے سوچا' اور پھر دیوار کے دوسری جانب جھانکا' وہاں کرسیوں کے درمیان ایک میز پر چاندی کے کپ دھرے تھے' وہاں نکاح نہیں ہو رہا تھا' بلکہ کوئی صاحب ہاکی یا کرکٹ کی اہمیت پہ تقریر فرما رہے تھے۔

نہ جانے کہاں سے ہر روز ایک بڑے میاں کو پکڑ لاتے ہیں' بے نیازی سے سر جھٹک کر وہ اپنے بچوں کی جانب دیکھنے لگی' بچے اور شوہر تالاب سے باہر نکلے' اور وہ بچوں کو آیا کے سپرد کر کے دوسری جانب آئے تو تقریر ختم ہو چکی تھی' اور انعامات تقسیم کئے جا رہے تھے' مقرر نے انعام بانٹتے بانٹتے لحہ بھر کے لئے عونیہ کی جانب دیکھا' اور حیرت اور مسرت اس کے چہرے پر پھیل گئی' مقرر کے ساتھ ہی حاضرین اور فوٹو گرافروں کے چہرے بھی عونیہ کی طرف پلٹے' لیکن وہ بے نیازی سے قدم اٹھاتی رہی۔

اصغر حفیظ' شوہر لحہ بھر کے لئے رکا اور مقرر کی جانب بغور دیکھا۔

اصغر حفیظ۔ ارے وہ بڑے میاں اصغر حفیظ ہیں' عونیہ بھی رک گئی' اور زور سے ہنسی۔

شرم کرو عونیہ' وہ تو اب تک تم پہ اس قدر جان چھڑکتا ہے' کہ تمہارے ایک اشارے پر تمہارے گھر پر آدھمکے' اور ایک زمانہ تھا' تم بھی اسے پسند کرتی تھیں۔

اے لو۔ میں اس بڑے میاں کو کیوں پسند کرنے لگی۔

بڑے میاں' شوہر نے تعجب سے عونیہ کو دیکھا' "واللہ کیا شان بے نیازی ہے' ایک شخص کو پیچھے لگا کر بالکل انجان بن جانا' یہ تو تمہاری عادت ہے' عونیہ بیگم تم چاہتی ہو کہ ہمیشہ لوگوں کے دلوں پر قدم دھرتی چلی جاؤ' وہ اجمل نعیم بھی تو تمہاری یاد لئے بیٹھا ہے'

لیکن اتنا تو سوچو کہ دو بچوں کی ماں ہو' اور تیسرا وارد ہونے والا ہے۔"

"یہ بچے میں نے لوگوں کے دلوں پہ حکمرانی کرنے سے حاصل نہیں کئے ہیں' بلکہ تم سے اور محض تم سے حاصل کئے ہیں۔" وہ ہنسی' اور بچوں کو آیا کے سپرد کر کے دوبارہ شوہر کے ہمراہ سوئمنگ پول کی طرف آگئی' ان کا ارادہ تھا' کھانا وہیں کھایا جائے لیکن ٹی۔ وی جو سوئمنگ پول کے کنارے نیم کے درخت تلے رنگ برنگے قمقموں کے درمیان دھرا تھا' اپنے پروگرام پیش کر رہا تھا۔ عونیہ نے ٹی وی کی جانب دیکھا' اور چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔

"تم یہ کھیل دیکھو' میں گھر جا رہی ہوں" وہ تیز تیز قدم اٹھاتی دوبارہ دیوار کے دوسری جانب آگئی۔

تمہاری بیوی کو کھیلوں سے اس قدر چڑ کیوں ہے؟ کسی نے ایاز سے دریافت کیا۔

"کھیل آخر کھیل ہے" ایاز احمد نے سر جھکا لیا۔ دیوار کے دوسری جانب اصغر حفیظ نے دوبارہ عونیہ کی جانب اشتیاق سے دیکھا' اور اس کے قریب آنے لگا' لیکن عونیہ سر جھٹک کر اور "کھیل آخر کھیل ہے" کہہ کر آگے بڑھ گئی' اصغر حفیظ وہیں کھڑا رہ گیا اور ایاز احمد وہیں ٹی وی کے سامنے بیٹھا رہ گیا۔ اس کے ذہن میں وہی ایک نقش بار بار سر اٹھا رہی تھی۔ جس نے کئی سالوں سے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے'،کام کرتے کرتے' وہی ایک جھنجھن ہوتی تھی' دفتر میں فائلوں پر جھکے جھکے وہی ایک بات یاد آتی' اور وہ خلا میں دیکھتے کا دیکھتا رہ جاتا۔ زندگی کے باوجود زندگی بے رنگ ہو کر رہ گئی تھی' زندگی کی ابتدا بھی کچھ ایسی ہی ہوئی تھی' بچپن شہروں کے تشنج میں اور گلی کوچوں میں آوارہ لونڈوں کے ساتھ گزرا' والدین کی خواہشات جانے کیا تھیں۔ ایاز نے ہر خود سر بیٹے کی طرح والدین سے بغاوت کی' اور اپنا راستہ خود تلاش کرنے نکل پڑا' لیکن تنگ تنگ گلیوں کے کھنڈر نما مکانوں کے تیرہ و تار کمرے اور فاقے اس کا مقدر بن گئے' مایوسیاں اور کچھ بننے کی تمنا اسے مختلف شہروں میں گھماتی پھراتی لندن تک لے آئی' اور یہاں واسطہ ایسے لوگوں سے بھی پڑا' جو کھیلوں' ڈراموں کے عشق میں سدھ بدھ کھوئے بیٹھے تھے' ان لوگوں کے درمیان آکر ایاز پر ایک انکشاف یہ ہوا' کہ کراچی اور لاہور میں تو لڑنے جھگڑنے اور چلا چلا کر بولنے کو اور چہرے کے جبری اتار چڑھاؤ کو اداکاری کی معراج سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہاں جسم کی ایک ایک جنبش اور آواز کے ایک ایک زیر اور بم پہ کس قدر زور دیا جاتا ہے' لیکن یہ سب کچھ دیکھ کر ایاز احمد کو تھکاوٹ سی ہونے لگی' زیادہ بیزاری تو ان ہنستی

گاتی لڑکیوں سے ہوتی' جن کے ہجوم میں جمال ہم نشیں کہیں نظر نہ آتا تھا' وہ صورت کہیں نہ ملتی تھی' جو ہم خیال اور ہم زبان ثابت ہوتی اور یوں تنہائی اس کی زندگی میں برابر زہر گھولتی رہی۔

عموماً یوں ہوتا ہے کہ ہم کسی ایک چہرے کی تلاش میں گلی گلی' کوچے کوچے' قریے قریے' شہر شہر گھومتے پھرتے ہیں' اور ہوتا یوں ہے' کہ اچانک بالکل قریب ہی ایک ایسا چہرہ نظر آتا ہے جسے دیکھ کر ہم چلا اٹھتے ہیں' ارے یہ تو وہی ہے' جس کی ہم جستجو کر رہے تھے۔

شہر کے ایک تاریک ہال میں طلباء کا ایک گروہ کوئی کھیل پیش کر رہا تھا' اور ایاز ہال کے آخری کونے میں کھڑا سگریٹ سے شغل کر رہا تھا' اور بیزار سا ہو رہا تھا کہ دفعتاً" اس کے لئے تمام منظر ہی بدل گیا' سائے کی طرح ایک لڑکی اندر داخل ہوئی اور دوسرے کونے میں کھڑی ہو گئی' کسی کو اس کے وجود کی آہٹ تک محسوس نہ ہوئی' وہ تو اچانک اک مہک بن کر ایاز کی روح میں سرایت کر گئی' سر اٹھایا تو سنگ کے بجائے اک گل تازہ سامنے پایا۔

ہال کے باہر برف گر رہی تھی۔ جیسے ذہن میں اچھے اچھے خیالات آرہے ہوں' اور خوبصورت جملے کسی کاغذ پر اترتے جاتے ہوں' اور الفاظ سے ایک نئی اور پر جلال دنیا کی تعمیر ہوتی ہو۔ ٹیمز دریا پر گویا وہ تمام ستارے اتر آئے تھے جو لندن کے آسمان پہ کبھی نظر ہی نہ آتے تھے' گھروں میں گلاب کے پھولوں کی مہک تھی' اور کائی جمی عمارات شاندار طور پر بڑی وضع داری کے ساتھ پھیلی ہوئی تھیں۔ اور عونیہ وہاں کھڑی تمام پس منظر سے بالکل الگ تھلگ نظر آتی تھی' جانے کس اجنبی دنیا سے برفوں کے ساتھ ساتھ اڑتی اڑتی چلی آئی تھی' یوں محسوس ہوتا تھا' پھولوں' گلہریوں' خرگوشوں سے کھیلتے کھیلتے چاکلیٹ اور آئس کریم کھاتے کھاتے اور گھر کے آخری کمرے میں بیٹھ کر پریوں کی کہانیاں پڑھتے پڑھتے چلی آئی ہے' یا پھر کسی آثار قدیمہ سے کوئی دیوی سی نکل کر چلی آئی ہے' جو ایک زندگی نہیں بلکہ کئی زندگیوں کے روپ رکھتی ہے۔

عونیہ کے چہرے پر طمانیت اور سکون پھیلا تھا اور مختصر سا دہانہ ذرا سا کھلا تھا' ایاز کی تمام تر کلفتیں یک لخت دھل گئیں۔ سرور کی تمام تر کیفیت بادل کی طرح اس کے ذہن پر برسنے لگیں' اور ایک ہی لمحہ میں وہ ایاز کے دل میں اتر گئی۔ ایاز کو خواہش ہوئی کہ اس پر سکون چہرے کو اپنے قریب کر لے جو ایسی ندی کے مانند تھا جس میں کبھی طوفان نہ آتا ہو' اک نامعلوم سحر کے زیر اثر ایاز اس کے بالکل قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ سانولے نقوش کی وہ

دراز قد لڑکی قد میں اس کے برابر تھی' ایاز کے دل میں خواہشات کی زبردست یلغار ہوئی اور لائیٹر اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ آواز پر عونیہ پلٹی' بدمزگی کا سایہ اس کے چہرے پر آیا اور چلا گیا۔ اور اس ایک لمحے میں عونیہ نے ایاز کا پورا ذہن پڑھ لیا اور ناگواری سے سامنے دیکھنے لگی' عونیہ کے انداز اور تیوروں میں اس قدر بے ساختگی اور معصومیت تھی کہ ایاز نے اسے مخاطب کرنا چاہا۔ اور تب ہی اسے محسوس ہوا کہ وہ عونیہ کو بخوبی جانتا ہے۔ عونیہ سائے کی مانند ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ رہی ہے' چاندنی راتوں میں ان وادیوں میں اس کے ہمراہ گھومتی پھری ہے' جہاں خیالوں کے مہکتے پھول کھلتے ہیں' اور وہ ہمیشہ اسی کا انتظار کرتا رہا ہے جو دو انتہاؤں پہ کھڑی پلٹ پلٹ کر دیکھتی ہے' اور کبھی تو بالکل ایاز کی گرفت میں محسوس ہوتی ہے' اور کبھی دور کھڑی منہ چڑاتی ہے' اور کبھی کسی چمن کے خاموش تنہا گوشے میں بیٹھی ایاز کی کہانی سن رہی ہے' اور اپنی کہانی سنا رہی ہے' لیکن عونیہ کی تو سرے سے کوئی کہانی ہی نہ تھی' آسودہ گھر کی آسودہ لڑکی تھی' جسے کائنات کی ہر شے بڑی خوبصورت نظر آتی تھی' جو اپنے وجود سے بڑی مطمئن تھی' زندگی کے حسین سپنے دیکھنے کے لئے وہ کسی قدر تنہائی کو بھی پسند کرتی تھی اور اسی لئے گھر کے آخری کمرے میں بیٹھ کر ڈرامے پڑھتی تھی۔ اور تصویریں بناتی تھی کہ ایک روز ایک بہت ہی خوبصورت اور شاندار شخص اس کی تصویروں اور ڈراموں سے نکل کر سامنے آکھڑا ہوا' اس شخص کے چہرے میں دھوپ کی تمازت تھی اور بڑی بڑی کانوں تک کھنچی آنکھوں میں گومتی اور سرجو بہتی تھیں اور اس کی گفتگو میں شام اودھ جیسی حلاوت اور حسن تھا۔ لیکن ان تمام تر خوبیوں کے باوجود اس سے عشق عونیہ کو انتہائی مضحکہ خیز معلوم دیا' عشق کرتا آدمی بالکل لکڑ بھگا معلوم دیتا ہے' عونیہ کو اس تصور سے ہی وحشت ہونے لگی کہ ایک وہ اس شخص اصغر حفیظ کے عشق کا جواب دے۔ اور پھر اس سے شادی رچا کر مختلف سفارت خانوں اور اونچی محفلوں میں شرکت کرے' ڈھیروں زیوارت لاد کر بیگمات کی محفل میں بیٹھی اسکنڈل سازی کرے' لہٰذا وہ کراچی چھوڑ کر لاہور چلی گئی' لیکن وہاں اجمل نعیم سامنے آکھڑا ہوا جو اصغر حفیظ سے قطعی مختلف تھا۔ اخلاقی سطح سے کافی نیچے ہو کر بات کرتا تھا' اور ہر لڑکی میں اپنی حسرتوں کی تکمیل چاہتا تھا' وہ کسی درمیانے ماحول کا شخص تھا' اس کے ہاں دنیا بھر کی الجھنیں تھیں' عونیہ کو الجھنوں سے دلچسپی نہ تھی' یوں بھی اسے لندن کی راہ اختیار کرنا تھی۔

یہاں وہ لندن یونیورسٹی میں ڈرامہ پڑھتی تھی' اورینٹ گیلری اور برٹش میوزیم میں جا

کر تصویریں بناتی تھی یہ محض ایک اتفاق تھا کہ یہاں ایاز احمد اس کے سامنے آیا۔

"تم ہمیشہ میرے قریب رہو گی" ایاز نے اس تاریک ہال میں کھڑے کھڑے پیار سے عونیہ کے بال سہلائے عونیہ کے بالوں سے مہک نکل رہی تھی' وہ مدہوش سا ہو گیا۔

اور جب وہ عالم کیف و سرور سے چونکا تو سامنے اسٹیج پر کھیل بدستور ہو رہا تھا' اور عونیہ اپنی خوشبو چھوڑ کر جا چکی تھی' ایاز کے اس سہانے خواب کی مدت محض بیس منٹ کی تھی' لیکن عونیہ سے ایک رشتہ قائم ہو گیا تھا جو کبھی ٹوٹ نہ سکتا تھا۔

ایاز کافی بد شکل انسان تھا۔ چہرے کے نقوش کچھ واہیات سے تھے۔ ایک نقش کی دوسرے نقش سے کچھ مطابقت نہ تھی' مجموعی طور پر یہ صورت ایسی تھی جس کا تجزیہ کیا جاتا تو کچھ بھی پلے نہ پڑتا' عونیہ کی فنکارانہ فطرت نے اس چہرے کو رنگوں میں گھولنا چاہا' لیکن مصیبت یہ تھی کہ کوئی بھی رنگ اس چہرے کو قبول نہ کرتا تھا' عونیہ کی سمجھ میں نہ آتا تھا اس چہرے کے پیچھے درحقیقت ہے کیا' اس نے تمام رنگوں کے تجربے کر ڈالے' لیکن ہر رنگ اسے سیاہ کی ترغیب دیتا تھا اور ایاز کے تمام تر کردار کو گناہ کی سیاہ رات قرار دیتا تھا' ایاز کی تصویر کو سیاہ رنگ سے رنگ کر عونیہ نے الٹا لٹکا دیا۔

اور جب کئی سالوں بعد ایاز وطن آیا تو بڑا آدمی بن چکا تھا اور لڑکیوں کے ہجوم میں رہتا تھا' لیکن یہ تمام لڑکیاں' تمام خوبصورت چہرے اس کی فردوس گم گشتہ واپس نہیں دے سکتے تھے' جس کی ایک جھلک لندن کی اس برف آلود فضا میں بیس منٹ کے اندر اندر دیکھی تھی' ہجوم میں کبھی تنہائی اور سناٹا' بے کیفی اور بدمزگی اپنی اپنی جگہ بدستور تھے' جمال ہم نشیں کی تلاش جاری تھی۔

ایک شام وہ کراچی کے اسی کلب میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ یونانی ڈراموں کی دیوی آثار قدیمہ سے نکل کر سامنے آگئی' وہ ایک ستون کے سہارے کھڑی بے نیازی سے چنا ہوا دوپٹہ لہرا رہی تھی۔

"عونیہ" وہ آنکھیں مسلنے لگا' لیکن عونیہ اب بھی اسے پہچان نہ پائی۔ اس چہرے کو اب بھی اس نے ایک فنکار کی نگاہ سے دیکھا' لیکن اب بھی یہ چہرہ کوئی رنگ قبول نہ کر سکا' ایک مرتبہ پھر عونیہ نے اس کی تصویر کو سیاہ کر ڈالا اور اس سیاہی کی وجہ معلوم کرنے ایاز کے قریب چلی آئی۔

"تمہارے قرب کے باوجود بھی میں بھٹکتا پھرتا ہوں' تنہائی اور سناٹا بدستور میرا مقدر ہے" شوہر نے غصے سے پلنگ کی جانب دیکھا' عونیہ گو اس کے تین بچوں کی ماں تھی' لیکن

ان تمام سالوں میں بھی وہ ایاز کی تصویر کو کوئی اچھا رنگ نہ دے پائی تھی اور ایاز کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس مونا لیزا نے کون سا انتقام لینے کے لئے اس کی زندگی کو سیاہ رنگ کی ایک تصویر بنا ڈالا ہے۔

رضیہ فصیح احمد

پائلٹ

"باجی' باجی—— باجی دیکھئے۔"

اس نے مانو کو نظر انداز کر کے اوپر سے آنے والی زیادہ پرشور آواز کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ ہری پٹی اور سفید جسم والا ہوائی جہاز بہت نیچے' بہت ہی نیچے گویا ان کے سروں پر سے اڑتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی رفتار سست تھی مگر نیچا ہونے کی وجہ سے گھن گرج بہت تھی۔ وہ بڑے وقار سے آہستہ آہستہ گزرا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے سیدھا سامنے والے پہاڑ سے جا کر ٹکرا جائے گا۔ اور جب ذرا نزدیک پہنچا تو بالکل ایسا محسوس ہوا جیسے وہ پہاڑی پر بنے ہوئے سفید اور سبز رنگوں والے مکان کے دروازے میں گھستا چلا جائے گا لیکن جب وہ گزرا تو وہ منہ پھاڑے دیکھتی رہ گئی۔ جہاز پہاڑ کے بلند ترین درختوں کی بلند ترین چوٹیوں سے بھی اوپر گزر گیا تھا۔

اس کے غائب ہو جانے کے بعد وہ دفعتاً" دل پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گئی۔ واحد!—— یہ ضرور واحد ہو گا۔"

نجمہ نے لکھا تو تھا: "واحد پائلٹ ہو گیا ہے۔ اس کی روٹ.... سے.... تک ہے۔ تمہاری طرف سے تو اس کا جہاز جاتا ہو گا۔" ہاں اسے معلوم تھا کہ اس روٹ کا جہاز اسی طرف سے جاتا ضرور ہے۔ اس نے اکثر باہر بیٹھے ہوئے جہاز گزرتے دیکھے تھے مگر وہ سب یہاں سے بہت دور وادی کے بیچوں بیچ پہاڑی کے پس منظر میں سفید کپڑوں کی طرح چلتے نظر آتے تھے مگر یہ تو عین اس کے سر پر سے گذرا تھا۔ واحد کو زیادہ سے زیادہ ان کا علاقہ ہی معلوم ہو گا مگر یہ کیسا اتفاق تھا کہ وہ بالکل اس کے گھر کے اوپر سے گزرا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ اس وقت دوربین لگائے دیکھ رہا ہو اور اس نے مجھے اوپر کی طرف نظریں اٹھائے دیکھ لیا ہو۔

وہ سارا دن بڑی بشاش رہی۔ بار بار کسی انجانی خوشی کا نغمہ انجانے پن ہی میں اس کے ہونٹوں پر تیر جاتا۔ رات کو سونے سے پہلے چپکے سے اپنے کمرے میں لگے ہوئے کلینڈرز میں

آج کے دن پر سرخ نشان کھینچا اور بستر پر لیٹ کر جہاز کی مدھر خیالی آواز سنتی رہی۔

کلینڈر پر لگائے ہوئے سرخ نشان والے دن کے انتظار میں وہ ابھی پوری طرح کھلنے بھی نہ پائی تھی کہ ایک دن اچانک وہی جہاز بالکل اسی طرح' اوپر سے گزرا۔ وہ گھر کے اندر بیٹھی تھی۔ آواز سنتے ہی وہ لپک کر باہر آئی اور غیر شعوری طور پر زور زور سے ہاتھ ہلانے لگی - مانو اور رانی پہلے سے یہی کر رہے تھے اس لئے انہوں نے اس کی اس حرکت کو محسوس نہیں کیا۔ جب جہاز اس پہاڑی کو بالکل اسی خواب ناک انداز میں پار کر گیا تو وہ اپنی اس حرکت پر شرمندہ سی ہوئی مگر دل میں مسرت کی ہلکی سی لہر بھی تھی۔ کیا معلوم واحد نے دیکھ ہی لیا ہو——!!

باقی دن بھر ہوائی جہاز کی مدھر گھر گھر اس کے حواسوں پر جلترنگ سا بجاتی رہی۔ ہائے اللہ ! بالکل ہمارے گھر پر سے——! کیا کسی دن ایسا بھی ہو گا کہ واحد کوئی لفافہ جس کے اندر اس کی تصویر ہو گی' یا گلاب کے پھولوں کا گلدستہ یا کوئی رومال اوپر سے پھینک دے گا جس پر "ڈبلیو" کڑھا ہو گا۔ اگر ایسا ہو تو کتنا اچھا ہے۔ اور جب اس کا اس خیال کی خوبصورتی سے دل بھر گیا تو اس کے مضحکہ خیز پہلو بھی سامنے آنے لگے۔ اتنی بلندی سے لفافہ اور رومال نہ جانے کہاں جا پہنچے گا۔ اور پھولوں کی ہڈیاں پسلیاں تک چور چور ہو جائیں گی اور پھر وہ کیسے کر سکتا ہے جب کہ اس کے اور ہمارے گھر خاندانی لڑائی ہے نجمہ بھی تو مہینے دو مہینے میں کسی اور سہیلی کے پتے پر میرے نام ایک خط بجھوا دیتی ہے۔ تو کیا میں صرف اس جہاز کو تکتی رہوں گی خود اسے کبھی نہ دیکھ سکوں گی۔ نہیں وہ ضرور کچھ نہ کچھ کرے گا۔ کیا یہ اس کے خلوص کی نشانی نہیں تھی کہ گھر کا صحن اس کے قدموں پر حرام تھا اس گھر کی فضا کو اس نے اپنے اوپر حلال کر لیا تھا۔ کاش یہ بڑے دلوں کے اخلاص کو سمجھ لیتے۔ اور پھر وہ سوچ کر پریشان ہوتی رہی کہ وہ امی اور ابا کو کس طرح بتائے کہ یہ واحد ہے جو ہر ہفتے اپنی موجودگی کا احساس دلانے' اپنی حیثیت منوانے' خوشامد کے طور پر اس گھر کا طواف کرنے آتا ہے تاکہ جب وقت آئے تو اس کے ابا امی اس کی وفاؤں کو یاد رکھیں اور انکار نہ کر دیں۔ واحد کا یہ اصرار یہ طواف کتنا بلند تھا۔ اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا' اس کو نوکروں کے ذریعے گھر سے نہیں نکلوایا جا سکتا تھا۔ اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ گھر والے گھر پر نہیں ہیں! وہ آتا تھا "اور مجھے یاد رکھنا۔" کہتا ہوا سر سے گذر جاتا تھا اور وہ اسے یاد رکھتی۔ اس سہانی آواز کے انتظار میں جیتی تھی جس کا کوئی دن کوئی وقت مقرر نہیں تھا مگر جو ہفتے میں ایک بار ضرور سنائی دیتی تھی وہ پورا جہاز اور اس

جہاز کا ایک ایک حصہ تصویر کی طرح اس کی نظروں میں سما گیا تھا۔ یہاں تک کہ جہاز کے شناختی نشان بھی اکثر تنہائی میں اس کی آنکھوں کے سامنے تیرا کرتے۔

اور آخر ایک دن یہ راز اس کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ جب وہ جہاز بردباری، بلند آہنگی سے سر پر سے گزر گیا تو اس نے جھک کر مانو کے کان میں کہا۔ "جانتے ہو اس جہاز میں کون ہے؟"

"ہاں آدمی"—— مانو نے پاگل پن سے کہا۔

"آدمی نہیں واحد—— واحد بھائی تمہارے، جو لاہور میں رہتے تھے نا ہمارے گھر کے پاس—— شام کو سفید پتلون قمیض پہن کر ٹینس کھیلنے جایا کرتے تھے۔ بڑے بڑے کالے کالے بال تھے جن کے گردن تک اور بڑی بڑی کالی کالی آنکھیں تھیں جن کی۔"

"ہاں جو ہمیں ٹافی دیتے تھے کبھی کبھی——" مانو کو یاد آیا۔

"وہی وہی—— وہ ہوتے ہیں اس جہاز میں۔"

"اچھا۔ وہ کیا کر رہے ہیں اس جہاز میں۔"

"اسے چلا رہے ہیں"

"ہیں! باجی وہ اسے چلا رہے ہیں۔"

"ہاں——" اس دن مانو کو اپنے راز میں شریک کر کے وہ بے حد خوش تھی۔ اس کا دل چاہا وہ یہ بھی اگل دے۔ "وہ میری ہی خاطر ادھر سے گزرتے ہیں۔" اتنے نیچے، بڑے ہمت والے ہیں وہ۔ میں نجمہ کو لکھوں گی "واحد سے کہنا اتنے نیچے جہاز نہ لایا کریں۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔" پھر وہ خیالات کے ریلے میں بہنے لگی۔ اگر جہاز اوپر سے گزرا تو اسے آواز کس طرح آئے گی، اسے کیسے پتہ چلے گا کہ واحد آیا تھا۔ اگر واحد نے اسے باہر کھڑا نہ دیکھا تو اسے افسوس ہو گا کچھ بھی ہو ضرور لکھے گی کہ واحد سے کہنا اتنے نیچے جہاز نہ لایا کریں۔ نجمہ یہ جملہ واحد کو سنائے گی۔ وہ مسکرائے گا آنکھوں کی جوت بڑھ جائے گی پھر وہ بال پیچھے پھینک کر سیٹی سی بجائے گا اور اگلی دفعہ—— اگلی دفعہ شائد اس کا جہاز اس سے بھی نیچے اترے گا، اس سے بھی نیچے۔

کئی دن سے موسم یکایک خراب ہو جاتا تھا۔ مغرب کی طرف ایکا ایکی گہرے گہرے بادل اٹھتے اور گھٹا ٹوپ ہو جاتا۔ پھر ان میں سے نیلے نیلے رنگ کی خوف ناک سی بجلی چمکتی جو شیشوں والے کمرے سے ہوتی ہوئی اندر تک در آتی اور اس کے بعد اتنے زور کی کڑک کہ دل لرز کر رہ جاتا۔ کچھ دیر یہ تماشا ہوتا اور پھر یکایک بوندیں پڑے بغیر ہی اولے گرنے

شروع ہو جاتے۔ دھڑ دھڑا دھڑ' اولوں کے ساتھ بجلی کی چمک اور بادل کی گرج کا خوف کئی گنا بڑھ جاتا۔ آج اس قسم کے موسم کو یہ چوتھا دن تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے خاصی دھوپ تھی۔ مانو اور رانی دونوں بچے امی سے پوچھ کر سیر کے لئے چلے گئے۔ یکایک موسم خراب ہو گیا تو امی' اور ان کی تسلی کے لئے ابا بھی برآمدے میں آکھڑے ہوئے۔ بجلی کے ڈر کے باوجود وہ ذرا آگے آکر پگڈنڈی پر مانو اور رانی کو دیکھنے گلاب کی باڑھ پر جھک گئی۔ دفعتاً" وہی جانی پہچانی آواز آئی۔ اس نے گھبرا کر اوپر دیکھا' ہری پٹی اور سفید جسم والا ہوائی جہاز اسی متانت اور وقار سے چلا آرہا تھا۔ مشرق کی طرف سے پہلے سے بھی نیچے جیسے مغرب کی طرف سے اٹھتے ہوئے دھواں دھار بادلوں کو چیلنج کر رہا ہو۔

"جانے کون پگلا ہے' اس موسم میں اتنے نیچے جا رہا ہے۔" امی مانو اور رانی کو بھول کر اپنے اوپر دیکھنے لگیں۔ وہ تو پہلے سے ہی اوپر دیکھ رہی تھی' اس کا ایک ہاتھ تھوڑا سا اوپر اٹھا ہوا تھا جیسے وہ اس موسم میں اتنے نیچے آجانے پر احتجاج کر رہی ہو۔ ابا بھی ادھر ادھر ہی دیکھ رہے تھے' ہمیشہ کی طرح گھر میں گھستے گھستے جیسے وہ ارادہ بدل کر اوپر سے گزر گیا اور پہاڑ کے پیچھے نظروں سے اوجھل ہو گیا اور پھر ایک زور کا کڑاکا ہوا۔

"اللہ رحم!" امی نے دونوں ہاتھوں سے کان بند کر لئے "کتنے زور کی کڑک ہے۔"

"یہ کڑک نہیں دھماکا بھی ہے جہاز کریش ہو گیا وہ دھواں دیکھ رہی ہو۔"

اس لمحے بالکل اسی لمحے موٹے موٹے اولے برسنے لگے۔ نہیں معلوم اس نے ابا اور امی کے ان جملوں کا کتنا حصہ سنا' ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے تیز برچھے کی انی اس کے سینے میں اتار دی ہو وہ جھونک کھا کر گری اور بے ہوش گئی۔

پورے طور پر ہوش میں آنے سے پہلے اس کے کانوں میں کسی کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ "دل کی بہت کمزور ہے' ادھر بجلی کڑکی' ادھر جہاز کا دھماکا ہوا' بس یہ غش کھا کر گر پڑی' بارہ گھنٹے سے بے ہوش ہے۔"

اور اس وقت پورے ہوش میں آکر جیسے کسی نے برچھے کی انی دوبارہ اس کے دل میں پیوست کر دی تو جہاز کا کریش محض واہمہ نہ تھا! اس نے آنکھیں کھول دیں۔ باتیں کرنے والے شائد برآمدے میں تھے' کمرہ خالی تھا۔ اس نے کروٹ بدلی' مانو اخبار ہاتھ میں لئے سامنے سے گذرتا گذرتا اس کو ہوش میں دیکھ کر اندر آگیا۔

"باجی' باجی دیکھئے کل کے کریش کی تصویر اس میں آئی - پائلٹ کی تصویر بھی ہے اور اس کے بیوی بچوں کی بھی—!"

"بیوی بچوں کی ——" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی، یہ کل کے کریش کی تصویر تھی۔ جہاز پہاڑیوں میں گرا ہوا زمین پر ڈھیر کی شکل میں پڑا تھا۔ پائلٹ کی تصویر بھی تھی، ایک چھ فٹے قد آور جوان کی تصویر جس کے چھوٹے چھوٹے بال تھے اور جو بیوی اور دو بچیوں کے ساتھ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ حادثے کی خبر میں لکھا تھا —— پائلٹ کی بیوی کا گھر حادثے کی جگہ سے صرف چند فرلانگ دور تھا!

اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ وہ واحد نہیں تھا۔ اس کا دل چاہا اسی وقت اٹھ کر وضو کرے اور سجدہ شکر بجا لائے کہ وہ واحد نہیں تھا۔ مگر اس وقت برچھے کی انی پھر اس کے دل میں چبھی۔

تو وہ واحد نہ تھا جو ہر ہفتے ان کے گھر کے اوپر سے گزرا کرتا تھا۔ وہ کوئی اور تھا۔ وہ کوئی اور کیوں تھا!

عفراء بخاری

گٹھری

یہ اس کے گناہوں کی گٹھری تو نہ تھی کہ وہ اس سے آنکھیں چرائے شرمسار ہو رہی تھی۔

اس نے اب گٹھری کو اپنی آنکھوں کے سامنے سے ہٹا دیا تھا۔ مگر اس کے باوجود اسے اطمینان نصیب نہیں ہو سکا تھا۔ وہ گٹھری گویا اس کے تصور میں گڑ گئی تھی، اور وہ اسے بغیر دیکھے ہی اسے دیکھ رہی تھی، اور اپنے کام میں مصروف بار بار جھنجلا رہی تھی۔

کبھی سوچتے سوچتے اس کا چہرہ غصے سے تمتما جاتا، گال لال ہو جاتے اور اس کا جی چاہتا وہ اونچی بلند آواز میں سوچے "اسے یوں ذلیل کرنے کا حق نوشابہ کو ہرگز نہیں پہنچتا تھا۔ اس نے کھلے طور پر اس کی ہتک کی تھی۔ اور اس ہتک کا احساس اسے پھونکے ڈال رہا تھا۔ کیا وہ ایسی ہی گئی گذری ہو چکی ہے___؟ مگر دوسرے لمحے جب وہ اپنی بے بسی پر غور کرتی تو اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ڈھلک پڑتے۔

"ٹھیک تو ہے لوگ جو کچھ دیکھیں گے وہی سمجھیں گے" ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھتے پونچھتے چولہے کی سیاہی بھی اس کے چہرے پر مل گئی تھی۔ ننھے پپو نے کھیل سے سر اٹھا کر ماں کی طرف دیکھا تو بھولپن سے ہنس کر بولا۔ "امی جی کا منہ کالا"

وہ اپنی پریشان کن سوچوں میں بے خبر بیٹھی چونک گئی۔ اس نے گہری اور عجیب نظروں سے پپو کی طرف دیکھا۔ اور اسے محسوس ہوا جیسے یہ آواز پپو کے منہ سے نہیں خود اس کے اندر سے نکلی تھی۔ اس کا دل کٹ کر رہ گیا اور وہ منہ پھیر کر بلک پڑی۔ عاقبت کی خبر خدا جانے مگر اس دنیا میں تو وہ واقعی روح سیاہ ہو چکی تھی۔ وہ اس کالک لگے منہ کو کس کس سے چھپائے گی۔ اس کا دل نہ چاہا کہ اٹھ کر منہ دھوئے مگر کچھ دیر بعد جب اس نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو وہ اسے اس قدر بھیانک لگی کہ اس نے فوراً غسل خانے میں جا کر منہ دھو ڈالا۔

"خدا بڑا بے نیاز ہے" اس نے کسی صابر و شاکر انسان کی طرح آخر کار ٹھنڈا سانس

بھر کر سوچا۔

ابھی کچھ دیر پہلے نوشابہ آئی تھی۔ اور وہ اسے دیکھتے ہی کھل اٹھی تھی۔ نوشابہ اندر آئی۔ اور اس نے وہ گٹھری صحن میں بچھی چارپائی پر رکھ دی۔ بغیر کچھ پوچھے بغیر کچھ سوچے۔ اس نے اپنے اندر فرحت محسوس کی تھی اور اس وقت نوشابہ اسے نیکی کی فرشتے کی طرح اچھی لگی تھی۔ گٹھری کو کھول کر دیکھنے کی کمزور سی خواہش ہی اس کے اندر پیدا ہوئی تھی، مگر یہ بھی اچھا ہوا کہ اس نے یہ احمقانہ حرکت نہ کی اور قدرے بردباری سے کام لے کر ہنستی کھلکھلاتی نوشابہ کے ساتھ کمرے کے اندر چلی گئی۔

نوشابہ ہونٹوں پر بڑی مربیانہ مسکراہٹ لئے کرسی پر اُنگھے پن سے بیٹھ گئی۔ جو اسے اس وقت بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ کیونکہ خود نوشابہ بھی اسے اس وقت محبت اور اخلاص کی پوٹ نظر آرہی تھی۔ بار بار اسے خیال آرہا تھا کہ نوشابہ اچھی ہے۔ بہت اچھی ہے سب بہنوں کو بس ایسا ہونا چاہیے۔ ایک بار تو اس کے جی میں آئی تھی کہ وہ اپنے اتنے اچھے جذبات کا اظہار کر دے مگر یہاں پھر اس نے عقل سے کام لیا اور فقط اظہار نیاز مندی سے کام لیتی رہی، "کیا کھاؤ گی۔" اس نے پوچھا: "ٹھنڈا منگواؤں۔"؟

"نہیں اس وقت خواہش نہیں۔"

"چائے"

"ہائے یہ بھی کوئی چائے پینے کا وقت ہے۔" "اچھا تھوڑی سویاں بناتی ہوں کچھ تو ہو۔" "نہیں بھئی اس وقت تو کچھ بھی کھانے کو جی نہیں چاہتا۔" "کھانا کھا لو پھر" آخر اس نے کچیانے پن سے کہا۔" دراصل دال پکا رکھی ہے اس لئے پوچھ نہیں رہی تھی۔"

نوشابہ مسکراتی رہی۔

"آج ناغہ ہے نا"——اس نے خود ہی شرمندگی مٹانے کو کہا۔

"اچھا: بھئی ہمیں تو ناغے کا پتہ نہیں چلتا۔ ایک دن پہلے گوشت منگوا کر فریج میں رکھ دیتے ہیں۔ دوسرے دن مچھلی یا مرغی پک جاتی ہے، میرے بچے تو دال کے نام سے بھاگتے ہیں۔ اپنے لئے کبھی کبھار ماش کی بگھاری دال بنوا لیتی ہوں۔ ہاں بچوں کی یہی دقت ہے۔ میرے بچوں کو کبھی دیکھو دال کے نام پر کیسے ناک بھون چڑھاتے ہیں۔ مگر مجبوری ہے۔ فریج خرید تو لوں مگر مکان میں گنجائش کہاں ہے۔ پہلے مکان کا بندوبست ہو جائے تو پھر خریدوں۔"

"ہاں تو یہ ہے۔" نوشابہ بڑی فراخدلی سے مسکرا رہی تھی اور اس کے ملے ہوئے

متبسم ہونٹوں پر اب اسے بندھی ہوئی گٹھری کا گمان گزر رہا تھا—— کچھ دیر کی خوش کن بے تکلفی میں خود بخود ایک تکلف سا نمودار ہو گیا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی خوشیوں کا کوئی کنگرہ چپکے سے گر پڑا ہے اور اس کی آواز کھوکھلی ہوتی جا رہی ہے۔

"اچھا میں چلتی ہوں۔" نوشابہ نے ٹانگ پر سے ٹانگ اتاری تو وہ کچھ اور بجھ سی گئی۔

"بیٹھو ابھی تو آئی تھیں—— بچوں کے بارے میں کچھ بتایا نہیں کیسے ہیں۔"

"دونوں ٹھیک ٹھاک ہیں۔"

"انہیں بھی ساتھ لے آتیں۔"

"کسی دن لاؤں گی اس وقت جلدی تھی۔ آج بڑے دنوں بعد پکچر کا پروگرام بنا ہے۔"

"مگر پکچر میں تو ابھی بہت وقت پڑا ہے۔"

"ہاں اس سے پہلے کچھ شاپنگ بھی کرنی ہے۔ سردی آ رہی ہے۔ بچوں کے لئے گرم کپڑے وغیرہ خریدنے ہیں تم جانوں ایک سال پہلے کے بنے کپڑوں کو تو وہ ہاتھ نہیں لگاتے۔

"یہ تو ہے"—— اس کی آواز قطعی خشک ہو چلی تھی۔ نوشابہ چلی گئی۔ مگر وہ کیوں اچانک مرجھا کر رہ گئی تھی۔ یہ بات تو واضح تھی کہ وہ اب خوش نہ تھی مگر اب وہ کیوں اور کس وجہ سے خوش نہ تھی۔ اس نے اپنا بھرم رکھنے کو جگہ جگہ سفید جھوٹ بولے تھے۔ مگر پھر بھی وہ مطمئن نہ ہو سکی تھی۔ وہ کھوئی کھوئی سی کمرے میں چیزوں کو بے مطلب ایک جگہ سے دوسری جگہ پر رکھتی پھری۔ پھر اچانک اسے باہر سے بابی کی آواز آئی۔

"امی اس گٹھری میں کیا ہے۔"

وہ گویا ناخوشگوار خواب سے بیدار ہو گئی - وہ تیزی سے باہر آئی اور چیل کی طرح جھپٹ کر گٹھری بابی کے ہاتھ سے نوچ لی۔ پھر وہ اسی تیزی سے اندر آئی اور گٹھری کو بڑے ٹرنک میں دھکیل دیا۔ اس کا دل بڑے بے تکے پن سے دھڑک رہا تھا۔ آخر ہوا کیا تھا اس کے جذبات اس قدر ڈانوا ڈول کیوں ہو رہے تھے۔ وہ گم سم سی باورچی خانے میں آئی۔ اور دال بگھارنے لگی۔ عین اسی وقت ایک پڑوسن اندر آئی۔ اور لمبی سی "سوں" کے بعد بولی۔ واہ بھئی تمہاری پکائی دال کا جواب نہیں۔ ایسی خوشبو اڑاتی ہو کہ آدمی کو دور سے کھینچ لاتی ہے۔ محلے میں ایک وہ نعیمہ کی ماں ہے 'گوشت کوئی ایسا منتر پڑھ کر بھونتی ہے کہ برہمن کی بیٹی مسلمان ہو جائے اور دال پکانے میں تم ایسا کمال کسی دوسرے کو حاصل نہ ہو گا۔" اس تعریف سے خوش ہونے کی بجائے اس کا دل کچھ اور سنجیدہ ہو گیا مہینے کے آخری دن تھے

اور مسلسل چھ دن سے دال پک رہی تھی۔ بگھار کی نامراد خوشبو ضرور سبھوں کی ناکوں تک پہنچتی ہو گی۔ مگر اب کیا بھی کیا جا سکتا تھا۔

پڑوسن ایک پاؤں دہلیز پر رکھ کر کھڑی ہو گئی تھی اس نے کھسیانے پن سے پڑوسن کی طرف دیکھا اور بولی۔ " آج ناغہ تھا نا؟" پڑوسن اس کی معذرت کو ان سنا کر کے بولی:

"ابھی نوشابہ کی آواز آئی تھی چلی گئی کیا۔"؟

"ہاں اسے کچھ شاپنگ کرنا تھی۔ سردی آرہی ہے بچوں کے لئے کچھ گرم کپڑے وغیرہ خریدنے تھے۔"

"ہاں بہن سردی تو واقعی آرہی ہے۔ ایک بارش ہو گئی تو گرم کپڑوں کی ڈھنڈیا پڑ جائے گی۔ چلو پھر ہم بھی کسی روز بازار چلیں۔"

"ضرور چلتی مگر میں نے بچوں کے کپڑوں اور اون کے لئے نوشابہ کو پیسے دے دیئے ہیں۔ اسے اس چیزوں کی بڑی پہچان ہے۔"

"تمہیں تو چار پانچ سو کا خرچہ پڑ جائے گا۔" "ہاں بہن ہر سال یونہی ہوتا ہے اب بچوں کو ننگا تو پھرا نہیں سکتے۔ ادھر بچے ایسے نخریلے ہیں کہ پرانا کپڑا دیکھ کر ٹھنکنے لگتے ہیں۔ گرمی آئے یا سردی آئے یہ فالتو خرچ اٹھانا ہی پڑتا ہے۔ بچے بھی ماشاء اللہ ایک پلٹن کے برابر ہیں۔" "اتنے بچوں کے ساتھ پانچ چھ سو میں کہاں پوری پڑتی ہے۔ گلبرگ میں زمین لے رکھی ہے۔ وہاں مکان بن جائے تو کرائے سے تو نجات ملے۔ سوچتی ہوں دو کمرے کھڑے کر کے چلے جائیں پھر آہستہ آہستہ بنتا رہے گا۔ مگر پہلے تو گراج بنانا پڑے گا۔ بس اسی خیال میں ہوں کہ کہیں سے کھلا پیسہ ہاتھ آ جائے تو کام شروع کروائیں اس سال نہیں تو اگلے سال تو انشاء اللہ اپنے مکان میں چلے جائیں گے۔

پڑوسن ہوں ہاں کئے بغیر مسکرا دی گویا یہ کہانی بہت پرانی اور کئی بار کی سنی سنائی تھی۔

پڑوسن چلی گئی تو اس کی آنکھیں پھر چھلک پڑیں آج تو اس نے آنکھیں پونچھ لیں اور کٹوریوں میں دال نکالنے لگی۔

دسترخوان پر جب سب بچوں کو بٹھا چکی تو اس کی نظریں دیر تک بچوں کے چہروں کو ٹٹولتی رہیں۔

کسی نے چہرے پر بھی کسی طرح کا برا تاثر موجود نہ تھا۔ گویا سب کچھ معمول کے عین مطابق تھا۔ حالات نے بچوں کو کیسا قانع بنا دیا تھا۔ خوش ہونے کی بجائے اسے دکھ ہوا' اگر اس وقت کوئی بچہ منہ بسور دیتا یا دال کی کٹوری فرش پر پٹخ دیتا تو اسے یقیناً بڑی خوشی ہوتی

کہ ابھی بچوں میں برے بھلے کی تمیز باقی ہے۔ بچوں کو یوں حالات کا عادی نہیں ہو جانا چاہیے تھا۔ اس کے ذہن اور جذبات پر مایوسی کی کہر سی چھا گئی۔

نوشابہ اور اس میں ایک سال کا فرق تھا دونوں کی شادی بھی ساتھ ساتھ ہوئی۔ یہ قسمت کی بات تھی کہ نوشابہ کی شادی ایک کھاتے پیتے گھرانے میں ہوئی۔ اس کے دو بچے تھے اور وہ ایک مطمئن اور خوشحال زندگی بسر کر رہی تھی۔

اس کے شوہر کی بھی تنخواہ معقول تھی اگر تھوڑی سی دوراندیشی سے کام لیا جاتا تو وہ بھی ایک خوشحال گھرانے کی بنیاد رکھ سکتی تھی۔ مگر ہوا یوں کہ شروع کے چار پانچ سال مزے سے گذرانے کے بعد جو بچوں کا تانتا بندھا تو سفید پوشی کی قلعی بگڑ کر رہ گئی۔ اور اب تو ان کی حالت اس قدر پتلی ہو چلی تھی کہ مہینے کے آخر میں کچھ نہ کچھ ادھار ضرور چڑھ جاتا۔ اور آج نوشابہ نے تو اسے گویا ذلت و رسوائی کی کیچڑ میں دھکیل دیا تھا۔

اپنی بے بسی پر آنسو بہانے کے بعد اسے ایک بار بھی نوشابہ کی ذہنیت پر غصہ آنے لگا تھا۔ آخر اس نے اسے سمجھا کیا تھا۔ وہ اتنی بھی گئی گذری نہیں کہ لوگ اس کی ہتک کرنے پر تل جائیں۔ اور ایسی حرکتیں کریں کل کو اس کے معصوم بچوں کو دوسروں کے طعنے سننے پڑیں۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کی سوچیں آ رہی تھیں اور اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اس بے عزتی کو نوشابہ تک لوٹا کر رہے گی۔ ساری بات چار سو روپوں کی تھی۔ اتنی معمولی رقم کے لئے وہ دوسروں کی نظروں میں کیوں ہیٹی ہو۔ اتنی رقم یقیناً کہیں نہ کہیں سے حاصل کی جا سکتی تھی۔ کیا وہ اتنا بھی نہیں کر سکتے۔ کوشش سے کیا حاصل نہیں ہو سکتا اگر یہ رقم مل جائے تو سردیوں کی فکر سر سے اتر جائے۔ تین چار سو کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔ وہ آج ضرور ان سے بات کرے گی۔ ایک تو وہ ایسے ست آدمی ہیں دوسرے لوگ ہاتھ پاؤں مارتے ہیں کئی ذرائع سے پیسہ کماتے ہیں مگر انہیں تو بس ایک کام آتا ہے صبح سے شام تک دفتر میں سر مارا اور ہر ماہ وہی لگی بندھی تنخواہ ہتھیلی پر دھر کر بے فکر ہو گئے۔ کہیں اور سے چار پیسے پیدا کرنے کی کبھی توفیق نہ ہوئی۔ لیکن اس بار خواہ کچھ ہو جائے انہیں تین چار سو کی فالتو رقم کہیں نہ کہیں سے ضرور پیدا کرنی پڑے گی۔ ورنہ اس وقت تک چین سے بیٹھنے نہ دوں گی۔ رقم ملنے کے امکانات پر غور کرنے کی بجائے وہ اخراجات کا حساب لگانے لگی۔ دو دو سوئٹر کچھ کپڑے اور جوتے بس اتنی رقم میں ضرورتیں پوری ہو جائیں گی۔ اس سوچ نے اس کے بوجھل دل اور ذہن کو ہلکا ہلکا کر دیا' وہ یوں اطمینان سے اٹھی جیسے ساری مشکلیں حل ہو گئی ہوں۔

اس نے بچوں کی طرف غور سے دیکھا جن کے دبلے اور زرد چہروں پر محرومی اور شکایت کی بجائے قناعت اور صبر کی چھاپ تھی۔ اور اس کا دل ایک بار پھر بلبلا سا گیا۔ پچھلے کئی دنوں سے دودھ بند تھا۔ اور چھوٹی بچی روٹی اور چاول سے بہلنے میں نہ آتی تھی۔ وہ ہر وقت دودھ کے لئے ہلکان ہوتی اور اس کی جان سے چمٹی رہتی، تنگ آکر وہ اسے بے تحاشا پیٹتی۔

اس وقت وہ روٹی کا سوکھا ٹکڑا منہ میں دبائے اسے چوس رہی تھی، یہ بھی ایک دن دوسرے بہن بھائیوں کی طرح اپنی محرومیوں کی شکایت کرنا بھول جائے گی۔ اس نے بچی کو گود میں اٹھا کر اس کا منہ چوما اور اپنے ہاتھ سے اس کے بکھرے بالوں کو سنوارا اور یوں اطمینان محسوس کیا جیسے اچھے دن بس آیا ہی چاہتے ہوں۔ پیسے کے محض تصور میں بھی کس قدر قوت ہے۔ کہیں سے رقم مل جانے کی توقع نے اسے مسرور کر دیا تھا۔ اب زندگی اتنی پھیکی اور مشکل نہ رہی تھی۔

اس دن اس نے سارے بچوں پر خصوصی توجہ دی اور اندھیرا ہوتے ہی انہیں بستروں میں تھپک کر سلا دیا۔ اس دن وہ ہمہ تن شوہر کی منتظر تھی۔ اس کا شوہر معمول سے قدرے دیر میں آیا۔ اس کے تھکے ماندے چہرے کو دیکھ کر اس کی ممتا ابل پڑی۔

"ہائے بے چارے دن بھر بھوکے پیاسے کیسے کام کرتے ہوں گے۔ جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں ادھر دفتر اتنا دور، وہ جلدی سے گلاس میں ٹھنڈا پانی لے کر آئی پانی پی کر اور لباس تبدیل کرنے کے بعد اس کا شوہر غسل خانے میں گیا تو وہ جلدی سے کھانا نکال لائی اس کا شوہر اس کے خلاف معمول مستعدی پر حیران ضرور تھا۔ مگر اس نے حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ سر جھکائے نوالے نگلتا رہا۔

اور وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ جب بیاہ ہوا تو یہ چہرہ کتنا خوبصورت اور بھرا بھرا تھا۔ رنگ کیسا صاف تھا۔ مگر اب تو جیسے کسی نے چہرے پر دھول بکھیر دی تھی۔ وہ پہلے والی بات نہ رہی تھی۔ صبح کئی دنوں سے استعمال شدہ بلیڈ سے شیو بنانے کی وجہ سے چہرے پر کئی جگہ خراش آگئی تھی۔ سچ وہ محض چند آنوں کے لئے شوہر سے جھگڑ کر اسے برا بھلا کہتی رہی تھی۔ اور اتنے زور زور سے چیختی تھی کہ اس کی آواز ضرور پڑوسنوں نے سن لی ہو گی۔ وہ بھی کسی وقت بالکل دیوانی ہو جاتی ہے۔ اسے یوں تو نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اب اسے اپنی اس حرکت پر ملال اور افسوس ہو رہا تھا۔ یوں لڑنے جھگڑنے سے کیا دکھ کٹ جاتے ہیں۔ مشکلیں آسان ہو جاتی۔ وہ بھی کیسی احمق ہے۔ اب وہ ایسا کبھی نہیں کرے گی

بلکہ باہمی مفاہمت میں اپنے دکھوں کا مداوا ڈھونڈے گی۔

رات کو بجلی بند کر کے جب وہ لیٹے تو اس نے آہستہ آہستہ گفتگو کا آغاز کیا۔

"سردی آرہی ہے۔ پچھلے دو سال سے بچوں کے لئے کچھ نہیں بنوا سکے۔ اب کے مجھے کہیں سے تین چار سو رقم ضرور لا دیجئے گا۔بس اتنے میں سب ٹھیک کر لوں گی۔"

"تین چار سو۔" اس کا شوہر حیرت سے کسمسایا۔ آج دن بھر سگریٹ نہیں پیا صبح کند بلیڈ سے شیو بنایا۔

"سن رہے ہیں۔"

"ہوں"

ہوں ہاں سے کام نہیں چلے گا۔ یہ رقم میں لے کر چھوڑوں گی آج تک کبھی کوئی فرمائش نہیں کی۔ قسم کھاؤ کبھی دوسری عورتوں کی طرح تنگ کیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ میری اس پہلی فرمائش کا کوئی احترام کرتے ہیں یا نہیں۔ آپ کو میری جان کی قسم میرا مردہ دیکھیں جو میری بات نہ مانیں۔ بس تین چار سو کہیں سے لا دیں۔ یہ رقم کوئی اتنی بڑی بھی نہیں کہ یوں چپ ہو گئے ہیں۔"

اس کا شوہر دم بخود لیٹا سوچ رہا تھا۔ تین چار سو پیدا کرنا گویا پہاڑ سے دودھ نکالنا ہے۔ یہاں تو کسی کا مردہ دیکھنے کا حوصلہ بھی نہیں ہے کیونکہ مردہ دیکھ کر مردے کو ٹھکانے بھی لگانا پڑتا ہے اور اس میں بھی خاصی رقم خرچ ہوتی ہے۔ مگر اس بے وقوف کو آج ہوا کیا ہے۔"؟

شوہر کی خاموشی سے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اب وہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔

"بس زندگی میں ایک بار فرمائش کی اور انہوں نے چپ سادھ لی۔ میری قسمت خراب ہے۔ آخر یہ معمولی رقم کیا آپ کے لئے بہت بڑی ہے کہ اس کے حصول کے خیال سے آپ خاموش ہیں۔ نہ ہوں نہ ہاں کچھ تو کہئے کیا ہمارے بچے بالکل گئے گذرے ہیں کہ آپ انہیں ننگے پھرتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ میری بات سن رہے ہیں۔؟"

"اس کا شوہر گھبرا گیا اس نے اندھیرے میں اسے نظروں سے ٹٹولا۔ پھر بولا۔

"نہیں۔ نہیں بھئی ایسی کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔ کوشش کروں گا کہیں سے مل جائے۔"

"کوشش نہیں وعدہ کیجئے۔"

"وعدہ۔"

"ہاں ہاں وعدہ چند دنوں کے اندر رقم دلوا دینے کا وعدہ۔"

"اچھا بھئی وعدہ ہی سمجھو۔"

"ہائے کیسا ڈھیلا ڈھالا وعدہ ہے پکا وعدہ کیجئے۔"

اس کے لہجے کے اطمینان اور شگفتگی پر اس کے شوہر کو ہنسی آ گئی۔

"آج یہ کسی احمقانہ باتیں کر رہی ہے۔ آخر ہوا کیا کسی نے کیا پھونک دیا کان میں۔ کیا واقعہ پیش آیا۔ اچھی طرح جانتی ہے۔ اس کے غریب شوہر کے لئے یہ رقم ہرگز معمولی نہیں ہے پھر بھی جانے کس وہم میں پڑی ہے احمق کہیں کی۔" مگر یوں سوچنے کے باوجود جب اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"بالکل پکا وعدہ لو اب خوش ہو جاؤ۔ تو اس نے اپنے دل میں فرحت محسوس کی۔ جیسے رقم حاصل کرنا واقعی کوئی مشکل بات نہ ہو۔ اسے خود اپنے الفاظ پر یقین سا آ گیا۔ ساری مشکل حل ہو چکی تھی۔ بہت دنوں بعد میٹھی اور گہری نیند آ گئی۔

صبح وہ بہت جلد اٹھی۔ ناشتہ تیار کیا۔ پہلے شوہر کو پھر بچوں کو کھلایا پلایا۔ پھر بچوں کے سر پر ہاتھ پھیر کر انہیں سکول رخصت کیا۔

اس وقت اسے سارا گھر محبت' شفقت' ہمدردی' سکون اور خلوص کی نعمت سے بھرا بھرا لگ رہا تھا۔ شوہر جب سائیکل تھامے باہر نکلنے لگا تو اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"آج انتظام ہو جائے گا نا۔"

اس کا شوہر مسکرا دیا۔

اب اتنی جلدی تو نہ ڈالو ایک ہفتے کے اندر ضرور کوئی نہ کوئی انتظام کر دوں گا۔

"ٹھیک ہے۔"

اس نے کسی اطاعت گذار بیوی کی طرح کہا۔ ابھی سردی بھی کونسی آ گئی تھی۔ کمروں میں ہلکے کپڑے اوڑھ کر سونے کا موسم تھا اور سوئٹر پہننے کا موسم تو حقیقت میں ابھی ایک ماہ بعد آنے والا تھا۔ بہت دن پڑے تھے۔

گھر میں ایک سکون سا پھیلا رہنے لگا تھا۔ لڑائی جھگڑے یکسر موقوف ہو چکے تھے۔ وہ دھیمی آواز میں بات کرتی اور گھڑی گھڑی بچوں کے منہ چوما کرتی۔ ان کی لڑائیاں بڑی خوش اسلوبی سے نپٹاتی اور رات کو دونوں میاں بیوی سونے سے پیشتر کچھ دیر گفتگو ضرور کرتے۔ گفتگو کے دوران دبی دبی ہنسی کی آواز بھی ابھرتی رہتی۔

روپوں کا ذکر اس دوران کسی نے ایک دوسرے سے نہیں کیا تھا۔

دونوں خاموش اور اپنے اپنے طور پر مطمئن تھے۔ اس رات اچانک زور کی آندھی چلی اور بارش کے ساتھ موٹے موٹے اولے گرے۔ اور صبح ہوتے ہوتے تھرتھری پیدا کر دینے والی سردی ہو گئی بادل بھی آئے ہوئے تھے۔

صبح وہ صندوق کھولے دیر تک پرانے رنگ اڑے سویٹروں کو آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہی۔ بڑے بچوں کے سوئٹر پھر بھی بہتر حالت میں تھے۔ مگر چھوٹے بچوں کے سوئٹروں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ کیونکہ وہ ایک کے بعد دوسرے بچے تک پہنچے تھے۔ اس نے خاموشی سے ٹرنک میں سے بندھی ہوئی گٹھری نکالی۔ اسے کھولا۔ گٹھڑی رنگ برنگے بمشکل ایک ایک سال پہنے ہوئے سوئٹروں اور گرم کپڑوں سے بھری ہوئی تھی' وہ دیر انہیں الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔ اس کا شوہر بھی پاس آکھڑا ہوا تھا۔ بچے بھی گھیراڈال کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اور للچائی نظروں سے سوئٹروں کو تک رہے تھے۔ اچانک اس نے نظریں اٹھا کر شوہر کی طرف دیکھا۔

شوہر کی نظروں میں ایک سوال تھا۔

"نوشابہ لائی تھی۔" وہ جذبات سے خالی سرد آواز میں بولی۔

"بالکل نئے ہیں۔"

"ہاں واقعی بالکل نئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے شوہر نے ہاں میں ہاں ملائی اور ایک سوئٹر ہاتھ میں لے کر اسے دیکھا۔ ببلی بولا۔ "امی یہ نیلا میں لونگا۔"

روبی بولی۔ "یہ سرخ والا مجھے دے دیجئے کیسا اچھا کالر لگا ہے۔"

"ریڈی میڈ ہے نا۔" ایک اور بچی نے کہا اس نے خاموشی سے سب بچوں کو سوئٹر پہنا دیئے۔ جب بچے اسکول اور شوہر دفتر چلا گیا تو وہ دیر تک پلنگ پر مردے کی طرح بے سدھ پڑی چھت کو تکتی رہی۔

وہ بندھی ہوئی گٹھری کھل گئی تھی۔ مگر اس کی حماقتوں اور ناعاقبت اندیشیوں کا بھید فاش ہو چکا تھا۔ یہ تو سچ مچ اس کے گناہوں کی گٹھری تھی۔ مگر ان گناہوں کی سزا اس کے بھولے بھالے معصوم بچوں کو بھگتنا پڑ رہی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ ایک پچھتاوے کے ساتھ اس نے سوچا اور آنسوؤں کے دو موٹے قطرے اس رخساروں پر لڑھک آئے۔

***

فرخندہ لودھی

کوپی

پیار کا کیا پتہ چلتا ہے؟ کب ہو؟ کس سے اور کیسا ہو؟ یہ تو نشہ ہے کہ چڑھے تو یوں لگے ہو گیا، کچھ ہو گیا۔۔۔ بیگم صاحبہ ماشاء اللہ دودھوں نہاتی، پوتوں کھیلتی تھیں۔ گھر میں کس چیز کی کمی تھی؟ ہر شے وافر، اس وافر کا مصرف ہی جان کا روگ ہو گیا۔ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں پال پوس کر بڑا کر چکی تھیں۔ بچے اپنی اپنی جگہ ذمہ دار اور سمجھ دار تھے۔ ان کا سب سے چھوٹا بیٹا زندہ ہوتا تو وہ بھی اب تک اٹھ نو برس کا ہوتا۔ چھوٹی بیٹی نجمی کے لاڈ پیار ایک عرصے تک چلتے رہے، لیکن وہ بھی سیانی ہو چکی تھی۔ بیگم کے میاں خاں صاحب ادھیڑ عمر کی انتہائی مصروف زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس عمر میں نہ تو ان کے پاس پاگل کئے رکھنے والے جذبات تھے اور نہ بڑھاپے کی مایوسیاں اور پچھتاوے۔ چالو مشین کی طرح ہر پرزہ ٹھیک اور عادی تھا۔

بیگم صاحبہ کو گھر کا کام اب کام نہ لگتا تھا۔ یوں بھی خاں صاحب اچھے عہدے پر فائز تھے۔ اردلیوں، چپڑاسیوں اور چوکیداروں کی کمی نہ تھی، ہر کام کے لئے ہاتھ باندھے حاضر باندیاں، بیکار پڑی جماہیاں لیتی رہتیں۔ پڑھی لکھی تھیں، لیکن اب کتابوں میں کیا رکھا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتیں: ”جوانی کیا گئی، جینے کا مزا جاتا رہا۔“

ایک روز انہوں نے اچانک جانے کس خیال کے تحت، نوکروں کو جمع کیا۔ اور اچھا خاصا لیکچر دیتے ہوئے کہا: ”جاہلو! تمہاری آئندہ نسلیں بھی جاہل ہی مریں گی۔ تم نوکر ہو۔ تمہارے بچے بھی برتن مانجھیں گے اور ہنڈیا چاٹیں گے“۔ نوکروں نے جواب دیا:

”جناب ہماری قسمت میں یہی لکھا ہے۔ کیا کریں؟ گھوڑے اور گدھے بوجھ نہ ڈھوئیں تو بھوکے مر جائیں۔“ بیگم صاحبہ کو ان کے اس احمقانہ جواب پر نہایت غصہ آیا۔ گویا انہیں شکست ہو گئی ہو۔

”جیو بھائی جیو۔۔۔ ہماری جیئے بلا۔“

”بھلا کوئی بہتر زندگی کا راستہ خاک سمجھائے۔ جب کہ لوگ اس پر چلنا قانون فطرت کی

نفی کرنے کے مصداق سمجھتے ہیں۔" وہ بیٹھی بڑبڑائے جاتی تھیں کہ خاں صاحب آئے۔ بیوی کا حال چال پوچھا تو پھٹ پڑیں۔ اپنی ذات کے اظہار کا خیال تھا یا اصلاح قوم کا جذبہ کہ انھوں نے ایک اسکول کھولنے کی اسکیم میاں کے سامنے پیش کی۔ خاں صاحب بیوی کا دل بہلائے رکھنا چاہتے تھے۔ بولے: "بیکار ذہن شیطان کا گھر ہوتا ہے۔ بس غریب پروری شروع کر دو' یہ ایک ایسا کام ہے جو کبھی بھی ختم ہونے کا نام نہیں لے گا۔ مشغلے کا مشغلہ' ثواب کا ثواب۔"

بیگم تو پہلے ہی تہیہ کئے بیٹھی تھیں۔ غریب والدین کو آمادہ کرنے میں بھی دیر نہ لگی۔ ہفتے کے اندر اندر گھر کے پچھلے آنگن میں دو تین درجن بچے تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جمع تھے۔

برآمدے کی سیڑھیوں پر بچے بیٹھ جاتے اور بیگم صاحبہ سامنے کرسی ڈالے آنکھوں پر عینک چڑھائے بوڑھی استانیوں کی طرح ہمیں چھڑی پکڑے سبق رٹوایا کرتیں۔ بچے تختیوں کی جگہ کچا فرش استعمال کرتے اور قلموں کے بجائے شہادت کی انگلیاں ـــــ لکھائی کا پیریڈ شروع ہوتا تو بچے زمین پر یوں رینگنے لگتے جیسے کیڑے۔ قاعدے اور دوسری ضروریات کی چیزیں بیگم صاحبہ نے خاص اپنی جمع شدہ پونجی سے خریدیں۔ پانی کے لئے کورے مٹکے رکھوا دیئے گئے۔ گھنٹی کی جگہ ٹین کا کنستر لٹکا دیا گیا جسے بچے وقت بے وقت کھڑکاتے تو بیگم صاحبہ کا پارہ چڑھ جاتا اور دل مسرت اور طمانیت سے یوں بھر جاتا جیسے وہ صرف یہی کام کرنے کے لئے دنیا میں تشریف لائی ہیں۔

ان ڈھیر سارے بچوں میں بعض کند ذہن تھے یا اپنے گھر کے ماحول کی وجہ سے پڑھائی میں دلچسپی نہ لیتے تھے' بعض اوسط درجے کا ذہن رکھتے تھے۔ بیگم صاحبہ کسی کے ساتھ تخصیص نہ برتتی تھیں۔ لگن اور پیار سے پڑھاتیں۔ انعام اور مٹھائی کا لالچ بھی دیتی تھیں' لیکن تین سالہ ہمایوں نے ان کے جی کو اپنی طرف یوں کھینچ لیا تھا جیسے وہ ان کا اپنا بچہ ہو۔ چھوٹا سا ذہن' سانولا' صحت مند ہمایوں کچھ ایسا دلکش تھا کہ بیگم صاحبہ کی نظریں اکثر اسی پر جمی رہتیں۔

"تو یہ ہے قدرت کیسے کیسے موتیوں کو مٹی میں رول دیتی ہے۔" وہ گھر والوں کے سامنے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتیں "پیار کی پرکھ کا انحصار کچھ عمر پر نہیں۔ بعض لوگ بڑھاپے تک اس رمز کو نہیں سمجھ سکتے اور کچھ بچپن ہی میں اس کا شعور رکھتے ہیں۔ ہمایوں اگرچہ چھوٹا سا تھا' مگر محبت بھری نگاہ کو پہچانتا تھا۔ پھر بڑے گھر کی آسودگی' بیگم صاحبہ کے

ساتھ ایسا مانوس ہو گیا کہ دن بھر گھر کا رخ نہ کرتا۔ وہ پچکار دلار کر کے بھیجتیں یا سو جاتا تو کوئی اٹھا کر لے جاتا۔ لیکن دوسری گیٹ پر منے منے ہاتھوں کی دستک ہوتی۔ "اماں جان واجہ کھولیئے۔ آگیا ہوں۔"

ماما' بیگم کے سارے حواسوں کو چوکا دیتی اور گیٹ کھولنے کے لئے لپکی چلی جاتیں۔ چھوٹے سے میلے کرتے کا کھلا گریبان' پشت کی طرف ڈھلکا ہوا۔ آگے سے دامن اٹھا ہوا۔ ننگو منگو سا ہمایوں گیٹ کھلنے کا انتظار کر رہا ہوتا۔ بیگم کو دیکھتے ہی فوراً ماتھے پر ہاتھ رکھ دیتا۔

"چھلام اماں جان۔" بیگم صاحبہ جھوٹ موٹ چونکتیں۔

"ارے—— تو اتنی صبح—— اور تو جا گیہ کیوں نہیں پہنتا رے—— ننگو منگو۔" وہ ہنستے ہوئے اس کا بازو کھینچتی اندر لے جاتیں۔

جب بیگم صاحبہ تلاوت کلام پاک کر رہی ہوتیں۔ ہمایوں کچھ دیر چپ چاپ سنتا رہتا۔ پھر کلام پاک کے اوراق کو انگلی سے چھونے کی کوشش کرتا تو بیگم صاحبہ ہولے سے ہاتھ جھٹک دیتیں۔ "گندے ہاتھ ہیں بیٹے۔" پھر وہ گندے ہاتھ دھلوانے کے لئے لوگوں کو جگاتا پھرتا۔

"باجی! اٹھئے نا—— آپا جاگو بھی دن ہو گیا—— ابو چھوئے ہیں ہاہا——"

بھائی جان کے پلنگ کے قریب جا کر وہ ابو کا مذاق اڑاتا—— جھوٹی نیند کے نشے میں کوئی کھلی آنکھ سے دیکھتا تو ہمایوں جھٹ سے "چھلام" داغ دیتا۔ اپنی پیاری باتوں سے اس نے گھر کے تمام افراد کے من موہ لئے تھے۔ عفت آپا نے جو انگریزی ادب کی طالبہ تھیں اس ننگے پیارے بچے کا نام "کیوپڈ" رکھ دیا۔ اب سارا گھر اسے کیوپڈ کہتا۔

ہمایوں کے گھر میں اس طرح گھل مل جانے سے بیگم صاحبہ کو یوں لگتا جیسے ان کا چھوٹا بیٹا نعمان واپس آگیا ہو جس کے لئے تنہائی میں بیٹھ کر وہ آنسو بہایا کرتی تھیں۔

بچوں کا سکول جیسا تیسا چل نکلا تھا۔ بیگم صاحبہ مصروف رہتیں۔ ان کی مصروفیات میں ہمایوں کا کتنا حصہ تھا انہیں معلوم نہ تھا۔ وہ ایک محبوب ذمہ داری تھی کہ سب خوشی خوشی نبھاتے۔ عفت آپا یونیورسٹی سے لوٹتیں تو کبھی خالی ہاتھ نہ آتیں۔ بھائی جان بازار سے کھلونا نہ لا سکتے تو کاغذوں اور تیلیوں سے پھرکیاں' جہاز اور جانے کیا کیا بنا کر دیتے رہتے۔ اور باجی نجمی اپنی سلائی' رنگائی' دھلائی کے سارے ارمان ہمایوں پر پورے کرتیں۔ گھر بھر کے کپڑوں میں سے بچے ہوئے ٹکڑے خوب کام آ رہے تھے۔ وہ مختلف رنگوں کے ٹکڑوں

کو ملا جلا کر لباس کے نئے نئے ڈیزاین ایجاد کرتیں۔ ہمایوں کے سڈول بدن پر ایسے پھبتے کہ سب داد دیتے۔

نجھی نے ہمایوں کو کیوپڈ سے "کوپی" کہنا شروع کیا تو سب لوگ ہمایوں کو یکسر بھول گئے۔ کوپی پیارا اور مختصر نام تھا جو خود کوپی کو بھی پسند تھا۔ وہ بڑے فخر سے لوگوں کو بتاتا "میں کوپی ہو—— پیار کا تیر چلانے والا دیوتا۔"

یہ بات اسے عفت آپا نے اچھی طرح رٹوا دی تھی۔

غریب بستی کے لوگ کوپی کو دولت مند گھرانے کا لاڈلا دیکھ کر جلتے تھے۔ بیگم کو طرح طرح وسوسے اور وہم ستانے لگے۔ انہوں نے کوپی کی ماں سکینہ کو بلا کر کہا کہ اگر وہ پسند کرے تو بچہ مستقل ان ہی کے گھر میں رہے۔ وہ اسے اپنے بچوں کی طرح پالیں پوسیں گی اور پڑھا لکھا کر نوکر کروائیں گی۔ سکینہ کو اور کیا چاہئے تھا۔ اک ذرا ماما کی جابر لہرنے کلیجے کو تلپٹ کیا۔ اسے تسلی تھی کہ بچہ ہمیشہ آنکھوں کے سامنے رہے گا۔ اور اس کی زندگی بھی بن جائے گی۔

کبھی کبھی جانے کیوں چھوٹے چھوٹے لقمے بنا کر کوپی کے منہ میں ڈالنے کے لئے سکینہ کا جی تڑپ اٹھتا۔ اس کے اور بھی چار چھ بچے تھے' لیکن کوپی آٹھویں دسویں روز اس سے ملنے کے لئے آتا تو وہ اسے ٹھونس ٹھونس کر دال روٹی کھلاتی۔ وہ مزے مزے سے کھائے جاتا۔ شام کو واپس جاتا تو کپڑے میلے اور پیٹ میں زیادہ کھانے کی وجہ سے اینٹھن ہوتی۔ بھائی جان ڈاکٹر تھے' گھر پر علاج معالجہ کر لیتے۔ اس روز کی بک بک سے تنگ آکر بیگم صاحبہ نے نیا حکم جاری کیا کہ سکینہ اپنے تمام بچوں کو ملانے کے لئے آیا کرے۔ جس دن سکینہ بچوں سمیت آتی تو برآمدے میں چارپائیاں ڈال دی جاتیں اور دال بھات کی دعوت ہوتی۔ بہن بھائی جانے لگتے تو کوپی تھوڑی دیر کے لئے چپ سا ہو جاتا۔ سکینہ حسرت بھری نظریں ڈال کر چل دیتی۔ بیگم صاحبہ سے یہ نظریں برداشت نہ ہوتی تھیں۔ ایک دن ان سے رہا نہ گیا تو انہوں نے سکینہ کو سمجھاتے ہوئے کہا:

"دیکھ بی بی اگر تو اپنے بچے کی بہتری چاہتی ہے تو تھوڑی سی جذبات کی قربانی دینی پڑے گی۔"

"اچھا بیگم صاحبہ۔"

سکینہ بظاہر مسکراتی ہوئی رخصت ہوئی' مگر اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے خیال سے بیگم صاحبہ کا جی ہمیشہ غوطے کھاتا رہا۔

رفتہ رفتہ کوپی کو اپنے گھر والے اور ماحول بھولتے گئے۔ اب وہ ذرا سی بھی گندگی برداشت نہ کرتا تھا۔ مزاج کے خلاف کوئی بات ہوئی' ضد کرنے لگا۔ اسکول کے دوسرے بچوں سے اپنے آپ کو الگ اور ارفع سمجھتا۔ کیونکہ اس کے پاس رنگ برنگی بش شرٹیں' نئے نئے سوٹ اور بوٹ' سوئٹر اور خوبصورت ٹوپیاں تھیں--- اسکول کے معاملات میں وہ اچھا خاصا بیگم کا مدد گار ثابت ہو رہا تھا۔ ہاتھ میں چھڑی پکڑے' ادھر ادھر بھاگتے بچوں کو گھیر لاتا اور ان کی منی منی شکائتیں بھی کرتا--- بچے اس سے دبتے تھے۔ بعض جی دار موقع پاکر چھوٹے سے کوپی کی اچھی طرح مرمت کر چھوڑتے۔ وہ روتا چیختا بیگم صاحبہ کے پاس آتا۔ وہ بچوں کی ماؤں کو بلواتیں اور رعب سے کہتیں۔

"اپنے لڑکوں کو سمجھاؤ--- میں تو سب کا بھلا چاہتی ہوں۔ کوپی بچہ ہی ایسا ہے۔ خود پیار لیتا ہے۔"

ایک ماں نے چمک کر کہا: "اپنا اپنا نصیب ہے بیگم صاحبہ! آپ نے اسے گود لے لیا ہے تو اپنے بچوں کی طرح اچھے اسکول میں بھجواؤ نا۔"

عورت کی اتنی بات بیگم صاحبہ کے سینے کو چھیدتی چلی گئی۔ اب خلوص سے زیادہ انا کا سوال تھا۔ وہ اپنے پیار کو نیچا نہ دیکھنا چاہتی تھیں۔ اچھے اسکول میں داخلے کے لئے تگ و دو شروع ہوئی۔ ہزار کوششوں اور سفارشوں سے انگریزی اسکول میں سیٹ مل گئی۔ اب کوپی بڑے ٹھاٹھ سے بھائی جان کے ساتھ اسکوٹر پر بیٹھ کر پڑھنے جاتا۔ نئے اسکول میں کوئی نہ جانتا تھا کہ اس کا باپ پھیری والا ترکاری فروش ہے اور اس کی ماں لوگوں کے گھروں میں برتن مانجھتی ہے اور اس کے ڈھیر سارے بھائی بہن نہایت ندیدے' کمزور' زرد رو اور گندے ہیں۔ بات بے بات گالیاں دیتے اور لڑتے ہیں۔ کوپی تو صاف ستھرا صحت مند بچہ تھا اور پھر آنکھوں میں فرشتوں کی سی معصومیت اور قناعت--- اور ایک دلفریب مسکراہٹ کہ آسودہ حالی کی شاہد تھی۔ دمکتی رنگت کہتی تھی' کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ وہ اپنی عمر کے مطابق آداب مجلس بھی سیکھ گیا۔ میز کرسی نہ ہو تو اسے کھانے کا مزہ ہی نہ آتا۔ بڑوں کے درمیان نہایت تمیز اور سلیقے سے بیٹھتا اٹھتا اور بات چیت کرتا۔ نجمی اس کی اتالیق تھی اور ہمجولی بھی۔ وہ اس بات مانتا بھی تھا اور ٹالتا بھی۔

کوپی کچھ سمجھ دار ہوا تو خاں صاحب نے اچھے علاقے میں نیا گھر بنوا لیا۔ بھائی جان نے وہاں اپنا کلینک کھول لیا۔ نجمی کا کالج بھی اسی طرف پڑتا تھا اور کوپی کا اسکول بھی۔ اس کے علاوہ جب سے انہوں نے کوپی کو گود لیا تھا۔ غریب طبقہ در پردہ ان کے خلاف ہو گیا

تھا- عورتیں تو برملا کہا کرتیں: "کیا لال جڑے تھے چھوکرے میں-"

ضد میں آکر' ایک ایک کر کے' لوگوں نے اپنے بچوں کو بیگم صاحبہ کے اسکول سے اٹھا لیا- گلیوں میں آواز پھرتے' بیگم کی ٹیں تو ٹوٹی-

غریبوں اور جاہلوں میں محبت اور نفرت دونوں وقتی جذبے ہوتے ہیں- غور و فکر اور ریا کاری کے نہ ہونے کے باعث کوئی جذبہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہتا-

خاں صاحب نے اس علاقے سے اپنا ڈیرہ اٹھا کر اپنا بھلا کیا- نئے گھر میں جانے سے سب کو فائدہ ہوا- پر سکینہ کو یوں لگتا تھا جیسے زندگی کی کچھ سانسیں کم ہو گئی ہیں- خاں صاحب کی کوٹھی کیا خالی ہوئی سکینہ کی گود خالی ہوگئی- اتنے بچوں کی ماں' سکینہ' کوپی کے لئے کوکھ پکڑ کر رہ گئی- روتی تھی اور یاد کرتی تھی- اس کا میاں بھی ایک دو روز چپ سادھے رہا- سکینہ کی اداسی ختم نہ ہوئی تو تنگ آکر اس نے بیوی کو دو چار لگائیں اور کہا:

"جو لڑکا مر جاتا تو کیا کر لیتی- بھلے لوگ اس کی زندگی بنانا چاہتے ہیں اور تیری مامتا موڑا ہی نہیں لیتی—— جا—— جا کر لڑکے کو واپس لے آ-"

ہفتہ عشرہ بعد کوپی ملنے کے لئے آتا تو سکینہ کھوج کھوج کر پوچھتی "تو باجی والے کمرے میں مسہری پر ہی سوتا ہے نا؟ تجھے میز پر ہی کھانا کھلاتے ہیں نا؟ اور تو کار میں اسکول جاتا ہے"؟

بیگم صاحبہ کے سلوک میں کہیں بھی تو ڈھیل نہ تھی- یونہی آتے جاتے کوپی سیانا ہو گیا- سکینہ کو اسے واپس لانے کی کبھی ہمت نہ ہوئی-

بارھویں سال میں قدم رکھ کر بچے زقندیں بھرنے لگتے ہیں- کبھی جوانی کا احساس ہوتا ہے' کبھی بچپن کا—— من مانی کرنے کو جی بے قرار رہتا ہے- گھر سے باہر کی دنیا میں تحقیق و دریافت کے لئے طبیعت مچلتی ہے- اور وجود کے اندر چونکا دینے والی دنیائیں جنم لیتی ہیں- بچے چاہتے ہیں کہ لوگ ان کے نئے وجود کو جلدی تسلیم کر لیں- اپنی ذات آزمانے اور منوانے کے مواقع کچھ گھر سے باہر ہی میسر آ سکتے ہیں-

کوپی اس عمر کو پہنچا تو اسے قید و بند سے آزاد ہونے کے کئی مواقع تھے- سکینہ کے گھر میں ہر قسم کی نازیبا حرکات کی جا سکتی تھیں' جہاں چاہے' جس طرح چاہے اٹھے بیٹھے' آئے جائے' گالی دے یا برائی کرے' کوئی نہ ٹوکتا تھا- چھٹی کے روز ملنے کے لئے آتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے پر اگ آئے ہیں اور پنجرے کی تیلیاں کمزور پڑ گئی ہیں- وہ انہیں توڑنا چاہے تو کسی وقت بھی توڑ سکتا ہے- یہاں ہر وقت گھرکیاں دینے والی باجی نچھی نہ

تھیں۔

"دیکھو' یونیفارم بدلو۔ پھر کھانا ملے گا۔ امی یہ گندے لڑکوں کے ساتھ کھیلتا ہے۔ امی اس نے میرا نیل پالش کاغذوں پر لیپ کر پھول بنائے ہیں۔ وغیرہ۔" نہ عفت آپا تھیں کہ ساتھ چلتے ہوئے کہیں:

"تمیز سے چلو۔ راستہ دیکھ کر چلو۔ یہ کبوتر' یہ پتنگ ایک دن ضرور تیرا ایکسیڈنٹ کروائیں گے۔"

ماں کے گھر میں تو وہ پتنگ لوٹتا لوٹتا' گلیاں' بازار' جوہڑ اور کوڑے کے ڈھیر' سب اپنے پاؤں سے پامال کر دیتا۔ اور اسے کوئی روک نہ سکتا تھا۔ بھائی جان اسکول کا کام نہ کرنے پر کان کھنچائی' کرنے یہاں نہ آتے تھے۔ سکینہ کے گھر کی فضا کھلی اور آزاد تھی۔ پڑھا لکھا رہے ہیں تو اپنے فائدے کو۔ روٹی' کپڑے پر پڑھا لکھا غلام کیا برا؟۔"

سکینہ ان پڑھ اور غریب تھی جو بیٹے کو پیدا ہوتے ہی' لکشمن داس' سمجھتی تھی' اس کے دوسرے دو لڑکے تنوروں پر روٹی برتن پکڑانے پر ملازم ہو گئے تھے۔ وہاں وہ کھانا بھی کھاتے اور دس روپے ماہوار ماں کو بھی لا کر دیتے۔ سکینہ ان پر اعتماد کرتی تھی۔ ان کے مقابلے میں کوپی نازوں میں پلا' بگڑا ہوا چھوکرا تھا۔ کبھی ماں کے لئے کوئی تحفہ وغیرہ لے بھی آتا تو سکینہ کا دل خوش نہ ہوتا۔

ادھر بیگم صاحبہ کے گھر میں کوئی چور گھس آیا تھا۔ چھوٹے موٹے کپڑے' لڑکیوں کی زیبائش کی چیزیں' پن' پنسلیں' آئے دن کوئی نہ کوئی چیز غائب ہوتی۔ شروع شروع میں کسی کو بھی اندازہ نہ ہوا' لیکن جب تواتر سے چوریاں ہونے لگیں تو گھر کے ملازمین سے پوچھا گیا۔ ڈرایا' دھمکایا اور تنخواہ کاٹنے تک کی دھمکیاں دی گئیں۔ چیزیں گم ہونے کا تسلسل تو نہ ٹوٹا البتہ وقفے لمبے ہونے لگے۔ کوپی پر کوئی بھی شک کرنے کو تیار نہ تھا۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ کوپی پر الزام لگانا گناہ خیال کرتا۔ بیگم کے منہ سے بات نے نکلنا چاہا بھی تو انہوں نے روک لی' گویا بھرے بازار اپنی توہین کا اعتراف کرنے کا ان میں یارانہ تھا۔ مگر کوپی کے لئے اتنے برسوں سے پلا ہوا پیار کا پودا اتنی پکی جڑیں پکڑ چکا تھا کہ شبہ کی آنچ اسے جھلسا تو سکتی تھی جڑ تک جلا نہ سکتی تھی۔

کوپی اب گھر سے دن دن بھر غائب رہتا۔ کوئی پوچھتا تو بے تکا سا جواب دیتا یا بسورنے لگتا اور بیگم کا جی ابل آتا۔ "اے ہے اس عمر میں لڑکے ایسے ہی کرتے ہیں ٹھیک ہو جائے گا۔"

وقت گذرتا گیا۔ بیگم صاحبہ بچوں کے بیاہ شادیوں کے چکر میں پڑ گئیں۔ اب کوپی کی عمر سترہ برس تھی اس نے میٹرک پاس کر لیا تھا اور بیگم صاحبہ سوچ رہی تھی کہ کہ اسے کالج میں داخل کروا دیں۔ عفت آپا شادی کے بعد بچوں والی ہو گئی تھیں۔ بھائی جان پسند کی لڑکی کے خیال میں اب تک کنوارے بیٹھے تھے۔ نجھی نے کسی کو پسند کر کے فیصلہ بھی دے دیا تھا۔ منگنی ہو چکی تھی۔ مہمان نوازیاں زوروں پر تھیں—— آنا جانا' مہمان' ملنے والے—— نجھی ہر وقت مصروف رہتی۔ وہ اب کوپی کے ساتھ کم سے کم بحث کرتی اور کوپی اپنے آپ کو تنہا تنہا محسوس کرتا۔

نجھی کے ساس سسر آئے ہوئے تھے۔ وہ گھبرائی گھبرائی گھر کے کاموں میں لگی ہوئی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے قسم قسم کے کھانے تیار کر کے سجائے لگائے۔ آخر میں خود بننے سنورنے لگی تو منگنی کی انگوٹھی غائب——!

اتنے ارمان بھرے دن میں شگون کی انگوٹھی گم ہو جائے۔ لوگوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ دبی دبی باز پرس ہوئی۔ نجھی کی ساس کے کان میں بھنک پڑی تو وہ چیخ اٹھیں۔

"کوپی سے پوچھو—— اس عمر میں بچوں کو ایسی لت پڑ جاتی ہے—— پوچھ لینے میں کیا حرج ہے۔"

کوپی نے بڑی بی کو یہ کہتے سنا تو منہ پھلائے گھر سے چلا گیا۔ اس کے اس طرح چلے جانے پر سب افراد پریشان تھے۔ انہیں بڑی بی سے شرمندگی بھی تھی اور ان پر غصہ بھی آرہا تھا۔

گھر کو ایک مسلسل اور بوجھل قسم کی خاموشی نے گھیر لیا۔ کوئی بھی ایک دوسرے سے کھل کر بات نہ کرتا تھا۔ رات کے کھانے پر بھی مزیدار گفتگو نہ ہو سکی۔ کسی نے بھی خوشگوار موضوع چھیڑنے کی کوشش نہ کی۔ میز پر کوپی کی جگہ خالی تھی۔ اس کی غیر موجودگی کا سب کو احساس تھا۔ وہ دیر تک اس کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ حتیٰ کہ رات ڈیڑھ بج گیا۔

نیند ابھی کچی پکی تھی۔ باہر کے کمپاؤنڈ کا گیٹ زور سے کھڑکا۔ بیگم صاحبہ دوپٹہ سنبھالتیں' اللہ اللہ کرتی اٹھیں۔

"پر یہ کوپی کے ہاتھوں کی دستک تو نہ تھی—— وہ تو آہستہ سے بجاتا ہے۔

بیگم سوچتی اور قیافے لگاتی چلیں۔ گھر کے تمام افراد' نوکر چاکر جاگ اٹھے تھے۔ بتیاں روشن ہو گئیں—— بیگم نے باہر جھانک کر دیکھا۔ کئی مرد کھڑے تھے۔

"پولیس ـــ"

بیگم صاحبہ کا جی دھک سے رہ گیا ـــ اسی اثنا میں ان کا بیٹا دیوانوں کی طرح چیختا اندر داخل ہوا۔

"امی امی ـــ کوپی مر گیا ـــ اس نے خودکشی کر لی امی!"

پھر کیا تھا۔ آن کی آن میں گھر میں کہرام مچ گیا۔

کوپی کا خط پڑھ کر سب نے مان لیا کہ اس نے خودکشی کی ہے۔ اس کی لاش دیکھ کر سب کو یقین تھا کہ وہ مر گیا ـــ لیکن یہ کوئی نہ جان سکا کہ وہ کیوں مر گیا ـــ کیوپڈ کا تیر الٹا کیوں چل گیا؟

٭٭٭

مسرت لغاری

معمولی باتیں

میرے ساتھ وہ بظاہر بالکل معمولی باتیں کر رہی تھی—— ایک مڈل پاس لڑکی بلکہ چھوٹی سی عمر میں چھ بچوں کی ماں لڑکی ان باتوں کے علاوہ اور باتیں ہی کون سی کر سکتی تھی؟

وہ دو کوٹھیاں چھوڑ کر ہمارے ہمسائے نجم صاحب کی بھانجی ثریا بانو تھی۔ کبھی کبھار کاموں سے تھک ہار کر اپنے آدھ درجن بچوں کو سلا کر میرے پاس آن بیٹھتی تھی—— وہ حد درجہ بد صحت تھی مگر اسے بد صورت ہرگز نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ اس کے حسن کے باقیات ابھی بھی اس کے چہرے کے نقوش میں سے جھانکتے رہتے تھے—— خاوند نے اسے ایک سے سات وجود کر کے چھوڑ دیا تھا یا خدا جانے وہ خود ہی اسے چھوڑ آئی تھی بہر حال آجکل وہ اپنے ایک بے حد امیر ماموں کے گھر میں پناہ گزین تھی اور جس طرح ہر امیر آدمی اخلاق اور دل کا فقیر ہوتا ہے اسی طرح اس کے ماموں کا بھی تقریباً یہی حال تھا۔ البتہ ثریا بانو کے بیان کے مطابق اس کی ممانی دل کی بری نہیں تھی—— انسانی بنیادوں پر اس کی عزت کرتی تھی اور اس کے بچوں پر بھی بچوں والی نظر ڈالتی تھی——! میں نے اس کی کہانی کریدنا چاہی تو اس نے آسانی سے اتنی بڑی بڑی کریہہ حقیقتیں بیان کر دیں کہ میں دم بخود ہو کر اس کا منہ دیکھتی رہ گئی—— وہ ایک کھلی کتاب کی طرح میرے سامنے تھی اور میں بغیر کسی دقت کے اسے پڑھ رہی تھی بلکہ اس کی باتیں سن سن کر پہلی بار مجھے اعتبار آیا کہ واقعی طوفان اپنا راستہ خود بنا لیتا ہے—— اس کے اندر رنج اور غصے کا جو وحشی طوفان چھپا ہوا تھا جاہل ہونے کے باوجود وہ اس کو بڑے مناسب زاویوں سے راستہ دے رہی تھی—— وہ ہر بات کے دوران میرے احساسات اور دل و دماغ پر صحیح صحیح نشانے لگا رہی تھی—— ہو سکتا ہے وہ خود نہ جانتی ہو کہ وہ کیا کہہ رہی ہے مگر میں خوب اچھی طرح جان رہی تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے یا کیا کہنا چاہتی ہے؟—— وہ بڑی معصومیت کے ساتھ معصوم سے الفاظ میں اپنا مطلب بیان کر رہی تھی جسے میں اپنے الفاظ میں ڈھال کر سمجھتی چلی جا رہی تھی——!

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے اس سے یہ کہا کہ بانو بی بی اپنا گھر پھر اپنا گھر ہوتا ہے اسے توڑ پھوڑ کر کیوں آگئی ہو؟ تو اس کے چہرے پر ایسی وحشت و نفرت ابھری تھی کہ ایسا منظر نہ میں نے پہلے کبھی دیکھا تھا نہ کسی نے دیکھا ہو گا وہ ایک آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ پڑی تھی- اس کا بس چلتا تو یہ بات سن کر وہ میرے منہ سے میری زبان کھینچ لیتی مگر میں نے دیکھا وہ انتہائی تحمل سے بیٹھی آنسو بہا رہی تھی—— تھوڑی دیر وہ سر جھکائے رہی پھر شدید نفرت اور بے یقینی کے کھا جانے والے احساس کے ساتھ میری طرف دیکھا اور بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں میری معمولی سی بات کا جواب دینے لگی:

بیگم صاحبہ یہ آپ کہہ رہی ہیں؟ عورت ہو کر بھی یہ کہہ رہی ہیں؟ میرے کلیجے میں آپ نے چھرا مار دیا ہے—— بھلا عورت بھی کبھی اپنا گھر چوکھٹ چھوڑتی ہے؟ غیر کے گھر جانے کے بعد لمحہ لمحہ بے غیرتی اور بے عزتی کے کالے غار میں اترتی رہتی ہے مگر چپ رہتی ہے—— یہ خدا کا اور لوگوں کا اور ساری دنیا کا ظلم نہیں تو اور کیا ہے کہ عورت ہے تو سارا الزام اسی پر آ جاتا ہے کوئی اس کے مالک سے جا کر کیوں نہیں پوچھتا کہ یہ سب کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ میرا میاں نکھٹو تھا چرسی تھا لوگوں کے گھروں میں کام کر کر کے جب میں اپنی ہڈیوں کا ست نچوڑ کر آتی تھی تو میری انہی ہڈیوں پر مارتا تھا پیسے چھین لیتا تھا پر میں منہ سے کچھ نہیں بولتی تھی کہ ایک پردہ جو خدا نے رکھا ہوا تھا وہ نہ اترے—— ننگی نہ ہو جاؤں اس طرح میں دو جسمانی اور ایک روحانی تین ماریں کھا رہی تھی—— آخری بچہ ہوا تو مجھے یرقان ہو گیا بستر سے لگ گئی—— نشی کا نشہ ٹوٹ گیا وہ قہر بن گیا—— ایک دن میں نے کہا کچھ کما کر لاؤ مجھ سے بھوکے بچے بلکتے ہوئے نہیں دیکھے جاتے

"بس اتنی سی بات کی تھی میں نے —— !"

"مجھے بتاؤ بیگم صاحبہ اس بات میں میرا کتنا قصور نکلتا ہے؟ جتنا آپ کہیں گی مان لوں گی کیونکہ میں عورت ہوں اور عورت وہ قصور بھی مان لیتی ہے جو وہ کرتی تک نہیں ہے —— اب مجھے دیکھیے ماں باپ نے مجھے پیدا کر کے چھوڑ دیا ہے—— میری پیدائش میرا قصور نہیں ہے پھر بھی اپنا قصور مانتی ہوں زندگی ایک قصور ہے ناں؟—— جس کی سزاوار در بدر دھکے کھا کر پوری کر رہی ہوں۔"

"ایسا مت کہو ثریا بی بی ایسا مت سوچو—— میں نے کہا۔

"لیکن تم نے کمانے کی بات کی تو تمہارے شوہر نے کیا کیا؟" میں بات کی تہہ تک پہنچنا چاہتی تھی۔

میں نے دیکھا وہ دونوں گھٹنوں میں سر رکھے دھاروں دھار رو رہی تھی پھر سسکی جیسے لہجے میں کہنے لگی:

بیگم صاحبہ آپ وہ کچھ نہ پوچھیں اور نہ سنیں جو اس نے کہا تھا اور جس کو سننے کے بعد میں ماموں کے گھر میں آکر نوکرانی ہو گئی ہوں"—— "پھر بھی کچھ تو بتاؤ"—— میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے پوچھا:۔

"اگر آپ مجبور کرتی ہیں تو سنیں—— اس نے کہا تھا نکل جاؤ یہاں سے——! عورتوں کے کمانے کے کئی طریقے ہیں میری طرف سے تمہیں ہر طریقے کی اجازت ہے——

بس اس کی یہ بات میرے لئے آخری بات تھی—— طلاق کے تین حرفوں سے بھی اوپر تھی میں اٹھ کر چلی آئی—— بتاؤ بیگم صاحبہ میں نے ٹھیک کیا ناں؟" وہ مجھ سے براہ راست مخاطب تھی اپنے راست اقدام کی مجھ سے تصدیق چاہتی تھی مگر میں گم سم بیٹھی تھی—— میں کسی بھی قسم کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھی—— میری نظریں جھکی ہوئی تھیں اور وہ خود ہی بڑبڑا رہی تھی—— میں نے سنا وہ کہہ رہی تھی۔

"بیگم صاحبہ اچھا کیا اس نے مجھے گھر سے نکال دیا—— بھلا وہ میرا کیا لگتا تھا؟ لگتا تو وہ اپنے بچوں کا بھی کچھ نہیں تھا تبھی تو انہیں صبح کی گندی تھوک کی طرح زمین پر پھینک دیا ہے—— وہ ہر صبح میرے لئے بھی اجنبی بن جاتا تھا—— بوٹی کے نشے میں وحشی ہو کر ہر رات اور پوری رات وہ میرے نحیف وجود پر دنگا فساد کرتا تھا—— لیکن میں کیا کر سکتی تھی؟ کیا کہہ سکتی تھی یا کوئی بھی بیوی کیا کر سکتی ہے؟—— نکاح کے بعد شرع قانون ایسی باتیں کھولنے کی اجازت ہی نہیں دیتا——! بیگم صاحب میں حرف حرف سچ کہہ رہی ہوں آپ خود بتائیں میں کیسے آپ کو اعتبار دلاؤں؟"

"اعتبار دلانے کی کیا ضرورت ہے ثریا بی بی—— میں نے کہا

"تمہارا سچا کھرا لہجہ ہی تمہاری بات کا اعتبار ہے پر ایک بات بتاؤ آخر وہ ایسا کیوں تھا؟کوئی وجہ تو ہو گی!"—— تب وہ پھٹ پڑی۔ "لے پوچھتی ہے کہ وہ فلاں کام کیوں کرتا ہے؟ مرد کی ذات تو ہمارے لئے خدا کی ذات ہوتی ہے اور خدا سے کون پوچھ سکتا ہے کہ وہ کیا کرتا ہے اور کیوں کرتا ہے؟ دنیا بھر میں ظلم اور ناانصافیاں دیکھی ہیں؟ کال' جنگیں' زلزلے اور فاقے دیکھے ہیں؟ پر کون پوچھ سکتا ہے اس سے؟——"

وہ مسلسل بول رہی تھی اور رو رہی تھی۔ وقتی طور پر میرے ذہن میں ایک حل آیا میں نے کہا۔

Scanned by CamScanner

"چلو ثریا چھوڑو ان دکھوں کو۔۔۔ تم یوں کرو اگلے ہفتے میرے ساتھ لاہور چلی چلو میں بہن کو ملنے جا رہی ہوں۔۔۔ صرف چھوٹے کو لے چلنا باقی بچوں کو تمہاری بیٹی سنبھال لے گی۔۔۔ جہاز پر جائیں گے۔"

جہاز کا سن کر وہ سارے غم بھول گئی خوش ہو کر بڑی حیرت سے پوچھا جہاز کیا بہت اونچا اڑتا ہے بیگم صاحبہ؟

"ہاں بہت اونچا۔۔۔ "میں نے کہا۔

"رب سے بھی اونچا چلا جاتا ہے؟" اس کے معصوم سوال پر مجھے ہنسی آگئی" نہیں۔۔۔ میں نے کہا۔

"رب تو بہت اونچائی پر رہتا ہے۔۔۔ جہاز بہت نیچے ہوتا ہے فرض کرو رب کے برابر بھی چلا جائے تو پھر کیا کرو گی؟ ڈر کے مارے کود نہ جانا جہاز سے۔۔۔"

وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

"واہ میں کیوں ڈروں گی رب سے۔۔۔ میں نے کون سے گناہ کئے ہیں کہ منہ چھپاؤں گی اس سے۔۔۔ بلکہ میں تو اپنے جہاز کے دونوں پر اس کے تخت کے ساتھ جا کر لگادوں گی۔۔ جب جاگ جائے گا تو"تو کیا کرو گی؟"۔۔۔ مجھے اس کی باتیں انوکھی اور دلچسپ لگ رہی تھیں "تو اس سے چار باتاں کروں گی۔۔۔ مجھے بہت شوق ہے اس سے باتیں کرنے کا۔۔"

کیا باتاں کرو گی؟ مجھے بھی تو کچھ پتہ چلے"۔۔۔ اب کے میں اس کا جواب سننے کے لئے سنبھل کر بیٹھ گئی۔۔۔!

ٹھنڈی سانس بھر کر بولی

"سب سے پہلے تو کہونگی دیکھو اللہ میاں مجھے لالچی نہ سمجھ لینا۔۔۔ مجھے نہیں جانا تیری جنت ونت میں ۔۔۔ میں تو دو باتیں پوچھنے آئی ہوں صرف اتنا بتا دے کہ برے کو اچھا بدلہ کیوں دیتا ہے اور اچھے کو سزا کیوں ملتی ہے؟ ایک ایک نیکی پر کلیجہ کٹ جاتا ہے بیگم صاحبہ! اچھا بننے کو بڑا زور لگتا ہے۔۔۔ پر اس نے تو نیکی کا بدلہ ہی قیامت پر چھوڑ دیا ہے خبر نہیں کب قیامت آئے گی اور مجھے بدلہ ملے گا۔۔۔ ملے گا بھی یا نہیں۔۔۔؟ سنا ہے قیامت تو لکھو کھا سال بعد آئے گی! کیوں بیگم صاحبہ؟۔۔"

"میں نے کہا مجھے معلوم نہیں کب آئے گی قیامت۔۔۔ مگر تم مجھے بتاؤ میرے ساتھ لاہور چلنا ہے کہ نہیں؟۔۔۔ یہ اچھے برے کی بات کیوں لے بیٹھی ہو؟"

وہ بولی۔

"لو اچھے برے کی بات کیوں نہ لے بیٹھوں۔ مجھے دیکھو میں الف سے یے تک اچھی ہوں۔۔۔ چودہ سال کی تھی تو بیاہ ہو گیا اپنی ذات کا ہوش ہی نہیں تھا مجھے۔۔۔ برا بننے کا وقت کہاں سے آتا میرے پاس؟۔۔۔ جاتے ہی تو سال بہ سال بچوں کی لکیر لگ گئی میرے پیچھے۔۔۔ مجھے بتائیں میں کس کئے کی سزا بھر رہی ہوں؟"

میں ہر مذہبی آدمی کی طرح اسے یہ کہہ کر جھوٹی تسلی دینا چاہتی تھی کہ یہ سب کیا کرایا ہمارے اعمال کی وجہ سے ہوتا ہے مگر میں اسے یہ کیسے کہہ دیتی کیونکہ وہ مجھے اپنے اعمال کے بارے میں ساری تفصیل بتا چکی تھی۔۔۔ میں نے اس کی وجہ بدلنے کو کہا:

"ثریا یہ تیرے بچے کو بخار کب سے ہو جاتا ہے؟ جاتے وقت مجھ سے دوائی لیتی جانا۔"

میری بات کرنے کی دیر تھی کہ وہ بے حد ذہین لڑکی ایک بار پھر چلا اٹھی ناں بی بی نا دوائی نہ دینا مجھے۔۔۔ میرا بچہ یونہی دوا کا عادی ہو جائے گا میں کہاں سے اسے دوائیاں لا کر دیا کروں گی۔۔۔ خدا کے حکم سے بیمار پڑتے ہیں اسی کی مرضی سے ٹھیک بھی ہو جاتے ہیں ۔۔۔ میں انسانوں سے رحم کی بھیک نہیں مانگوں گی۔۔۔ جب اللہ میاں کو خود میرے معصوموں پر رحم نہیں آتا تو آپ کیوں رحم کریں۔۔۔"

"بیگم صاحبہ میں کسی کی ریس کی نہیں کرتی مگر بچے تو سب کے برابر ہوتے ہیں۔۔۔ دیکھیں اب آپ کے بچے بیمار پڑیں تو اٹھارہ قسم کی دوائیاں آجاتی ہیں۔۔۔ اعلیٰ خوراک ملتی ہے پھل زمین پر پڑے رلتے ہیں۔۔۔ میرے معصوموں کا کیا قصور ہے؟ چلو میں تو غیر مرد سے شادی کے گنہ گار ہو گئی پر بچے تو گناہ گار نہیں ہیں میرے۔۔۔!

بس بیگم صاحبہ آپ ایک بھلا کریں میرے ساتھ۔۔۔ کاغذ کے ایک ٹکڑے پر دو حرف لکھ کر دے دیں آج مقصود گھر پر نہیں ہے۔۔۔ میں صبح اندھیرے منہ جا کر ایک دیوار پر رکھ آؤں گی جہاں سب سے پہلے سورج کی روشنی پڑتی ہے۔۔۔ سورج جب یہ پیغام پڑھے گا تو مقصود کا بخار ٹل جائے گا۔ گرمی کا تاپ ہے بیگم صاحبہ سورج دو دن ناغہ دے دے تو بس بچے کو ٹھیک سمجھو۔۔۔

مجھے ہنسی آگئی۔۔۔ میں نے کہا "سورج کوئی پڑھا لکھا ہے کہ تمہارا پیغام پڑھ لے گا؟ ۔۔۔"

"کیوں نہیں پڑھے گا۔۔۔ آپ لکھ کر دینا نہیں چاہتیں" ۔۔۔ وہ غصہ منا گئی پھر کہنے

گی۔

"ٹھیک ہے میں کسی غریب سے لکھوا کر رکھ دوں گی۔۔۔ شکر کرتی ہوں سورج امیر لوگوں کی ملکیت نہیں ہے ورنہ تو مجھے ایک کرن بھی ادھار نہ دیتے جس کی روشنی میں دو حرف رکھتے ہیں میں نے۔۔۔!"

"نہیں نہیں یوں نہ کہو ثریا بی بی۔۔۔ مجھے تمہاری یہ بات سن کر دکھ ہوا ہے۔۔۔ سورج تو کیا ساری دنیا سب انسانوں کی ہے دنیا کی ہر چیز پر تمہارا حق ہے بلکہ سب کا برابر کا حق ہے۔۔۔"

میری منطق سن کر وہ رونے کے مشابہہ ہنس پڑی۔

"لو اور سنو بیگم صاحب کیسی باتیں کرتی ہیں آپ؟۔۔۔ یہ دنیا میری ہے؟ اس کی نعمتیں میری ہیں؟ کس چیز کی برابری ہے یہاں؟ نعمتوں اور سکھوں کی برابری کو تو چھوڑ ہی دو۔۔۔ امیروں نے تو اپنی مرضی سے ہوا بھی اب مشینوں میں قید کر لی ہے وہ چاہیں تو گرمی سے بچ جائیں چاہیں تو سردیوں میں لحاف ہی نہ لیں۔۔۔ یہ ہم ہیں جو ساری دوپہر گھر کی پشت پر بنے ہوئے ننگے برآمدے کی دھوپ میں سڑتے ہیں اور سردی میں ٹھٹھرتے ہیں۔۔۔ ہمارے بچے اکڑ کر مرجاتے ہیں جل بھن کر سرسام ہو گیا ہے میرے مقصود کو۔۔۔ برف ملا ٹھنڈا پانی مانگتا ہے ڈاکٹر بھی کہتا ہے سر پر برف کی پٹی رکھو۔۔۔ لو حلق میں ڈالنے کو تو برف نہیں اور بے جان بالوں کو کہاں سے ٹھنڈا کروں گی؟۔۔۔" وہ سانس لینے کو رکی میں نے اسے بولنے دیا۔۔۔ وہ شائد دل کا تمام بخار آج نکالنے پر تلی ہوئی تھی اس پر مجھے ترس آ گیا۔۔۔ سوچا اس کی ہر خواہش پر پابندی ہے۔۔۔ ہر نعمت پر پہرے ہیں ہر ذائقہ ہر خوشی قید ہے تو کم از کم بول کر ہلکی تو ہو جائے۔۔۔ میں نے اسے کہا۔

"تیری باتیں تو بڑی عقل والی ہیں ثریا۔ آج سب کچھ مجھے بتا دے ہلکی ہو جائے گی بتا تیرے ماں باپ کہاں ہیں؟"

"مر کھپ گئے ہیں۔۔۔" وہ نفرت سے بولی۔

"ایک ماموں بچ گیا ہے معمولی پڑھا لکھا ہے مگر دنیا کی ساری چالیں سمجھتا ہے تبھی تو پیسہ کمایا ہے۔ جو چال چلتا ہے منافع ہی منافع ہے۔۔۔ جو پتا پھنکتا ہے سب سمیٹ لیتا ہے میں تو کہتی ہوں امیر بننے کو پڑھائی کی کیا ضرورت ہے؟ آدمی کمینہ ہو' بے ایمان ہو' بدمعاش ہو اور بے ضمیر ہو تو پھر سب کچھ اسی کا ہے۔۔۔ میرا باپ مجھے اپنے چرسی بھانجے کے حوالے کر کے مر گیا ہے۔۔۔ لیکن میرے لئے تو بڑی لمبی کہانی پڑ گئی ہے ناں بیگم

صاحبہ۔۔۔؟"

"تم حوصلہ رکھو خدا ضرور دکھ کاٹ دے گا۔" میں نے اسے پیار سے کہا جس کے جواب میں اس نے میری دونوں باتوں کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا جیسے میں نے بکواس کی ہو۔۔۔ وہ پھر گویا ہوئی۔

"آپ خود سوچیں بیگم صاحب۔۔۔ میرے بچوں کا باپ برا تھا وہ بھی برے نکلیں گے ناں؟ پتہ نہیں لوگ ہم غریبوں سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟ ہمارے ساتھ یہ سب کچھ تو خدا کی مرضی سے ہوتا ہے پھر لوگوں کا عتاب ہم پر کیوں ہو؟"

"شبیرا اکثر یہی کہتا تھا کہ میں خدا سے پوچھوں گا ایسا کیوں ہے؟ مگر وہ کیسے پوچھ سکتا تھا اس کے پاس تو جہاز کا کرایہ ہی نہیں تھا ہاں میں اب خود پوچھوں گی خدا سے۔۔۔ پوچھوں گی یہ کیسا ظلم ہے؟ تقدیر تو لکھتا ہے مار انسانوں کو پڑتی ہے آخر کیوں؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"مگر دیکھ لینا تیرے جیسے اچھے اور نیک لوگ جنت میں بھی تو جائیں گے۔۔۔ برے جہنم میں سڑیں گے۔۔۔"

اور میں ہکا بکا رہ گئی۔۔۔ وہ تڑ سے بولی۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے بیگم صاحب۔۔۔ برے لوگ یہاں عیش کرتے ہیں اگلے جہان میں دوزخ میں جلیں گے۔۔۔ بات تو برابر ہو گئی۔۔۔ میری نیکی کا بدلہ کہاں گیا؟ میں تو کہتی ہوں خدا خود ہی سب کے ساتھ انصاف کر دیتا تو سارا لفڑا ہی کیوں ہوتا؟ بندے کی بات بندے پر ڈال کر اس نے اچھا نہیں کیا ہے۔۔۔!"

وہ عجیب عجیب باتیں کرنے لگی تھی تب میں نے اس کی توجہ ہٹانے کے لئے دوسری بات چھیڑ دی "اچھا تم مجھے شبیر کے بارے میں بتاؤ۔۔۔ وہ کیا بدسلوکی کرتا تھا تمہارے ساتھ؟" رو کر کہنے لگی۔

"آپ سنیں گی تو ہنسیں گی بیگم صاحب۔۔۔ آپ کے نزدیک میری ساری باتیں بہت معمولی اور چھوٹی ہوں گی۔۔۔ پر میرا جگر تو ابھی تک ٹکڑے ٹکڑے ہے۔ میرے لئے تو ان سے زیادہ بڑی کاٹ دار باتیں اور ہو ہی نہیں سکتیں۔ دو بڑے ملکوں کی بڑی بڑی جنگوں سے بھی زیادہ خون خرابے والی باتیں ہیں یہ۔۔۔ وہ ہر رات دو بجے آتا تھا بچے اس کے پیار کے لئے بلکتے ہوئے سو جاتے تھے۔۔۔ جب آتا تھا مجھے بالوں سے پکڑ کر جگا دیتا تھا اور کہتا تھا تم بیٹھ کر مجھے پنکھا جھلو اور جب تک مجھے نیند نہ آئے بیٹھی رہو اس لئے کہ تم

عورت ذات ہو۔۔۔ میں پوری رات سسک سسک کر جاگتی تھی۔۔۔ کبھی بیمار پڑ جاؤں تو ٹھٹھ اڑاتا تھا کہ بہانہ کرتی ہو کبھی دوا لے کر نہیں دیتا تھا۔۔۔ صبح غسل خانے نہیں جانے دیتا تھا کہ مرد پہلے جائے گا۔۔۔ اسی طرح کھانا پہلے خود کھاتا تھا پھر بچوں کو دیتا تھا اور مجھے کہتا تھا عورت آخر میں ہانڈی چاٹ پونچھ لیتی ہے۔۔۔ میری ماں بیمار تھی اگلے دن مر گئی ۔۔۔ میں جانا چاہتی تھی مجھے نہ جانے دیا کہنے لگا تم کیا اور تمہاری ماں کیا۔۔۔ بڑی دیکھی ہیں مرتی ہوئی تیری ماؤں جیسی۔۔۔ میں رو رو کر بے دم ہو گئی تھی۔۔۔ اور بس چھوڑو بیگم صاحب کیا کیا بتاؤں؟ ظلم اور دکھ گذر جانے کے بعد اس کا ذکر کرنے سے دوسروں کو وہ بہت معمولی لگتا ہے پر جس پر بیتتی ہے وہی جانتا ہے میں تو وہاں سے قیمہ قیمہ ہو کر نکلی ہوں کوئی کیسے کسی کے درد گن سکتا ہے؟ سر کے بالوں برابر درد ہیں میرے۔۔۔" یہ کہہ کر جیسے وہ ہار گئی اور زور زور سے رونے لگ گئی۔۔۔ میں اٹھی اس بے حد دکھی اور سچی لڑکی کو سینے سے لگایا اور اندر جا کر تین سو روپے مقصود کے علاج کے لئے لائی اور اسے کہا۔

"جاؤ ثریا بانو اپنے بچوں کے پاس جاؤ تم تھک گئی ہو۔۔۔ جا کر آرام کرو جب اٹھو گی تو شام کو میرے پاس آ جانا میں مزید بھی تمہاری مدد کروں گی۔۔۔ تم مجھے بہن جیسی پیاری ہو۔۔۔ خدا تمہیں سکھ دے۔۔۔!"

اس نے میری کسی بات کا کوئی جواب نہ دیا سر جھکائے بیٹھی رہی جیسے کوئی ماتم کی چٹائی پر بیٹھا ہو۔۔۔ میں رقم اس کے پلو میں باندھ کر کمرے میں چلی آئی اور کمرے میں آتے ہی بے دم ہو کر پلنگ پر گر پڑی اتنے بڑے بڑے سچ اور اتنی بڑی بڑی قبیح حقیقتیں سن کر شائد میں ضبط کر کے کھڑی رہی تھی کیونکہ میں کمرے میں آ کر ایک تار ایک دھار رو رہی تھی آج میرا دل، میرا دماغ، میرے حوصلے تمام تر علم اس چھوٹی سی جاہل اور حقیر لڑکی کے سامنے قطعی طور پر ہیچ تھا۔ میں مکمل طور پر شکست کھا چکی تھی۔ میں اس کی کسی بات کا کسی سوال کا جواب نہ دے سکی تھی۔۔۔!

شام کو میں ایک ہارے ہوئے مہرے کے برابر تھی۔ تھکے ہوئے قدموں سے اٹھی اور جا کر اس برآمدے میں جھانکا جہاں کچھ گھنٹے پہلے ثریا بانو بیٹھی تھی اور میں اگلے ہی لمحے ہکا بکا کھڑی تھی میرے سو سو کے تین نوٹ گلاس کے پیندے کے نیچے رکھے تھے اور ثریا جا چکی تھی۔۔۔ وہ شائد ٹھیک کہتی تھی جس غیرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ یہاں سے بھی خالی ہاتھ اٹھ گئی تھی وہ کہتی تھی خدا خود براہ راست اس پر رحم کرے وہ انسانوں سے بالواسطہ رحم قبول نہیں کرے گی۔۔۔ اور میں سوچ رہی تھی

ہاں وہ سچی تھی کہ دنیا کے لئے اس کی تمام باتیں بہت معمولی اور یہ خبر بہت چھوٹی ہو گی کہ ایک غریب بے کس عورت کو اس کے مالک نے چھ بچوں سمیت چھوڑ دیا ہے۔ دنیا کا نظام اسی طرح چلتا رہے گا—— خدا جانے ثریا جو خاوند کی روندی ہوئی اور خدوند کی راندی ہوئی تھی کہاں گئی ہو گی؟ اپنی جوانی اور چھ وجودوں کو کیسے سنبھالے گی؟ یہ ساری بات میرے لئے معمولی بات نہ تھی——

میرا جی چاہنے لگا اے کاش آج مجھ میں کہیں سے اتنا ڈھیر سارا حوصلہ آجائے کہ خود سے کہہ سکوں——

چلو چھوڑو زہرہ بیگم اٹھو جا کر وی سی آر پر کوئی عمدہ سی فلم دیکھ لو—— کیوں ہلکان ہوتی ہو——؟ یہ باتیں تو معمولی ہیں اور ہوتی رہتی ہیں—— لیکن اس دن سے لے کر آج تک یہ معمولی سی بات میں خود سے نہیں کہہ سکی ہوں—— نہ ہی وی سی آر پر فلم دیکھ کر خود کو بہلا سکتی ہوں۔ میری خوشیوں اور مسکراہٹ کو تالے لگا گئی ہے وہ—— معمولی باتیں کرنے والی!

***

آنکھوں کے دیدبان

رات کی آنکھیں نمناک ہیں اور ان آنکھوں کی نمی شبنم بن کر شیشے کی دیوار پر لکیریں کھینچ رہی ہے۔ یہ لکیریں آپس میں گڈ مڈ ہو کر کہیں کشتیاں بن گئی ہیں' اور کہیں آبی پرندے۔ آبی کشتیوں اور آبی پرندوں کے اس ہجوم میں کہیں کہیں سمندر جھلک رہا ہے۔ یہ سمندر شفاف دیوار کے اس پار دور تک سویا ہوا ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ سوتا ہوا سمندر کروٹ بدل کر اپنی کہنیوں کے سہارے اٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ آج کی رات بھی ایک ایسی ہی رات ہے۔ آج شام ہی سے سمندر اپنی کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن نہ جانے کیا چیز اس کے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہے۔ میں بہت دیر سے یہاں بیٹھی سمندر کو دیکھ رہی ہوں' اور آج پر ہی کیا موقوف ہے' میں تو ہر شام یہاں آ بیٹھتی ہوں' اور اسے دیکھتی رہتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ دن ضرور آئے گا' جب وہ تمام زنجیریں توڑ کر اٹھ بیٹھے گا' اور میرے پاس چلا آئے گا۔ میں ایک ایسی ہی رات کا نہ جانے کتنی راتوں سے انتظار کر رہی ہوں۔ یہ راتیں جو پھیل کر صدیاں بن گئی ہیں' اور سمٹی ہیں' تو عذاب کا ایک جہنمی لمحہ۔

سمندر میں دور بہت دور کھڑے ہوئے جہازوں پر جو روشنی ہے' وہ میری آنکھوں کے الاؤ ہیں' جن میں انتظار کے تناور درختوں کی بریدہ شاخیں جل رہی ہیں۔ میں یہ بات جان گئی ہوں کہ میری آنکھیں یہاں ہیں' اور روشن الاؤ ہیں۔ سمندروں کی لہروں میں اور ستاروں کے قلب ہیں' اور میری یہ تمام آنکھیں جوان گنت ہیں' مجھے شیشے کی اس دیوار کے پیچھے دیکھ رہی ہیں۔

تم نے کبھی انتظار کو انتظار کے مقابل دیکھا ہے؟ اگر نہیں دیکھا' تو مجھے دیکھو' میری آنکھوں کو دیکھو' جن میں تمہیں اپنی آنکھیں نظر آئیں گی ___ لیکن اگر یہ تمہاری آنکھیں ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر میری آنکھیں کہاں ہیں؟ یہ فیصلہ کون کرے گا؟ یہ فیصلہ میں کروں گی یا سمندر؟ میری آنکھوں کے ہونے نہ ہونے کا فیصلہ ریت کے ذرے کریں

گے' یا ہوا کے جھونکے؟ لیں پھر رات کے وہ آنسو جو کشتیوں اور آبی پرندوں کی شکل میں شیشے کی دیوار پر بہہ رہے ہیں' یہ فیصلہ آخر کون کرے گا؟

میں تمہیں بتاتی ہوں کہ یہ فیصلہ کوئی نہیں کرے گا' جو دوسروں کے لئے حکم بن سکے۔ یہاں کی ہر شے خود ہی مدعی ہے' خود ہی مدعا علیہ' اور خود ہی منصف ـــــ وجود کی عدالت ہے' اور جب لوئی حتمی اور آخری فیصلہ سننے کے لئے میں حجرۂ ذات میں جھانکتی ہوں' کہ سفید محرابوں اور گنبد نما چھت والے اس حجرے میں انسانوں کا ہجوم ہے' اور اس ہجوم کے شانوں سے شانے ملائے خداوندوں اور دیوتاؤں کے پرے ہیں' اور سب سے آگے اور سب سے الگ خداوند خدا ہے' جو داناؤں کے کہنے کے مطابق محرک اول ہے' انہی کے کہنے کے مطابق خود حرکت نہیں کرتا۔

ذہن مجھ سے ہم کلام ہوتا ہے' اور میں جان لیتی ہوں کہ یہ تنہائی کی عدالت ہے۔ یہ جان کر مجھے بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے' میں اور مجھ جیسے دوسرے کتنے عیار ہیں کہ تنہائی کی عدالت میں بھی ہجوم میں اور حرکت میں ہیں۔ اور دوسری طرف خداوند خدا ہے' جسے فرض کیا گیا' پھر اپنے آپ پر فضیلت دی گئی' اور متحرک اول قرار دے کر حرکت سے محروم کیا گیا' اور اس طرح اسے یکسر تنہا کر دیا گیا۔شاید میں اور مجھ ایسے دوسرے لوگ ایذارسانی کی انتہاؤں کو پہنچے ہوئے ہیں۔

حجرۂ ذات کے فرش پر لمحوں کا ایندھن دہک رہا ہے' اور اس کا پرتو وجود کی دیواروں پر عجیب سریت آمیز نقوش بناتا اور بگاڑتا ہے۔ دھوئیں کی چادر ہے' اور اس پر مدھم سی روشنی کی یہ تحریر ان شکلوں کو واضح کرتی ہے' جو اس گنبد نما چھت میں آویزاں ہے۔ ان شکلوں کو پہننے والوں میں سے کچھ الٹے لٹک رہے ہیں' اور کچھ سیدھے اور کچھ نے فرشتوں سے پر مستعار لئے ہیں' اور طاقت پرواز کی تلاش میں ہیں' اور ہاں وہاں بعض دراز داڑھیوں والے بھی ہیں' اور جو اپنے ہاتھوں میں دانائی کے موتی لئے بیٹھے ہیں' اور انہیں لوح گل پر ٹانکتے چلے جاتے ہیں' لمحوں کے دہکتے ہوئے ایندھن کا پرتو ان شکلوں کو کبھی اجاگر کرتا ہے' اور کبھی تمام مناظر دھندلا جاتے ہیں' لیکن خداوند خدا کا وجود ان سب سے الگ ہے' ہر منظر سے جدا ـــــ اس لمحے مجھے یونانی یاد آتے ہیں کہ وہ مجھ سے اور میرے لوگوں سے زیادہ خدا دوست تھے' وہ اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کو اپنی ہی خامیوں اور اور اپنی ہی خوبیوں کے سانچے میں ڈھالتے تھے' اور انہیں تنہا نہیں چھوڑتے تھے۔

میں خداوند خدا کے چہرے پر تنہائی کی اذیت ناک تحریر دیکھتی ہوں' اور اس کے ارد

گرد پھیلے ہوئے مہیب اور تنہا سناٹے کی گونج سنتی ہوں' تو میرا جی چاہتا ہے کہ اس کے سامنے ایک آئینہ رکھ دوں' اور اس طرح وہ جس نے کبھی اپنا چہرہ نہیں دیکھا' اس آئینے میں اپنا چہرہ دیکھے' اور اسے اپنی دوسرا ہٹ سمجھے' اور دوسراہٹ سے باتیں کرے۔ لیکن جب میں اس کے سامنے آئینہ رکھنا چاہتی ہوں' تو دیکھتی ہوں کہ حجرۂ ذات سراب ہے' اور اس کی گنبد نما چھت پر بنی ہوئی اشکال بھی محض خیال کا پھیلا ہوا جال ہیں' اور حقیقت تو کچھ یوں ہے کہ میرے سامنے شیشے کی دیوار ہے' اور اس کے پار سمندر ہے' اور تاروں بھرا آسمان ہے' اور ریت کے ان گنت ذرے ہیں' اور میری پشت پر پتھر کی دیوار ہے' جو ریت کے ان گنت ذروں کو سمندر کے پانی سے گوندھ کر بنائی گئی ہے' اور جس پر ستاروں جیسی گھڑی رکھی ہے' جس کے ڈائل کا رنگ سیاہ ہے' جس کے ہند سے سنہری رنگ کے ہیں' اور ان ہندسوں کا بوسہ لینے والی سوئیاں بھی سنہری ہیں۔

میں یہاں بیٹھ کر سمندر کا انتظار کرتی ہوں' تو حرکت کرتی ہوئی یہ سوئیاں سرگوشی کرتی ہیں۔ ان سرگوشیوں نے بھی مجھے بتایا ہے کہ فراق' وصال کی دوسری جہت ہے' اور کائنات میں انتظار کہیں نہیں ہے' اور یہ بھی کہ وقت لامحدود ہے' اور اس کے ساتھ ہی محدود بھی۔ کیونکہ وہ کائنات کی مانند ایک دائرہ ہے' جو کہیں سے شروع نہیں ہوتا' اور نہ کہیں ختم ہوتا ہے' لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم وقت کو خط مستقیم میں سفر کرنے والے غیر محسوس اور نامعلوم شے سمجھتے ہیں' اور ہم یہ نہیں سمجھتے کہ وقت گردش میں ہے' اور اس گردش نے ایک دائرے کو جنم دیا ہے' اور دائرہ جب مکمل ہو جاتا ہے' تو پھر اس کے بارے میں کون بتا سکتا ہے کہ اس کا نقطۂ آغاز کہاں ہے' اور انجام کہاں—— وقت بھی کبھی نہیں گزرتا' ہمیشہ لوٹ آتا ہے' کیونکہ گردش کرنے والی چیز اپنے آغاز کی طرف لوٹتی ہے' اور کتنی عجیب بات ہے کہ آغاز ہی انجام بھی اس لئے یہ کہنا بھی غلط ہے کہ وقت اپنے آغاز کی طرف لوٹتا ہے۔ بس یوں سمجھو کہ وقت گردش میں ہے' اور ہم سب اس گردش کا ایک حصہ ہیں۔ جو وقت ہم پر سے پہلے گزر چکا ہے' اس کا کوئی حصہ یا ذرہ اپنے آپ کو دہراتا ہے۔ لیکن ہم کچھ نہیں جانتے' کچھ نہیں سمجھتے۔ وقت کائنات کے دائرے میں گردش کرنے والی دھول ہے' جو ہمارے سروں پر جمتی ہے' تو بڑھاپا بن جاتا ہے' اور ہمارے بدن سے لپٹی ہے' تو ہم مٹی میں مل جاتے ہیں۔ وقت خاک ہے اور باد ہے' وقت خدا ہے' اور کائنات ہے' وقت سب کچھ ہے' اور کچھ بھی نہیں ہے۔

میں وقت کو شکل دینا چاہتی ہوں' اس کی تجسیم چاہتی ہوں' اور جب یہ خواہش مجھے

ہلاک کرنے لگتی ہے تو میں کائنات کے تمام رنگ اپنی ہتھیلی پر سجا لیتی ہوں' اور مستری کی انگلی سے وقت کے خدوخال کھینچنا چاہتی ہوں' لیکن وقت کی فراخی' وسعت اور اس کی ازلیت اور ابدیت میری آنکھوں کی پتلیوں پر اپنی کوئی شبیہ اپنی کوئی تصور نہیں بننے دیتی۔ میں سوچتی ہوں کہ وقت کا تصور کس طرح قائم کروں کہ گویائی اس کے نقش ونگار بیان نہیں کر سکتی' اور بینائی اس کے دیدار سے قاصر ہے۔ بس یوں ہے کہ وقت کو الفاظ کے ذریعہ بیان کرنے کی کوشش بیکار ہے' اور اس سے منسوب کی جانے والی تمام اشکال جھوٹی ہیں' بے سروپا ہیں

خاک برفرق وسر تمثیل من

وقت نے کائنات میں عجب بساط بچھائی ہے' اس کے کھیل کا انداز نرالا ہے' اس کے مہروں کا کوئی رنگ نہیں' ان کی کوئی شکل نہیں' اور اس کا کوئی حریف نہیں۔ وہ خود اپنا مقابل ہے' اور اس کی غیر مرئی انگلیاں کائنات کے بساط کے مہروں کو گردش میں لاتی ہیں' کبھی وہ اپنے آپ سے جیت جاتا ہے' اور کبھی اپنے آپ کو آن کی آن میں شہ مات دے دیتا ہے۔ یہ بھی اس کھیل کا ایک حصہ ہے کہ میں اب اپنے سامنے یوں بیٹھی ہوں' جیسے آئینہ آئینے کا سامنا کرے۔ میں سامنے والے اپنے وجود کو چھوتی ہوں' لیکن وہاں کچھ بھی نہیں ہے' سب کچھ خواب در خواب ہے' اور سراب اندر سراب—— خلاء ہے' کائنات بھی معدوم ہے' اور سمندر کی لہریں جو مجھے نظر آرہی ہیں' وہ بھی کہیں نہیں ہیں۔ میری آنکھیں جن چیزوں کو دیکھ رہی ہیں' میرے ہاتھ انہیں چھونے پر قادر نہیں۔ میں ہی کائنات ہوں اور میں ہی رنگ' میں ہی آگ ہوں' اور میں ہی راکھ میں کبھی اپنے آپ کو سمندر کہہ کر یاد کرتی ہوں' اور کبھی اپنی ذات کو بادبان یا صحرا کے نام سے پکارتی ہوں۔ کائنات کے دائرے میں صرف میری ہی آواز گونجتی ہے' لیکن پھر یوں بھی ہے کہ میری آواز جو کائنات پر محیط ہے' سمٹ کر کبھی سانس کی سرسراہٹ ہے' اور کبھی سانس کی سرسراہٹ ہے' اور کبھی تیز ہوا کی سنسناہٹ۔

بادبانوں کے دامن میں تیز ہوا کی سنسناہٹ بھر جائے۔ تو جہاز لنگر اٹھاتے ہیں' اور اپنے اپنے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ اپنے وجود کو ایک آنکھ والے سائیکلو پس کے جزیرے کی طرف دھکیلتے ہیں' اور بہت سے بادبان ایسے بھی ہوتے ہیں' جو ایک ہزار جہازوں پر ا-ستادہ ہو کر دس سالہ جنگ کی طرف سفر کرتے ہیں' اور ہاں یہی بادبان جب سوگ کا لبادہ اتارنا بھول جائیں' تو سمندر کا نام بدل جاتا ہے۔

مجھے ان بادبانوں سے خوف محسوس ہوتا ہے۔ میں ان کے رحم و کرم پر کہیں کا سفر کرنا نہیں چاہتی۔ ان بادبانوں نے انسانوں کو بہت دکھ دیے ہیں، بہت رسوا کیا ہے، لیکن یہ بھی ہے کہ ان سے مفر نہیں۔

مفر تو اس بات سے بھی نہیں کہ میں جو اپنے روبرو تھی، ایک بار پھر گم ہو گئی ہوں، اور حصار ذات میں آ گئی ہوں۔ جانے والے اپنے اپنے تیر، بتر، تلواریں اور تیغیں لے کر واپس جا چکے ہیں، شاید انھوں نے سپر ڈال دی، لیکن اب جبکہ ان کے خیمے اور ان کے جہاز مجھے نظر نہیں آ رہے، مجھے اس ٹروجن ہارس سے ڈر لگ رہا ہے، جسے میں اپنے ہاتھوں حصار کے اندر لائی ہوں۔ وجود کی شہر پناہ پر آنکھوں کے دیدبان پہرا دیتے ہیں، لیکن جب سحر ہو گی، اور شہر پناہ میں بنے ہوئے دروازے کھول دیئے جائیں گے، اور قلعہ ذات پر نگہبانی کے لئے معمور انا کا دیوتا اونگھ جائے گا، تو وجود کہاں پناہ چاہے گا؟

مجھے کائنات کی قلمرو نہیں چاہیے، میں تو منتظر آنکھوں والی لڑکی ہوں، اور مجھے سمندر کا انتظار ہے، لیکن وہ مجھ تک نہیں آتا۔ وہ اپنی کہنیوں کے بل اٹھ کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہے، اور پھر تھک کر لیٹ جاتا ہے میں سوچتی ہوں کہ اٹھوں اور اس کی طرف سفر کروں۔ لیکن جب میں اس کی طرف چلنا چاہتی ہوں، تو میرے پیر نہیں اٹھتے، اور تب مجھے یاد آتا ہے کہ میرا نچلا دھڑ تو گرداب کا ہے، اور مجھے شفاف دیواروں والے اس حصار میں مقید کر دیا گیا ہے۔ باہر دروازے پر میری سیاہ آنکھیں پہرا دیتی ہیں، اور ان کی چمک میرے اعصاب کو جیسے سلا دیتی ہے، اور تب میں سوچتی ہوں کہ مجھے اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے، جب سمندر کی تھکن اتر جائے، اور وہ میرے پاس چلا آئے۔

تو میری روداد کچھ یوں ہے کہ میں ہر رات اپنے گرداب کے قدموں سے اٹھ کر یہاں اس شفاف دیوار تک آتی ہوں، اور سمندر کو دیکھتی ہوں۔ میں حصار ذات سے باہر کیسے آؤں کہ میری آنکھیں میرے دیدبان ہیں۔

***

کہکشاں ملک

دائرہ

پنڈی میں سردی بھی تو ایسے پڑتی تھی کہ گالوں میں چھید ڈال دیتی۔ اجلا اجلا اور نرم گرم چہرہ لیراں لیراں ہو جاتا تھا۔ ہاتھوں کی طرف مارے شرم کے دیکھا کب جاتا تھا بالکل بطخ کے پنجے بن جاتے تھے اور پھر جہاں رسوئی تھی وہ تو بس نام کی رسوئی تھی۔ کسی زمانے میں اس کے صدیق ماموں کو پنسلوں کی فروخت سے منافع ہوا تھا سودہ ان کے لئے ٹین کی دو چادریں لے آئے۔ بس انہی چادروں کو بلیوں کے اوپر ایک دوسار سے جوڑ کر چھت ڈال دی تھی اور نیچے ماں نے چوکا سا بنا دیا تھا۔ چاروں اور سے شاں شاں کرتی ہوا گزرتی۔ گرمیوں میں تو خیر اچھا برا وقت گزر جاتا پر سردی آتے ہی رسوئی میں جانے کا نام سن کر ہی کپکپی لگ جاتی ایسے میں صبح صبح صحن کے دروازے کی لوہے کی کنڈی جب زور زور سے کھنکتی تو آنے والے کا مقصد پہلے جانتے ہوئے اس کا جی چاہتا کہ یہ صحن اور یہ رسوئی چھوڑ کر کہیں دور۔ بہت دور ایسی جگہ چلی جائے جہاں یہ آواز—— "ملوانی جی—— میت ہو گئی ہے' غسل کا سامان لے کر وہاں آجایئے۔" اسے بالکل نہ سنائی دے—— اس آواز نے اس کے بچپن کی ساری خوشیاں چھین لی تھیں۔ اتنی سخت ٹھنڈ میں رسوئی میں جا کر المونیم کے بڑے سے پتیلے میں پانی گرم کرنا پڑتا۔ میت کو غسل دینے سے پہلے اس کی اماں پہلے خود غسل کرتی۔ اسے غسل کرنے کا کہتی۔ سفید موٹی ململ کا دوپٹہ خود بھی اوڑھتی اور اسے بھی اوڑھنے کو کہتی۔ پھر دونوں ماں بیٹیاں میت والے گھر پہنچ جاتیں۔ پیچھے پیچھے صدیق ماموں دو کورے گھڑے۔ دو سقاوے۔ بیری کے پتے۔ صابن کی ٹکیہ۔ نہلانے کا تختہ اور مشک کافور' گلاب کے پھول اور ہار' روئی کے پھاہے۔ اور خون نکلنے کے خدشے کے تحت پٹیوں کا بنڈل لئے آرہے ہوتے۔ میت والے گھر میں مار دھاڑ مچی ہوتی۔ بین کی آوازیں بوکھلا کر رکھ دیتیں۔ وقفے وقفے کے ساتھ سینہ پیٹنے اور چیخنے چلانے کی آوازوں سے دل دہل جاتا۔ اماں کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر ماتم والے گھر کی کوئی بوڑھی لپک کر سامنے آتی اور اماں کا ہاتھ پکڑ کر عزاداروں کی صفوں کو چیرتی ہوئی ٹھیک میت کے سرہانے اونچی

چوکی پر بٹھا دیتی۔ اس کی اماں مشین کی طرح شروع ہو جاتی۔" بہنو' بیبیوں' بیٹیو یہ مقام رونے کا نہیں ' سوچنے کا ہے' سوچو' ہم سب نے ایک دن ایسے ہی چپ چاپ لیٹ جانا ہے۔ پھر یہ سارے رشتے ناطے' دعویٰ اور مال کچھ کام نہیں آئیں گے۔" پھر پتہ نہیں وہ کلمہ شریف. کا ورد شروع کر دیتی اور پڑھتی ہی رہتی۔ ماں کا اثر کئی بار زائل ہوتا۔ عورتیں اپنی باتوں مٰں مشغول ہو جاتیں۔ مگر اس کی اماں کا نعرہ حق انہیں پھر کلمے کی طرف لے آتا۔ پھر میت کے غسل کا مرحلہ آتا۔ اماں اسے زور سے آواز دیتی۔ وہ میت کی چارپائی کا سرا تھام کر اسے جائے غسل تک پہنچانے میں مدد دیتی وہ لوگ جو کچھ دیر پہلے میت کی محبت میں سینہ پیٹ پیٹ کر بے حال ہو رہے ہوتے۔ میت کے کپڑے اترتے دیکھ کر بھاگ اٹھتے۔ بہت کم گھروں میں ایسا ہوتا کہ غسل کے دوران گھر کا کوئی فرد ماں کا ہاتھ بٹاتا۔ مگر اس کی ماں تو ہر میت پر والہ و شیدا ہونے لگتی۔ کلمے پڑھتی ہوئی بڑی پریت کے ساتھ میت کو تختے پر ڈالتی۔ دونوں گھڑوں میں انگلی ڈبو کر پانی کے مناسب گرم ہونے کا اندازہ لگاتی۔ گلاب کے ہاروں کو گھڑے کے گرد لپیٹ کر تازہ رکھنے کی کوشش کرتی۔ وہ سب کام بڑے اطمینان سے کرتی تھی۔ اس کے چہرے پر اس عرصے میں عجیب سی روشنی لہراتی سی محسوس ہوتی تھی۔ قمیض کے بازؤں کو کہنیوں سے اوپر چڑھا کر وہ میت جو نہلانا شروع کر دیتی تھی۔ ہر عضو کی طہارت کے ساتھ دعائیں اور کلمات پاک کا ورد کرتی تھی۔ بیچ بیچ میں اسے اپریشن سرجن کی طرح کبھی پانہ کبھی اسفنج کبھی روئی کبھی ہاتھ سے چھوٹ کر دور گرنے والی صابن کی ٹکیہ پکڑانے کا اشارہ دیتی جاتی۔ اور ساتھ غسل کے آداب اور تفصیل بتاتی جاتی۔ اسے اس سارے عمل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے اپنی ماں کا میت کا بناؤ سنگار کرنا بالکل نہیں بھاتا تھا۔ سرخ گلابوں کی بندیا سجا کرجب وہ دروازہ کھول کر میت کی ڈولی لانے کا اشارہ کرتی تو وہ مشک کافور کی ٹھنڈی اور ڈرؤانی سی بو سے بھاگ کر گھر آجاتی۔ اس کی ماں یہ کام اللہ کی خوشنودی کے لئے کرتی تھی۔ مگر پھر بھی لوگ اسے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق جوڑے اور روپے ضرور دیتے تھے۔ اور چالیس روز تک برابر میت کے ایصال ثواب کے لئے کھانا آتا رہتا تھا۔ اس کے ابا ریڑھی لگاتے تھے۔ گرمیوں میں مسجد کے باہر سکنجبین کے گلاس بیچتے تھے۔ اور سردیوں میں اسی کمیٹی کے پرائمری سکول کے باہر مونگ پھلی اور چنے بیچتے تھے۔ جہاں وہ پڑھنے کے لئے جاتی تھی۔ اسے اپنے ابا کے ریڑی لگانے رات رات بھر کھانسنے اور ہر تیسرے روز اوجھڑی پکوانے پر غصہ نہیں آتا تھا۔ اس کے ابا بہت اچھے تھے۔ اسے کبھی کچھ نہیں کہتے تھے۔ اس کے پڑھنے نہ پڑھنے پر انہیں کوئی

اعتراض نہیں تھا۔ لے دے کے وہ دو ماں بیٹی ہی تو تھیں۔ گھر میں ایک کمرے میں وہ تینوں اور دوسرے میں صدیق ماموں رہتے تھے۔ ان کی بیوی جانے کب کی مر چکی تھی۔ دو شادی شدہ بیٹے تھے جو الگ رہتے تھے۔ صدیق ماموں کی بھی اسی سکول کے ساتھ چھوٹی سی کاپیوں پنسلوں کی دکان تھی۔ اسی کی آمدنی سے باہر کسی نانبائی کے پاس دوپہر شام دال روٹی کھا لیتے تھے۔ البتہ صبح ان کے ساتھ ہی ناشتہ کرتے تھے مگر ناشتے میں چائے اور پراٹھے کے پیسے وہ باقاعدگی سے ادا کرتے تھے۔ ہاں اگر برسات کی جھڑی میں باہر جانا مشکل ہوتا یا کوئی کھانا اس کی ماں زبردستی کھلا دیتی تو انکار نہیں کرتے تھے۔ ان کے گھر رات کا کھانا اکثر باہر ہی سے آتا تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے محلے میں سردی گرمی میں کوئی نہ کوئی چل بستا۔ سرپوش سے ڈھکا مختلف کھانوں والا طشت کنڈی کھٹکنے پر اس کی اماں لے ہی لیتی تھی۔ مگر یہ سب کچھ اسے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ ماں اسے روز سمجھاتی میت کو نہلانا بڑے ثواب کا کام ہے۔ قبر سے رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ دھوکا فریب لوٹ کھسوٹ سب سے دل بھر جاتا ہے۔
"مگر اماں مجھ سے قبرستان میں بیٹھ کر پلاؤ نہیں کھایا جاتا۔" وہ چیخ کر کہتی۔ "دیکھ بیٹی۔ مر کر کوئی ختم تو نہیں ہوتا۔ یہ تو پردہ اٹھنے کی بات ہے۔ ایک موڑ ہے۔ اس میں دوسرے کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے بیٹی—— آج نہیں تو کل مجھے بھی تو ضرورت پڑنی ہے۔" اس کی ماں کتنے پیار سے سمجھاتی۔ مگر اس نے تو جیسے تہیہ کر رکھا تھا وہ کبھی بھی ماں کے کام کو آگے نہیں بڑھائے گی۔ اس نے بارہا اپنی ماں کو بتایا کہ سکول میں لڑکیاں اسے ملوانی کہہ کر چھیڑتی ہیں۔ مگر اس کی ماں ہنس پڑتی اور کہتی' ارے ملوانی کہنے میں کیا برائی ہے۔ چورنی تو نہیں کہتیں۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اماں کو کیسے سمجھائے کہ چورنی ملوانی کے مقابلے میں کتنا بہتر نام ہے۔ اس لئے اس نے اس موضوع پر گفتگو ہی چھوڑ دی۔ اب اس کی دلچسپی کا مرکز جہاں زیب تھا۔ جو جانے اچانک کیسے ان کی ٹھہری ہوئی اور ساکن سمندر جیسی زندگی میں ہر روز لہر کی طرح داخل ہو گیا تھا۔ وہ اس کی مرحوم مامی کا بھانجا تھا۔ پولی ٹیکنیکل کالج کھلنے کی بنا کر گوجر خان سے آگیا تھا۔ وہ کہنے کو تو ہوسٹل میں رہتا تھا۔ مگر صبح وشام وہیں نظر آتا تھا۔ بجلی کی مصنوعات کے بارے میں معلومات اور ترتیب حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے اسے بھی اپنانے کا پروگرام پکا کر لیا تھا۔ وہ تربیت کے فوراً بعد مشرق بعید کے ایک مالدار ملک میں بلایا لیا گیا جہاں اس نے پانچ سال تک خوب دولت کمانے کے بعد اپنا وعدہ نبھاتے ہوئے اسے سر سے پاؤں تک سونے میں لاد کر نہ صرف اپنی دلہن بنایا بلکہ اپنے ساتھ اسی ملک میں دوبارہ لے گیا جہاں وہ پہلے سے زیادہ اہم

عہدے پر فائز ہو گیا تھا۔

اب پورے بیس برس کی طویل مسافری کے بعد دونوں چار عدد ذہین اور خوش مزاج بچوں کے ہمراہ وطن لوٹے تھے۔ اس کی اماں ، ابا اور ماموں میں سے کوئی بھی باقی نہیں تھا۔ جہاں زیب نے پراپرٹی ڈیلر کی معرفت فوراً ہی اسلام آباد کے ایک تازہ تازہ آباد سیکٹر میں پانچ بیڈز والی کوٹھی مبلغ تیس لاکھ میں خرید لی۔ چار چھ ماہ وہ یعنی مسز جہاں زیب کی دوستی اڑوس پڑوس میں خاصی مستحکم ہو گئی۔ اس کے گھر کے عین سامنے ممی کا بنگلہ تھا۔ ممی کی وجہ سے شہرت بہت سی خصوصیات تھیں۔ بڑی وجہ تو ممی کا جگت ممی ہونا تھا۔ چھوٹے بڑے، ڈاکیہ، دودھ والا، اخبار والا، بجلی کا میٹر چیک کرنے والا چندہ لینے والے، وہ سب کی ممی تھی۔ دوسری وجہ ممی کا سابق سٹار ہونا تھا۔ وہ یاد گار کردار کر چکی تھیں۔ (Mass) میڈیا والے اب بھی انہیں مہمان خصوصی کے طور پر بلاتے تھے۔ اور آج کل ممی کی وجہ شہرت مارننگ واک تھی۔ اسلام آباد کی خنک اور شاہانی صبح میں وہ جاگر پہن کر فیصل مسجد تک دوڑتی ہوئی جاتی تھیں اور اسی تیز رفتاری کے ساتھ واپس آتی تھیں۔ ساتھ میں پاپا بھی ہوتے تھے۔ مگر لوگوں کو فقط ممی سے پیار تھا۔ ٹھیک دس بجے ممی ہر نئے فیشن کے لباس اور زیورات سے سج دھج کر اپنے شادی دفتر جاتی تھیں۔ وہاں سے ٹھیک ایک بجے واپس آتی تھیں۔ پاپا اتنی دیر میں ایپرن لگائے بہترین ڈش تیار کرتے تھے۔ صفائی وغیرہ کے لئے نوکر بھی تھی۔ واپسی پر ممی اپنی فاکسی میں پھل فروٹ بھی لاتی تھیں۔ لنچ کے بعد دونوں آرام کرتے تھے۔ مگر ممی ایک دو گھنٹے کے لئے دفتر اور پاپا لائبریری چلے جاتے۔ واپسی پر دونوں اکٹھے ہی آتے۔ ممی جمعہ ہفتہ دو چھٹیاں کرتی تھیں۔ انہی دنوں میں ممی کا بیٹا اور بہو جو دوسرے سیکٹر میں رہتے تھے ملنے کے لئے آئے تھے۔ مسز جہاں زیب کو پہلے پہلے اسلام آباد میں ممی پاپا کی زندگی کا انداز عجیب سا لگا۔ اسے یہ سن کر بھی حیرت ہوئی۔ کہ ممی کی ذاتی کوٹھی کا کرایہ دار خود اس کا بیٹا ہے۔ جو سرکاری کرایہ باقاعدگی سے اپنی ماں کو ادا کرتا ہے۔ بیٹے کا اپنا بنگلہ کسی اور افسر نے سرکاری طور پر لے رکھا ہے۔ ممی کی ایک بیٹی بھی تھی جو اپنے میاں کے ساتھ سوڈان میں تھی۔ ممی کی دنیا میں رشتے ناطے ریت رواج اور پیار محبت کی بندشوں کا کوئی اثر نہیں تھا۔ اس نے کبھی بھولے سے بھی اپنے ساس ہونے حق نہیں جتایا گیا تھا۔ بس اچھے شہری کی طرح ساس بہو آپس میں مل لیتی تھیں۔

مگر ہوا یوں کہ ایک صبح ممی جب سیر کے لئے تیز تیز قدموں سے فیصل مسجد جانے والی سڑک پر مڑیں کہ اچانک رت جگا منا کر آنے والے اور نشے میں دھت ایک امیر زادے

نے اپنی نئی ٹیوٹا ممی کے اوپر سے گذار دی۔
ممی بیچاری بھیتی بھیتی ہو گئی۔ پتہ نہیں کیسے اٹھا کر گھر لایا گیا۔ فوراً ہی بڑی مہارت کے ساتھ ممی کی میت کو سفید چادروں میں لپیٹ کر بنگلے کے بڑے سے استقبالیہ کے ایک کونے میں پلنگ پر ڈال دیا گیا۔ حادثہ ہوئے پانچ چھ گھنٹے ہو چکے تھے مگر لے دے کر مسز جہاں زیب، ممی کی بہو اور برتن دھونے والے مائی کے علاوہ کوئی بھی نہ تھا کہ جو صبح سے وہاں بیٹھا ہو لوگ آتے تھے۔ استری جوڑوں کی کریز کا خیال رکھتے ہوئے چاندنی پر چند منٹ دوزانو ہو کر بیٹھتے، ممی کی بہو کے ہونٹوں کے اندر کا کیسٹ آن ہو جاتا۔ وہی جملے وہی حادثہ کی تفصیل، وہی راہ گیروں کی مدد اور آخر کار ہال میں لا کر لٹانے پر بات ختم ہو جاتی۔
اتفاق سے اس روز جمعہ تھا۔ نماز ظہر کے بعد جنازہ لے جانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ کوئی گھنٹہ بھر باقی تھا۔ مگر غسل کا پروگرام جوں کا توں تھا سارے سیکٹر میں کوئی غسل دینے والی بی بی ہی نہیں تھی۔ ممی کی بہو جس سیکٹر میں رہتی تھی وہاں بھی اطلاع بھیجی گئی تھی مگر تاحال کسی ملوانی بی کے آنے کی خبر نہیں تھی۔ انسانوں کی بستی میں ابھی تک موت نے ہار نہیں مانی تھی۔ لوگوں نے زندہ رہنے کے لئے کیسے کیسے جتن کئے تھے۔ کیا کیا خواب گاہیں تھیں! کیا کیا ڈاکٹر پلازہ تھے! مگر کمبخت موت کو دیکھو مارنے کے کیسے ڈھنگ ایجاد کر لئے تھے۔ یہاں کیا نہیں تھا۔ ہر روز پارٹیاں ہوتی تھیں۔ قوالیاں رات رات بھر جاری تھیں۔ کیا پتہ تھا موت کو پارٹی یا قوالی سے نہیں ٹالا جا سکتا! جوں جوں ممی کی بہو ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے پر اشتیاق سے جاتی تھیں اور پھر ناامید ہو کر لوٹتی تھیں توں توں مسز جہاں زیب کے اندر کھد بد تیز ہو جاتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی ماں کا ہیولا ممی کے پلنگ کے گرد گھوم رہا ہے۔ اس کی ماں کی آواز اسے صاف سنائی دے رہی ہے،
"بیٹی آج نہیں تو کل تمہاری باری بھی آئی دھری ہے۔"
چنانچہ اس دفعہ جب ممی کی بہو مایوس ہو کر میت کے قریب بیٹھیں۔ تو اس نے کہا،
"آیئے ہم میت کو جائے غسل تک لے چلیں۔ میں غسل دینا جانتی ہوں۔"

***

فردوس حیدر

نہ ختم ہونے والی چپ

ابھی گاؤں والوں پہ ایسا وقت نہ آیا تھا جب انسان پر سے اعتبار اٹھ جاتا ہے اور اپنی بات کا یقین دلانے کے لئے قسمیں کھانی پڑتی ہیں۔ گاؤں میں کوئی ایسی واردات بھی نہ ہوئی تھی کہ عدم تحفظ کی فضا پیدا ہوتی پھر بھی خدا بخش تاجر اپنے گودام کو خود تالا لگاتا اور تالا لگا کے اسے کئی بار کھینچ کے دیکھتا اور سونے سے قبل اپنے خونخوار کتوں کو کھلا چھوڑ دیتا۔ ہر چند کہ وہ صوم و صلوات کا پابند تھا اور تجارت کو اسلامی پیشہ سمجھ کے اختیار کئے ہوئے تھا پھر بھی وہ ذخیرہ اندوزی کو سودا بیچنے کی تکنیک کہتا اور ماہ صیام میں عمرہ کرنے کے بہانے روپوش ہو کر اپنے ملازموں کی معرفت اشیائے صرف کی قیمتوں میں اضافہ کرتا۔

سال کے مقدس ماہ کے کسی ایک دن اچانک گاؤں والوں پہ افتاد پڑی۔ یہ افتاد ایک عجیب آواز تھی جس نے گاؤں والوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے بچوں کو غور سے دیکھیں۔ وہ صدا کہاں سے آئی تھی۔ سب سے پہلے کس نے سنی تھی۔ اس پر کسی نے بھی غور نہ کیا۔ پریشان کن صورت حال سامنے تھی کہ سب بچے دیکھتے ہی دیکھتے پست قد ہو گئے تھے۔ وہ اشکبار ایک دوسرے کی جانب دیکھتے ہوئے سوچنے لگے ہمیں اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے ورنہ آنے والا کل ہمیں بونوں کی نسل میں تبدیل کر دے گا۔ آن کی آن میں یہ خبر پنچوں تک پہنچ گئی۔ اعلان ہوا کہ صورت حال سے نپٹنے کے لئے نواحی گاؤں کے پنچوں کو بلا لیا گیا ہے۔ فیصلے کا انتظار کیا جائے۔

وہ جو اس گاؤں کا پنچ نہ تھا۔ پنچوں کی اولاد میں سے بھی نہ تھا۔ گاؤں میں اس کا ذاتی کھیت یا مکان بھی نہ تھا پھر بھی وہ اپنے کاندھے پہ گارے کی تگاری اٹھائے مکانوں کی تعمیر میں جٹا رہا اور کھیتوں میں بیج ڈالنے والی کھیپ میں بھی شامل رہا۔ مکانوں کی نیو میں اور کھیتوں کی تڑختی زمین میں اور بدلتی رتوں کی لہلہاتی فصلوں میں اس کے پسینے کی خوشبو رچی بسی تھی۔ اسی لئے وہ پسینے میں شرابور ہے اور اس پر کپکپی طاری ہے۔ گاؤں والوں کا یہ بھی خیال تھا کہ ایسی کیفیت برسوں بعد لاکھوں انسانوں میں سے کسی ایک پر طاری ہوتی ہے اور

اجتماعی احساس کو بیدار کرنے کی بنا ڈالتی ہے۔

گاؤں کے ٹھنڈے میٹھے پانی والے کنویں کے قریب پیپل کے نیچے سیمنٹ کے تھڑے پہ تمام پنچ سر جوڑ کے بیٹھ گئے۔ گاؤں والے اپنے کو تاہ قد بچوں سمیت تھڑے کے اردگرد دھول اڑاتی زمین پر سراپا انتظار بنے خاموش ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ انتظار کا ایک ایک لمحہ مردوں کے تنفس کو بے ترتیب کرتا رہا اور بچے فیصلے کی اہمیت سے بے نیاز سوتے رہے۔ نہ جانے کب تک وہ اسی حالت میں بیٹھے رہے—ایک دن۔ ایک دن کا کچھ حصہ یا کئی دن—مدت کا تعین کرنے کی نوبت یوں نہ آئی کہ سب فیصلے کی نوعیت میں الجھ کے رہ گئے۔ فیصلہ ناقابل یقین تھا اور ناقابل عمل بھی۔ صورت حال سے نپٹنا مزید دشوار ہو گیا۔

تھڑے کے اردگرد کچی زمین پہ بیٹھے لوگوں نے تھڑے کے پکے فرش پر بیٹھے پنچوں کی جانب حیرت سے دیکھا ”تمہارے لئے دراز قد رسالہ خان کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ جو نہایت توانا ہے اور جس کے تھیلے میں تمہاری نسل کو قد آور بنانے کے بیج موجود ہیں۔ اپنی عورتوں کو آگاہ کر دو کہ وہ اس کی بھوک پیاس کا بطور خاص خیال رکھیں۔“ اعلان ختم ہوا۔ لوگ وہیں دم بخود بیٹھے رہے۔ وہ اس حالت میں نہ جانے کب تک بیٹھے رہے۔ ایک دن۔ ایک دن کا کچھ حصہ یا کئی دن۔ مدت کا تعین کرنے کی نوبت یوں نہ آئی کہ نیا اعلان پہلے سے بھی زیادہ پریشان کن تھا۔ ”جب دراز قد کسی بھی گھر میں داخل ہو تو صاحب خانہ پہ لازم ہے کہ وہ اپنی دہلیز عبور نہ کرے۔ خلاف ورزی کرنے والے کو بھاری جرمانہ یا کئی دن کی جیل یا دونوں سزائیں دی جا سکتی ہیں۔“ جیل کی بلند قامت دیواروں کے تصور نے انہیں مزید نڈھال کر دیا۔ پنچوں کا فیصلہ ان کی بقا کا ضامن ہے یا وہ قد آور نسل پیدا کرنے سے عاجز ہیں۔ سب کچھ بے معنی ہو گیا کہ تا وہی کار روائی کا خیال اعصاب کو مفلوج کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ نہایت سوچ بچار کے بعد انہوں نے خاص وضع کے بوٹ تیار کرنے کا ارادہ کیا اور انہیں پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ پنچوں سے رسالہ خان کے بارے میں معلومات حاصل کر سکے چنانچہ ایک خاص وضع کے ایڈ جسٹیبل بوٹ بنوائے گئے اور پنچوں کی معرفت دراز قد کو پیش کرتے ہوئے۔ دست بستہ گزارش کی گئی کہ صاحب خانہ کی سہولت کے لئے کسی بھی گھر میں داخل ہونے سے پہلے یہ بوٹ باہر اتار دیئے جائیں۔ اپنی دانست میں لوگوں نے قانون کی گرفت سے بچنے کا سامان کیا تھا لیکن وہ ایک نئے آزار میں مبتلا ہو گئے۔ جب بھی کوئی مرد تھکن اتارنے کے

لئے اپنے گھر کا رخ کرتا خاص وضع کے بوٹ دہلیز سے باہر پڑے ملتے۔ صاحب خانہ تادیبی کارروائی کے خوف سے چوکھٹ پہ بیٹھ جاتا۔ یوں چوکھٹ پہ بیٹھنے کا سلسلہ نہ جانے کب تک جاری رہا۔ اس پہ غور کرنے کی نوبت یوں نہ آئی کہ گاؤں والے ایک نئے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ ہر گھر میں بالشت بھر کا بچہ پیدا ہوا۔

وہ رونے لگے اور روتے ہوئے ایک دوسرے سے کہنے لگے۔ "ہم نے تو کبھی کسی غیر معبد کے تیاون نہ تپائے تھے پھر بھی ہمارا گاؤں کسی ناپاک روح کی نحوست میں کیوں گھر گیا ہے۔ ہماری عورتوں کے حمل ٹھہرتے ہیں لیکن پیدا ہونے والے بچے—؟" پھر وہ سوچنے لگے ہم اپنے گھروں کی دیواروں پر اپنے پرکھوں کی تصویریں آویزاں کر دیں ممکن ہے اسی طور ہماری عورتیں ہمارے پرکھوں جیسے قد آور بچے پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ پرانے اخبار کا ایک تراشا نہ جانے کہاں سے اڑتا ہوا سیمنٹ کے تھڑے پر آ گیا اور لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ "بستی باوا آدم میں ایک شخص خلیق احمد نے اپنے بھائی اور اپنی بیوی کو قتل کر دیا۔ اس کا بیان ہے کہ مقتولین کے آپس میں ناجائز تعلقات تھے لہٰذا اس نے جو کچھ بھی کیا کار ثواب سمجھا جائے۔" لوگ سیمنٹ کے پختہ تھڑے کے سامنے کھڑے بار بار اخبار کا تراشا پڑھتے رہے اور اس بات پر غور کرتے رہے کہ یہ تراشا کس اخبار کا ہے اور کہاں سے آیا ہے۔

عمرہ کرنے کے بہانے روپوش ہونے والا تاجر خدا بخش سفید عبا زیب تن کئے عید کی خریداری کے دوران قیمتوں میں مزید اضافے کے امکانات کا جائزہ لینے نکلا تو تھڑے کے سامنے ہجوم دیکھ کر رک گیا۔ اخبار کا تراشا پڑھتے ہی وہ چیخا "عورت فساد کی جڑ ہے۔ اس نے آدم کو جنت سے نکلوایا اور بھائی سے بھائی کو قتل کرایا۔ فساد کی جڑ کو ختم کر دو' ختم کر دو۔" لوگوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور پھر انھوں نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

وہ جو اس گاؤں کا پنچ نہ تھا۔ پنچوں کی اولاد میں سے بھی نہ تھا۔ اس گاؤں میں اس کے لئے کوئی ذاتی کھیت یا مکان بھی نہ تھا لرزہ براندام لوگوں کے بیچ کھڑا تھا۔ اسے محسوس ہوا۔ مکانوں کی نیو میں اور کھیتوں کی تڑختی زمین میں سے اس کے پسینے کی خوشبو یک لخت غائب ہو گئی ہے اور لہلہاتی فصلیں خشک ہو گئی ہیں۔ تب اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ نہایت خاموشی سے کسی نامعلوم سمت روانہ ہو جائے اور اپنے ہمراہ اپنے بیوی بچوں کے علاوہ ایک ایک جوڑا جانوروں اور پرندوں کا بھی لے جائے اور اپنا نسب نامہ وہیں چھوڑ جائے کہ اسے کامل یقین تھا لوگ خدا بخش تاجر کی بات مان جائیں گے۔

زیتون بانو

پیغور

آج اپنی انا کی کیبنٹ میں سے اوزار نکال نکال کر اپنی روح پر تعصب کے کروڑوں اگے بال آہستہ آہستہ نوچنے میں مگن ہوں۔ جوں جوں یہ بال نوچ رہی ہوں تو دیکھ رہی ہوں کہ ان سے کئی گنا زیادہ سخت کھردرے مضبوط بال اگے چلے آرہے ہیں اور میری ذات کے خول کے تمام حصوں پر جگہ جگہ نفرت کی برسات کی بوندیں چھما چھم چھما چھم برسے چلی جارہی ہیں۔ آپ نے کبھی اس نوع کی بوندیں اپنی ذات کے کسی حساس حصے پر کسی بھی حس پر محسوس کی ہیں؟ ہاں تو یہ میرا ذاتی تجربہ ہے اور ــــــ

دراصل یہ میری پشیمانی کے آنسوؤں کے وہ قطرے ہیں جنہیں میں روک نہیں رہی ہوں کہ اب میں وہ نہیں ہوں جو برسوں پہلے تھی۔ اب تو بات بے بات میری آنکھیں چھلک پڑتی ہیں اور ذرا بھی نہیں شرماتی۔ پہلے آنسو پینے میں بڑا مزہ آتا تھا کہ اسی میں میری انا کو تسکین ملتی تھی' اب آنسو بہانے میں اپنے عورت پنے کا ثبوت مہیا کر رہی ہوں۔

تو ہاں۔ بات ہو رہی تھی انا کی کیبنٹ کے اوزاروں سے اپنی روح پر اگے بال نوچنے کی' اور اس طرح اپنی ذات کو پوتر بنانے کی ناکام کوشش کی۔

یہ ناکامی میری اپنی ناکامی نہیں ہے۔ یہ تو برسوں پہلے اس نظام کی شکست کا یک شائبہ سمجھئے جس کی میں نہیں بلکہ میرے خالقین پروردہ تھے اور جنہوں نے اپنی ممتا کی گھٹی میں گھول کر یہ سب کچھ مجھے پلا دیا تھا اور میں جانتی ہوں کہ اس کھاتے کا نہ کوئی حساب رکھا گیا ہے اور نہ ہی احتساب ہو گا۔ لیکن میں احتساب کے اسی پلڑے میں چڑیا کے پر جتنی وقعت بھی نہیں رکھتی ہوں کہ سب کچھ کھو بیٹھی ہوں۔

یہ سارا کچھ میں اپنی نظر سے تول رہی ہوں اور میری نظر کا یہ ترازو جانتی ہوں بالکل بے وزنہ ہو چکا ہے کہ میری نگاہ کبھی اس پلڑے کو جھکتا دیکھتی ہے اور کبھی وہ پلڑا وزنی دکھائی دیتا ہے۔ لیکن یہ میری اس دھرتی کی زمین پر دکھایا جانے والا وزن ہے' جسے میں کچھ عرصہ قبل اپنی ماں سمجھ کر پیار کرتی تھی اور جو اب اپنا توازن کھو بیٹھی ہے' اور اس لئے

میں بھی لڑکھڑاتے قدموں سے اپنی شکست اور لاوزنی روح کے ساتھ لرزتے قدموں سے کھڑی یہ سب کچھ دیکھ رہی ہوں اور جانتی ہوں کہ ایسا کرنے پر مجبور ہوں۔

تو ہاں! آج سے پتہ نہیں کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے۔ چلئے میری عمر جتنا عرصہ سمجھ لیجئے۔ یا شاید صدیوں پہلے کا یہ واقعہ ہو گا۔ جب میں اپنے گاؤں کی کچی دیواروں کے کچے مکان کے کچے گرد آلود صحن میں پاؤں پاؤں چلنے کے قابل ہوئی تھی۔ جب میں نے چیزوں سے رشتہ جوڑنے کی مہم کا آغاز کیا تھا۔ جب میں ہر نئی چیز کا ایک نیا نام سن کر سیکھا کرتی تھی اور جانے ذہن کے کس حصے میں وہ محفوظ بھی ہو جایا کرتا تھا۔ ان ناموں کے حروف کبھی ادھر لڑھکے کبھی وہاں کھسکے لیکن لفظ اپنی جگہ محفوظ رہے۔ جس طرح اب ہر لفظ اپنی جگہ پر محفوظ رہے۔ وہ الگ بات ہے کہ بہت سارے الفاظ اپنے معنی بدل چکے ہیں اور اسی لئے آج کئی جملے مختلف مفہوم کے حامل ہو کر رہ گئے ہیں—— تو میں نے بھی الفاظ اکٹھے کر کے اپنے منہ میں رکھے اور وقت بے وقت کے استعمال سے اب وہ اتنے گھس چکے تھے ہیں کہ میں خود بھی ان پر پھسلتی جا رہی ہوں۔ الفاظ اور جملوں کے اس گورکھ دھندے میں میں نے صدیاں بتائیں اور مجھے بہت کچھ سکھلایا گیا۔ مجھے کچھ بھی نہیں بھولا ہے' مجھے سب یاد ہے اور مجھے یاد ہے کہ میں اپنے کچے مکان کچے صحن میں چلتی پھرتی رہا کرتی تھی تو ہمارے اس مکان کی ڈیوڑھی میں ہمارے گاؤں کا ایک نائی' جس کا نام سبحان تھا۔ ہانک لگاتا۔ شاید روزانہ' یا دوسرے تیسرے روز' یا شاید ہفتہ بھر بعد—— وقت کے اس چکر پھیری میں شاید غلطی کر بیٹھوں کہ میں وقت کی بڑی چور ہوں۔ جب بھی کسی کام کا صحیح یا غلط وقت آیا میں سوچوں اور تدبیروں کے کنڈے لئے کنارے کنارے احتیاط کی دلدل سے بچتے بچاتے وقت گنوا بیٹھی۔ پھر اس گئے وقت پر منافقت کی چادر تلے چپکے چپکے آنسو بہایا کرتی۔ عورت کی کمزوری والا رونا کبھی نہیں روئی۔ لیکن آج اپنے عورت ہونے کا ثبوت پیش کرنے کے واسطے برملا آنسوے بہانے میں کوئی عار محسوس نہیں کر رہی ہوں۔

اور سبحان نائی بھی بیٹھا انتظار کرتا' ایک آدھ ہانک لگاتا' کبھی عار محسوس نہیں کرتا تھا۔ وہ ہماری ڈیوڑھی میں بچھے بان کی چارپائی پر بیٹھ جاتا' مجھ سے یا کسی اور سے ایک چھوٹی سی کٹوری میں پانی منگواتا' اپنی کسبت میں سے صابن کی چھوٹی سی ٹکیہ نکال کر جھاگ اٹھاتا۔ انتظار کرتا۔ پھر استرا نکال کر چمڑے کا بنا ایک پٹا سا چارپائی کے پائے میں اٹکاتا۔ استرا اس پر رگڑتا۔ ہتھیلی پر پھیرتا۔ انتظار کرتا۔ یہ عمل وہ بار بار دہراتا۔ تاوقتیکہ ہمارے دادا جان یا میرے پانچ چچاؤں میں سے کوئی ایک گھر سے باہر برآمد ہوتا' میں یہ سب کچھ بڑے چاؤ سے

دیکھا کرتی۔ سرمنڈھواتے، داڑھی مونچھ کی نوک پلک درست کرواتے دیکھتی۔ انجانے میں اپنی تھوڑی پر کبھی ہاتھ بھی پھیر لیتی۔ اس وقت مجھے خوا مخواہ چھینک آجاتی، جب ابو یا چچا دادا کی ناک میں سے سبحان نائی کا موچنا ایک جھٹکے کے ساتھ پرے ہوتا۔

پھر اسی سلسلے کی جانے کونسی کڑی کا وہ کونسا ایسا پھلا میرے دادا جان کو نظر آیا کہ اب جب بھی سبحان نائی کی ہانک پر باہر اپنے مکان کی ڈیوڑھی کی طرف بڑھتی تو دادا جان کی پھنکار میرے قدم گھر کے اندر ہی روک لیتے اور اب میں یہ نظارہ دیکھنے سے محروم رہ گئی تھی۔

محروم میں اس روز بھی ہو گئی تھی جب ہمارے والد گاؤں کی سکونت چھوڑ کر اسلامیہ کالج پشاور کے کلرکوں والے کوارٹروں میں سے ایک کوارٹر میں ہم سب سمیت اٹھ آئے تھے۔

میرا گاؤں سفید ڈھیری اسی اسلامیہ کالج کا باپ ہے کہ میرے گاؤں کی زمین نے اسلامیہ کالج پشاور اور پھر یونیورسٹی آف پشاور کو اپنے دامن تلے بسایا ہوا ہے۔ اسی اسلامیہ کالج کی فزیکس لیباٹری میں میرے والد ڈیمانسٹریٹر لگے ہوئے تھے۔ یہ سارے الفاظ اور یہ سارے نام میں آہستہ آہستہ سیکھتی رہی تھی اور محفوظ کرتی گئی تھی۔ اور اب جب بولتے بولتے یہ سارے الفاظ تقریباً گھس چکے ہیں تو ان کی کوئی بھی وقعت میری اپنی نظر میں نہیں رہی ہے اور تب ہی تو ان الفاظ کو محفوظ کرنے کا کام میرے قلم نے سنبھال لیا ہے اور یہ قلم مجھے میری گھر پر تھوڑی بہت پڑھی لکھی ماں نے پکڑایا تھا۔ اس کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ قلم کی حرمت کیا ہوتی ہے کہ ایک روز میری ماں نے میرے والد کے نام کوئی پیغام لکھ کر ان کے دفتر میرے چھوٹے بھائی کے ہاتھ بھجوایا۔ یہ کوئی نہایت اہم پیغام تھا۔ میں بعد میں کبھی بھی ماں سے اس پیغام کے بارے میں پوچھنے کی جرات نہ کر سکی۔ حالانکہ میں اب بچی نہیں رہی تھی۔ پوری جوان عورت تھی۔ لیکن اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ سبحان نائی نے اپنے ایک بیٹے کے حصے کی کسبت اس کے کندھے سے اتار کر اپنے کندھے پر دھری تھی اور اسے انجینئر بنوایا تھا۔ ولایت سے واپسی پر سبحان نائی نے اس کے لئے میرا رشتہ مانگا تھا۔ ماں نے بڑی سوچ وچار کے بعد زبانی جرات نہ کر کے۔ لکھ کر اپنی مرضی کا اظہار کیا تھا کہ میرا یہ رشتہ قبول کیا جائے جس کو برداشت کرنا ایک سید آدمی کی نخوت نے گوارا نہ کیا—— میں ایک سید زادی اور ایک جدی پشتی نائی کی بہو بنوں گی؟۔

ہوا یوں تھا کہ وہ رقعہ جلدی میں میرے چھوٹے بھائی نے میرے والد کے دفتر کے

چپڑاسی کو پکڑا دیا تھا اور خود سکول چلا گیا تھا کہ اسے سکول سے دیر ہو رہی تھی۔ چپڑاسی نے دوسرے کلرک کے سپرد کیا۔ کلرک نے لیب بوائے کو دیا۔ اور پھر وہ رقعہ ہوتے ہواتے جب والد تک پہنچا تو میری والدہ کی تحریر میں چھپے وار کی زد میں میری ماں بیچاری آئیں۔ اس وقت پھنکارتے جھاگ منہ سے نکالتے والد صاحب گھر میں داخل ہوئے اور اپنی پوری مردانگی کے ساتھ امی کو لہولہان کر گئے۔ ہماری والدہ نے ایک بھی آنسو نہیں بہایا کہ ان کے جسم کے تازہ تازہ زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔ ان کی زبان پر صدا کی لہریں مثبت تھیں کہ ہمارے نانا نے ان کی پرورش ہی ایسی کی تھی۔ بڑی احتیاط سے۔

میں نے شاذ ہی اپنے ماں باپ کو آپس میں کبھی بیٹھ کر باتیں کرتے سنا ہو گا۔ وہ کیا الفاظ ہوئے تھے جن کا وہ کبھی کبھار تبادلہ کر لیا کرتے تھے' میں کبھی نہیں جان سکی اور اسی لئے آج بھی وہ یاد نہیں آ رہے ہیں۔

اور آج پھر الفاظ اور جملوں کی صدیوں بوسیدہ پٹاری کھولے انا کی کبست میں سے وہ اوزار ڈھونڈ رہی ہوں جن سے اپنی روح پر تعصب کے وہ کروڑوں بال نوچ سکوں جن کے اکھیڑنے سے نہ مجھے چھینک آئے اور نہ ہی میں لہولہان ہوں۔ میں اپنے الفاظ اور اپنے جملے بھی زخمی ہونے سے بچا رہی ہوں۔ میں سبحان نائی کے انجینئر بیٹے سجاد خان کے مطالبے کا کیا جواب دے سکتی ہوں کہ اس نے اپنے ڈاکٹر بیٹے کے لئے میری ایم اے پاس بیٹی کا رشتہ مانگا ہے؟

☆ پیغور طعنہ (ایسا طعنہ جسے کوئی بھی پشتون برداشت نہیں کرتا اور مرنے مارنے پر تل جاتا ہے۔ پیغور کی وجہ سے کئی خاندان تباہ ہوئے ہیں)

سعیدہ گزدر

اذانوں کے دیس میں

ان دنوں پتہ نہیں کیا ہوا تھا دل چاہتا تھا افسانے لکھنا ہی چھوڑ دوں۔ مجھے یہ سب کچھ بڑا بے کار لگنے لگا۔ ایسا کیوں ہوا تھا شاید اس کی وجہ میرے رویوں میں تبدیلی تھی۔ زندگی کے بارے میں میرا رویہ بڑا مختلف ہو چکا تھا' بہت سی اہم چیزیں اب اپنی اہمیت کھو چکی تھیں۔ اور بڑی معمولی باتیں اہم لگنے لگی تھیں۔ میں نے چیزوں کو' لوگوں کو' اور موسموں کو غرض کہ ہر شے کو اپنی ذات کی عینک سے دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ میں ہر شے کو حقیقت کے مطابق اس کی جگہ پر دیکھنے کی خواہش کرنے لگی یعنی اب میں چیزوں کو اپنے معیار اور اپنی سطح تک لانے کی غلطی نہیں کرتی اور یقین جانئے ایسا کرنے سے زندگی خاصی آسان ہو گئی ہے۔ آسان لفظوں میں آپ اسے توقعات کا مسئلہ کہہ سکتے ہیں' یہ تو تھی میری بات۔ اب قصہ سنئے اس عورت کا جس نے میرے ذہن کو وہ پٹخیاں دیں کہ کیا بتائیں۔ ہوا یہ کہ میں جب سے ایک رسالے سے منسلک ہوئی ہوں اور باقاعدہ فیچر لکھنے کا آغاز کیا ہے ایسے ایسے کرداروں سے واسطہ پڑتا ہے کہ مجھے لگا ہے کہ دنیا میں سوائے برائیوں کے کچھ نہیں۔

قریب قریب سب ہی قیامت کی نشانیاں لگتی ہیں۔ اس روز مجھے ایک ایسی عورت سے ملنا تھا جس کے متعلق اطلاع ملی تھی کہ وہ عصمت فروش تھی۔ دنیا میں ایسی بہت سی عورتیں ہونگی پھر ایڈیٹر صاحب نے اس کا ہی انتخاب کیوں کیا؟ بہرحال مجھے اس سے غرض نہیں تھی مجھے تو اس فیچر سے ملنے والے روپوں سے غرض تھی۔ لہٰذا میں اس کے پتے پر جا پہنچی' لمحہ بھر کو اس کی شکل دیکھ کر مجھے لگا کہ میری اطلاع غلط ہے۔ اس کا چہرہ بہت معصوم تھا' اس کے خوبصورت بالوں نے اس کے گرد ہالہ سا بنا رکھا تھا' کمال ہے میں نے تو سنا تھا ایسی عورتوں کے چہروں پر ان کے اعمال صاف صاف آجاتے ہیں۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر حیران تھی' شاید اس لئے کہ وہ اپنے ہاں مردوں کی آمدورفت کی عادی تھی۔

چلچلاتی دھوپ تھی۔ ایک گاڑی نو پارکنگ کے بورڈ کے آگے آکر رکی۔ ٹریفک پولیس کا سپاہی لپک کر قریب آیا "صاحب یہ نو پارکنگ ہے" اس نے بورڈ کی طرف اشارہ کیا

"بس ایک منٹ کی بات ہے سامنے سے ایک رسالہ خرید کر ابھی آیا" گاڑی والے صاحب نے لجاجت سے کہا اور لپک کر دکان میں داخل ہو گئے پانچ منٹ بعد واپس آئے اور گاڑی اسٹارٹ کی....

"صاحب کچھ ہمارا بھی خیال کیجئے" سپاہی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا

"کیا مطلب ہے' رشوت مانگ رہے ہو؟" وہ صاحب تیز ہو گئے۔

"رشوت نہیں ہے یہ تو.... " سپاہی نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

"معلوم ہے یہ غیر قانونی بات ہے۔"

"یہاں گاڑی کھڑی کرنا بھی تو غیر قانونی ہے میں آپ کا چالان کروں گا۔" سپاہی نے کڑک کر کہا۔ ان صاحب نے چند لمحے کچھ سوچا جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر سپاہی کی طرف بڑھا دیا۔ سپاہی نے نوٹ پکڑا ہی تھا کہ ایک بھاری ہاتھ اس کے کندھے پر پڑا۔

"رشوت لیتا ہے" یہ کانسٹیبل تھا اور رہتا بھی اسی کے محلے میں تھا اور محلے کے نلکے پر پانی کے لئے دونوں میں کئی بار جھگڑا ہو چکا تھا' دشمنی نکالنے کا اور محکمے میں اپنا ریکارڈ بنانے کا اس سے بہتر کون سا موقع تھااور تھانے والے تو ویسے بھی اسی حمام سے تعلق رکھتے تھے جہاں سب ہی.... مگر اس کے باوجود رشوت کے جرم میں سپاہی کی رپورٹ ہو گئی اسے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

اس نے تینوں بچوں کو سلا دیا تھا' رات کے گیارہ بج رہے تھے کھانا کب کا ٹھنڈا ہو چکا تھا' مگر اب گیارہ بجنے تک اس کا کوئی پتہ نہیں تھا' وہ بے چاری انتظار کر کر کے تھک چکی تھی۔ اب اسے نیند کے جھونکے آرہے تھے وہ ہمیشہ سے جلد سونے کی عادی تھی گاؤں میں آٹھ نو بجے تک تمام لوگ سو چکے ہوتے تھے۔ اور سویرے چار بجے صبح دن بیدار ہو جاتا تھا مگر یہاں شہر میں اسے عجیب دستور لگتا تھا دیر تک جاگنا اور دیر سے اٹھنا' اس کا شوہر بھی تھا تو گاؤں کا مگر چھوٹی عمر میں شہر آگیا تھا' کبھی کبھار گاؤں جاتا تھا۔ چند سال قبل اسے بیاہ کر شہر لے آیا تھا' وہ ابھی دلی طور پر شہر کے ماحول سے ہم آہنگ نہیں ہوئی تھی۔ بے زاری سے سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی اور بہت سویرے جب ملگجا اندھیرا صبح ہونے کا اعلان کر رہا تھا تو سب سے چھوٹے بچے کے رونے کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تمام رات دروازہ بھڑا رہا تھا اور اس کا شوہر نہیں آیا تھا' اس نے پریشان ہو کر چاروں طرف نظر دوڑائی "کس کو بلائے اس وقت سارا محلّہ سو رہا ہو گا"

اس نے بچے کو دودھ پلاتے پلاتے سوچا اور ذرا دن نکلنے کا انتظار کرنے کے ساتھ ہی

اپنے شوہر کی خیریت کی دعا مانگنے لگی۔ دن نکلتے ہی اور زندگی کے جاگتے ہی محلے میں یہ خبر گرم تھی کہ اس کا شوہر کل شام رشوت لیتے ہوئے پکڑا گیا۔ ہر شخص کی زبان پر یہی کہانی تھی وہ سخت ہراساں بیٹھی تھی۔ سیدھی سادھی عورت ان حالات سے انجان' شہر کے رواجوں اور دستوروں سے ناآشنا سوائے رونے کے کیا کر سکتی تھی۔ محلے کے لوگ اسے تسلی دے رہے تھے غریب خود تسلیوں کے سہارے زندہ رہتا ہے اور خوشی غمی میں دوسرے کو بھی تسلیوں کے تحفے دیتا ہے۔ بعض اوقات یہ طفل تسلیاں ہوتی ہیں جیسا کہ اس وقت تھا۔ سب جانتے تھے کہ پولیس کے چنگل سے بچ نکلنا اور وہ بھی معمولی سپاہی کے لئے آسان نہ تھا مگر سب اسے اس کے شوہر کی رہائی کی امید دلا رہے تھے۔ دو تین دن گزر گئے کچھ پتہ نہ چلا آخر تنگ آکر اس نے اس کانسٹیبل کی خوشامد کی بھیا مجھے تھانے لے چلو۔ اسی کانسٹیبل نے جس نے اس سارے معاملے میں اپنا نام تک نہیں آنے دیا اسے تسلی دی "صبر کرو بہن کاروائی ہو رہی ہے تمہارا اس جگہ جانا ٹھیک نہیں۔" وہ مزید صبر کر کے بیٹھ گئی۔ گھر میں پیسے نہیں تھے جو آٹا دال تھا وہ بھی ختم ہو چلا تھا ابھی تو اسے اپنے شوہر کی فکر تھی اس کی ذات سے وابستہ آسائشوں کے متعلق تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ آخر روز روز کے تقاضوں سے تنگ آکر ایک دن کانسٹیبل اسے تھانے لے گیا۔ حوالدار نے اس کا سر سے پیر تک تفصیلی جائزہ لینے کے بعد بتایا! " تمہاراا شوہر تو جیل میں ہے بی بی"

"صرف دس روپے کے لئے اسے جیل ہو گئی۔" وہ حیرت اور بے چارگی سے بولی "دس روپے کے پیچھے نہیں رشوت کے پیچھے.... رشوت لی تھی اس نے" حوالدار نے زور دے کر کہا۔ شاید بہت پابند شرع آدمی تھا۔ شرعی داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ وہ غریب عورت مرعوب بیٹھی تھی "مگر اب کیا ہو گا؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "ابھی تو مقدمہ چلے گا" تھانیدار نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا "مقدمہ؟" اس کی سمجھ میں خاک نہیں آیا وہ رونے لگی "بھائی میری مدد کروں میں تنہا عورت ہوں کوئی عزیز رشتہ دار نہیں ہے۔ میرا گاؤں میں بوڑھا باپ ہے وہاں جا نہیں سکتی۔"

"برے کام کا برا ہی انجام ہوتا ہے بی بی اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔ قانون بہت سخت ہو چکا ہے ملک میں اسلامی نظام چل رہا ہے" حوالدار نے سمجھایا "معلوم ہے رشوت لینا کتنا بڑا گناہ ہے۔ آدمی کو ذرا سے پیسے کے لئے ایمان نہیں دے دینا چاہئے اب بھگتو جو کیا ہے۔"

"کیا تو اس نے ہے مگر بھگت میں کیوں رہی ہوں۔" اس نے روتے روتے سوچا۔ چھوٹا

بچہ دودھ پیتا تھا مگر دو بڑے روٹی کھاتے تھے جس کا اب انتظام نہیں رہا تھا۔ گھر میں جو کچھ تھا وہ پیٹ میں جا چکا تھا اور یہ ازل سے خالی پیٹ اسی طرح روٹی مانگ رہا تھا۔ ایک دو وقت محلے والوں نے کچھ نہ کچھ بھجوا دیا مگر کہاں تک۔ غریبوں کا محلّہ تھا ہر ایک کے لئے اپنی دو روٹیاں مشکل تھیں۔ دوسروں کا کون ٹھیکہ لیتا لہٰذا اس نے خود ہی کچھ کرنے کی ٹھانی۔ کسی کے بتانے پر ایک جھینگا فیکٹری جا پہنچی سیٹھ نے چادر میں چمکتے چاند کو دیکھا اور ہونٹوں پر زبان پھیری "تم یہ کام نہیں کر سکتیں ادھر فیکٹری میں بڑی ٹھنڈک ہوتی ہے۔"

"میں سب کچھ کر لونگی میرے بچے کل سے بھوکے ہیں۔" اس بے بے چارگی سے کہا سیٹھ نے مجبوری کا اچھی طرح اندازہ لگایا۔ "اچھا شام کو آنا کام مل جائے گا۔" وہ سوچتی اٹھ گئی شام کو کیا کام ہوتا ہے کام تو صبح ہوتا ہے۔ بچے سارا دن بھوک سے بے چین رہے اس نے شام کی تسلی پر انہیں پانی پلا پلا کر بہلا دیا پھر شام کو جیسے تیسے سیٹھ کے پاس پہنچی تو فیکٹری خالی تھی۔ سیٹھ اکیلا بیٹھا فائلوں پر جھکا کام کر رہا تھا' باہر چوکیدار موجود تھا اور بس پھر.... پھر اسے کام مل گیا۔

سیٹھ نے جانے سے پہلے اس کے ہاتھ پر دس کا نوٹ رکھا "تم جیسی خوبصورت عورت کو جھینگے کا گندہ کام نہیں کرنا چاہئے بس تم روز آجایا کرو۔"

وہ بڑی دیر تک دس کے نوٹ کو دیکھتی رہی' سانپ کی طرح ڈستا ہوا دس کا نوٹ اس کے شوہر کے ماتھے پر رشوت کا داغ' اس کی عزت کا بدل اور یہ کہ اس کے بچوں کی بھوک کا مداوہ.... دس کا یہ معمولی نوٹ.... انسان نے انسان کی قیمت کتنی کم لگائی ہے اور .... عورت.... وہ تو ویسے بھی اس منڈی کی سب سے کم قیمت جنس ہے۔ مردوں کے اس معاشرے میں جہاں قانون اور شرع نے تمام حقوق صرف مردوں کو دیئے ہیں اور اس کے ہر فعل کو پیغمبروں کی پیروی سمجھا جاتا ہے۔ بھلا شبنم کے قطرے جتنی معمولی ہستی رکھنے والی عورت کو سر اٹھانے کا کیا حق جسے سورج کی پہلی کرن ختم کر دیتی ہے۔

اور.... اس ازل سے ابد تک پھیلی ہوئی شبنم جیسی عورت کو سورج کی پہلی کرن چھو چکی تھی۔

وہ خاموشی سے بغیر ایک لفظ کہے اٹھ آئی' تھانیدار نے تو کہا تھا کہ اسلامی نظام ہے بڑی سختی ہے حکومت سختی سے شرعی قوانین پر عمل کر رہی ہے۔ بہت سے لوگوں کو کوڑے پڑتے ہیں مگر وہ یہ بات کبھی نہیں جان سکتی کہ اس سیٹھ کو کبھی کوڑے نہیں پڑ سکتے اس لئے کہ اس کا بھائی حکومت کے ایک بڑے عہدے پر فائز ہے۔ ایسے قانون سے بالاتر

ہوتے ہیں جن کے بھائی بند اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوں یا اسمبلیوں کی رکنیت رکھتے ہوں، چاہے حکومت کتنی ہی اسلامی کیوں نہ ہو۔

دو تین دن گزر گئے دس کے نوٹ کا آخری پیسہ خرچ ہو گیا۔ گھر میں پھر فاقے ہونے لگے وہ پیچھے لائن سے بنی کوٹھیوں میں کام ڈھونڈنے نکلی۔ اس طرف اس نے پہلی بار قدم رکھا تھا صبح سے دوپہر ہو گئی اسے کام نہ ملا۔ اس نے آسمان کو دیکھا.... کیا آسمان کے کسی کونے سے وہ غفورالرحیم اس کا حال دیکھ رہا ہے.... وہ جس کے خزانے میں کسی شے کی کمی نہیں۔ کیا اس کے پاس اس لمحے ان تین بدنصیب بچوں کے لئے روٹی کے چند ٹکڑے نہیں ہیں.... وہ جس کے دل میں سات ماؤں کی ممتا ہے کاش ان معصوموں کو ایک ماں بن کر ہی دیکھ رہا ہو مگر وہ مارے عذاب کے خوف کے یہ نہیں سوچ سکتی تھی کہ جو کسی سے نہیں جنا گیا اور جس نے کسی کو نہیں جنا وہ ممتا کیسے رکھ سکتا ہے، تکلیف سہ کر بچہ پیدا کرنے اور کن کہہ کر انسان تخلیق کرنے میں بڑا فرق ہے وہ جس کے اختیار میں دو جہانوں کے خزانے ہیں کاش اس نے ہزاروں انسان بنانے کے بجائے ایک بچہ پیدا کر لیا ہوتا تو آج یہ تین بچے بھوک سے تڑپ نہ رہے ہوتے۔ اس کے دل میں خداؤں والی سات ماؤں کی بجائے انسانوں والی ایک ماں کی محبت ہوتی۔

تینوں بچے سہمے ہوئے اس سے چمٹے تھے اور حوالدار کے سامنے بیٹھی اپنی داستان کا رد عمل اس کے چہرے پر ڈھونڈ رہی تھی۔

"اللہ بہت بڑا ہے" حوالدار نے اپنی شرعی داڑھی پر ہاتھ پھیرا "مگر یہ بات کہ میں تمہارے شوہر کو رہائی دلا دوں میرے اختیار میں نہیں ہے بی بی۔"

"پھر آپ کے اختیار میں؟" اس کے سیدھے سیدھے سوال میں کیا چیز تھی کہ حوالدار نے پانی کا گلاس جلدی سے منہ سے لگایا "میرے اختیار میں۔" اس نے ذرا تولنے والی نظروں سے عورت کو دیکھا۔ حوالدار کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ ہر طرح کے لوگ اس کے ملنے جلنے والوں میں شامل تھے۔ جن میں بہت سے ضرورت مند بھی ہوتے تھے۔ ادھر یہ عورت بھی ضرورت مند تھی۔ دو ضرورت مندوں کی ضرورت باہمی سمجھوتے سے پوری ہو جائے تو کیا برائی ہے بلکہ عین نیکی ہے۔ سو یہ نیکی حوالدار نے کی۔ بس یہ تھا کہ آخر وہ بھی انسان تھا۔ اس کی بھی ضروریات تھیں اس نے عورت اور اس کے تینوں بچوں کے فاقہ زدہ جسموں کو اگر روٹی دی تھی تو مفت میں تو نہیں دی تھی.... اور وہ ناشکری عورت سوچ رہی تھی کہ گاؤں کے مولوی صاحب اور محلے کے پیش امام کی داڑھی بھی حوالدار کی داڑھی

جیسی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا فرق کیسے پتہ چلے۔ کیا شیطان کی بھی ایسی ہی داڑھی ہے؟ شبنم کا معمولی قطرہ تیز کرنوں کو کہاں تک سہہ سکتا ہے؟

اس کو کئی گھنٹے اس سماجی کارکن نے جس کا دل معاشرے کے دکھوں پر لہولہان تھا' بٹھا کر دنیا کی اونچ نیچ سمجھائی۔ وہ حوالدار کا دوست تھا۔ جیل کے معائنے کے لئے آتا تھا اور حتی الامکان جس کے لئے جو کچھ ہوتا کرتا تھا۔ اس کے ایمان کا امتحان تھا کہ ایسی خوبصورت اور بے سہارہ عورت یوں بھٹکتی پھرے۔ وہ اسے پریشان دیکھ کر تڑپ گیا۔ اس کی ہر ممکن مدد کا وعدہ کیا۔ سوائے اس کے شوہر کی رہائی کے.... اس نے دھیرے دھیرے اس عورت کو حکایات جسم سمجھائیں' انسان نے دنیا میں اپنے لئے کتنے جہنم بنا رکھے ہیں جن کا اسے خود بھی اندازہ نہیں۔ یوں لگتا ہے ہر انسان کے اندر ایک جہنم دہک رہا ہے اور تمام حشرات الارض پروان چڑھ رہے ہیں۔ ہر دل ایک الاؤ ہے جس کی تپش دوسرے تک نہیں پہنچ پاتی۔

اور جہنم کے ان شعلوں میں شبنم کا ننھا سا قطرہ کیا ہوا؟ یہ کس کو خبر؟

کچھ دنوں بعد جب اس کے بچوں کے چہروں پر پیٹ بھر جانے کی آسودگی آگئی تو وہ سوچ رہی تھی "اللہ واقعی بہت بڑا ہے۔" پھر دھیرے دھیرے اس نے بزنس کے تمام گر سیکھ لئے.... کام کو کام ہی سمجھ کر کرنا چاہے۔ بس ایک مسئلہ رہتا تھا اس کا شوہر ابھی تک جیل میں تھا اور رہائی کی امید تک دور تھی کیونکہ دس روپے رشوت پانے والے سپاہی کا مقدمہ اتنا معمولی تھا کہ بڑے اور غیر معمولی مقدموں میں سے وقت نکالنا مشکل تھا' یہ الگ بات تھی کہ ان دس روپوں نے اس کی زندگی کا رخ بدل دیا تھا۔ اس کے دل میں خدا کا خوف اب بھی تھا۔ اذان سن کر اب بھی وہ احترام سے سر ڈھانپتی تھی اور اپنی کمائی کو سراسر محنت کی کمائی سمجھتی تھی' بلکہ خون پسینے کی کمائی۔ ہاں.... اس میں اس کی آبرو....اس کی شرم کا خون شامل تھا۔

میں نے اس کے صبیح چہرے کو دیکھا۔ میرے اندازے کے خلاف وہاں کوئی دکھ اور پچھتاوا نہیں تھا' بلکہ ایک خاموش آسودگی تھی۔ معصومیت تھی۔ اور اس معصومیت پر مجھے حیرت اس لئے نہیں ہو رہی تھی کہ اعمال کا دار و مدار تو بہر حال نیت پر ہوتا ہے اور اس نے یہ کاروبار جسمانی ضرورتوں سے مجبور ہو کر نہیں کیا تھا بلکہ اپنے بچوں کی بھوک اور فاقوں سے تنگ آ کر کیا تھا' اس جیسی ان پڑھ اور بے ہنر عورت کے لئے مردوں کے پاس دینے کو یہی نوکری رہ جاتی ہے۔

"تم نے گاؤں جانے کی کوشش کیوں نہیں کی؟" میں نے پوچھا

"گاؤں جا کر بھی یہی کچھ کرنا تھا گاؤں کے چوہدری اور شہر کے سیٹھ عورت سے ایک ہی طرح کی مزدوری لینے کے قائل ہیں" وہ کمال اطمینان سے بولی۔

"مگر وہاں تمہارے رشتہ دار بھی تو ہونگے۔" میں نے پھر پوچھا۔ اس نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ "میرا کوئی بہن بھائی نہیں۔ ماں مر چکی ہے اور باپ بوڑھا ہے اور خود کسی کے گھر پڑا ہے مجھے کیا رکھے گا۔ مفت کی روٹی کون کھلا سکتا ہے۔ مفت کی روٹی تو بی بی اپنا شوہر بھی نہیں کھلاتا ہے۔" اس نے کہا تو میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

جسم دیکر اس عورت نے ذہن پا لیا تھا۔ میں نے اس گھر کے دردیوار کو دیکھا.... اب جاننے کو کچھ نہیں بچا تھا اور جو کچھ میں جان چکی تھی مجھے اس پر اتنی حیرت نہیں ہوئی تھی آخر یہ سب سات پردوں میں چھپ کر نہیں ہوتا۔ ہماری نظر کے سامنے ہوتا ہے بس دیکھنے والی نظر چاہیے۔

واپسی پر خاصی دیر ہو چکی تھی میں جلدی سے پہلی ویگن میں بیٹھ گئی کرایہ دینے کے لئے پرس کھولا تو ہاتھ میں دس کا نوٹ آگیا۔ میں سب بھول کر وہ نوٹ دیکھنے لگی۔ ایسا لگا جیسے زمین پر موجود تمام نوٹوں کے اندر جان سی پڑ گئی ہے اور وہ بول رہے ہیں.... شور کر رہے ہیں۔ احتجاج بھرا شور.... مگر کس بات پر یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا شاید لگ رہا تھا کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ اتنے کم قیمت بھی نہیں کہ ہم سے انسان خرید لئے جائیں.... انسان کی قیمت اور گرا دو.... اتنا معمولی کر دو.... کہ ایک چٹکی بھر خاک کے عوض انسان خریدا جا سکے۔ کنڈیکٹر کی آواز پر میں چونکی اور نوٹ اسے پکڑا دیا۔ مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ آسمان پر گویا نور کی چادر پھیل گئی تھی۔ اسلامی ملک تھا اذانیں تو اب ریڈیو اور ٹی وی پر بھی نشر ہوتی ہیں۔ ہر طرف اسلامی اقدار کے چرچے ہیں۔ زانیوں کو کوڑے پڑ رہے ہیں۔ راشیوں کے لئے کہیں جائے پناہ نہیں۔ شرعی عدالتیں ہیں لوگوں کو جلد اور سستے انصاف کے وعدے ہیں حکومت کے کہنے کے مطابق ملک میں اسلام کا بول بالا کرنے کے لئے ریفرنڈم میں لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ پھر دس روپے رشوت پانے والے سپاہی کو بغیر کارروائی کے سال بھر سے جیل میں کیوں ڈالا ہوا ہے؟ اور اندھے قانون نے نہیں دیکھا کہ ایک غریب سپاہی کے بے سہارا کنبہ پر اس کی غیر موجودگی میں کیا گزری ہے؟ پھر یہ سیٹھ' یہ حوالدار' یہ سماجی کارکن یہ سب کہتے ہیں کہ اس عورت کے شوہر نے غیر قانونی اور غیر شرعی حرکت کی ہے مگر یہ تمام لوگ' یہ عزت دار لوگ جو ہر رات اس عورت کے

پاس آتے ہیں یہ قانون کی کون سی شق اور شرع کی کس رو سے جائز ہے؟۔

میرے فیچر کا آخری جملہ پڑھ کر ایڈیٹر صاحب غصے سے تقریباً لرز گئے۔ میں نے لکھا تھا "میرے حساب سے اس عورت کو' عورت سے طوائف بنانے میں سراسر قصور قانون کا ہے جس نے ایک عورت سے اس محافظ اور ایک کنبہ سے اس سائبان چھینا' آج کے مجرم کو کوڑے مارنا' ہاتھ کاٹنا یا سنگسار کرنا ایسا ہی ہے جیسے ہسٹریا کے مرض کا علاج دوا کے بجائے جھاڑ پھونک سے کیا جائے۔ شیطانی ذہن کوڑے' کھانے یا ہاتھ کٹنے کے بعد جرم کے دوسرے راستے اختیار کر سکتا ہے۔ اس شیطانی ذہن کی اصلاح ہی قانون کا مقصد ہے۔ جو کچھ اس عورت کے ساتھ ہوا یا ایسے انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے ان کا ذکر کسی آسمانی صحیفے میں نہیں ہوتا یہ تو انسانی صحیفوں میں لکھا جاتا ہے۔ ایسے صحیفے جن کی آئتیں تاریک غاروں کی بجائے روشن دلوں میں اترتی ہیں"

"آپ میرا رسالہ بند کروائیں گی۔"

ایڈیٹر صاحب نے فیچر میرے سامنے پٹخ دیا "ایسی معمولی باتوں پر رسالے بند نہیں ہوتے۔" میں نے کہا۔

"مگر یہ اسلامی مملکت ہے اور آپ کے الفاظ سراسر...."

"اسلامی مملکت خدارا آپ تو یہ الفاظ نہ کہیں۔ کان پک چکے ہیں یہ اصطلاح سن سن کر۔" میں نے غصہ میں آکر کہا "آپ جیسے لوگ تو جانتے ہیں کہ اس سارے معاملے کا اسلام سے تو کیا کسی مذہب سے تعلق نہیں"

"کیوں نہیں تعلق.... قرآن میں لکھا ہے کہ رشوت...." ایڈیٹر صاحب نے کہنا چاہا میں نے ان کی بات کاٹ دی "قرآن کی بات مت کیجئے۔ کسی آسمانی کتاب کی بات مت کیجئے ان کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے اس کا اعتبار کرنے کو اتنا ہی کافی ہے ناں کہ یہ خدا کی کتابیں ہیں مگر انسان جو خدا کی تخلیق ہے اس کا اعتبار' اس کا درد' اس کی آزادی کی قیمت کیا مقرر کی گئی ہے۔ سکہ رائج الوقت دس روپے.... آپ کو پتہ ہے اس سیٹھ کا بھائی حکومت کا بڑے عہدہ دار ہے یا شاید اسمبلی کا ممبر وغیرہ جس نے سب سے پہلے اس عورت کی قیمت دس روپے لگائی تھی' رہ گئی قرآن کی بات تو قرآن میں ہی لکھا ہے کہ کاغذ کو چوٹ نہیں لگتی انسان کو چوٹ لگتی ہے۔"

"میں جانتا ہوں' سب جانتا ہوں آپ کی ساری باتیں درست ہیں مگر یہ فیچر اس طرح نہیں چھپ سکتا۔ میرا بھی کنبہ ہے۔ میں بھی اپنے کنبہ کا سائبان ہوں۔ مجھے بھی روٹی کمانی

ہے۔ اور یہ جو سیٹھ ہیں، سماجی کارکن ہیں، اسمبلی کے ممبر ہیں یہ سب عوام و خواص کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ سب کو اپنی روٹیاں عزیز ہیں۔ بات وہی ہے کہ روٹی ہی ہمارا اولین مسئلہ ہے" انہوں نے جوش سے سر پکڑ لیا "خدارا اس فیچر کو ایسے لکھئے کہ سارا الزام اس عورت پر آجائے بلکہ یہ بھی لکھئے کہ قانون نے اس کی مدد کرنے کی بھرپور کوشش کی، اور اس سیٹھ کا تو ضرور ذکر کیجئے کہ اس نے اس عورت کو عزت کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا مگر ایسی عورتیں.... توبہ..... ہاں اس سیٹھ کا ذکر تفصیل سے کیجئے گا۔ اس کا بھائی کس عہدے پر ہے آپ سمجھتی ہے نا؟" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"جی میں بہت اچھی طرح سمجھتی ہوں...." میں نے بے دلی سے کاغذ سمیٹے اور اپنی میز پر آگئی۔ اب سوچ رہی ہوں پھر سے افسانے لکھنا شروع کر دوں۔ یہ سب میں افسانوں میں لکھوں گی تو لوگ واہ واہ کریں گے۔ فیچر ایسی باتوں کے متحمل نہیں ہوتے۔ لوگ آرٹ کے نام پر ننگی تصویریں دیکھ سکتے ہیں مگر آئینہ میں خود کو ننگا دیکھ کر چیخ اٹھتے ہیں۔

***

عذارا اصغر

پہچان کی جستجو

بند پلکیں الگ ہوئیں تو سورج کی سیدھی کرنیں پپوٹوں میں گھس آئیں۔ حیرانی سے میں نے اپنے ارد گرد نظر دوڑائی۔ کمرے پر سکوت طاری تھا تنہائی کے جان لیوا احساس سے بچنے کے لئے میں نے ریڈیو آن کر دیا۔ شور سے کمرے کے درودیوار بجنے لگے اور ذہن کے تار جھنجھنا اٹھے

"میں کون ہوں؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ میں کس صدی میں جی رہی ہوں"

"اور یہ دنیا کیا ہے؟"

ادلتے بدلتے دن رات.... گھٹتے بڑھتے صبح و شام.... یہ سب کیا ہے.... کیسے ہے اور کیوں بھلا.... چمکتے دمکتے چاند ستارے زمین و آسمان کی لامحدود وسعتیں.... اڑتے بادل.... امڈامڈ کر آتی گھٹائیں.... پانی کے برستے قطرے.... ایک میں ایک پیوست' جیسے مالا میں پروئے گئے موتی.... کھلتے' مہکتے.... محض ایک دن کی زندگی پر مسکراتے رنگا رنگ پھول.... اپنی خوشبو لٹا کر فنا کی طرف پلٹ جانے والے.... فنا....؟ یا دائمی بقاء کی طرف گامزن.... یہ کیسا فلسفہ حیات ہے....نا سمجھ میں آنے والا.... گھبرا کر میں باہر نکل آئی.... اچانک میں نے محسوس کیا کہ میں کہیں کھو گئی ہوں۔ اپنی یوں یکایک گمشدگی پر میں حیرت زدہ رہ گئی۔ میں نے خود کو تلاش کرنا چاہا مگر بے سود.... میں اپنی گمشدگی کا اعلان کرنا چاہتی تھی.... چیخ چیخ کر دنیا کو بتا دینا چاہتی تھی.... لوگوں! سنو میں گم ہو چکی ہوں.... مجھے میری تلاش میں مدد دو.... ٹھہرو! میرے اندر سے کسی نے پکارا.... میں رک کر سوچا....پاگل خانے کی اونچی دیواریں میرے ارادے میں حائل ہو گئیں....مگر یہ دنیا تو پوری کی پوری پاگل خانہ ہے.... پھر؟ تو کیا یہ سچ ہے کہ میں چرالی گئی ہوں....-؟ مگر چوری کی رپٹ ردج کرانے پر رپٹ لکھانے والا خود مجرم ٹھہرتا ہے....اکثر یونہی دیکھنے میں آیا ہے۔ مجھے یاد آیا....ایک دفعہ جب میرے باپ کے گھر چوری ہوئی تھی اور گھر کا سب قیمتی سامان رات کی تاریکی میں کوئی

سمیٹ لے گیا تھا اور وہ قیمتی سامان تھا ہی کیا.... پکانے ریندھنے کے برتن.... پہننے اوڑھنے کے کپڑے اور بس....۔ میرے باپ نے تھانے میں رپٹ درج کرائی اور خوش ہوا کہ اس کے برتنوں پر اس کا نام کندہ ہے اور چوری کا سامان تلاش کرنے میں پولیس کو آسانی رہے گی۔ مگر ایک ہفتے تک تفتیشی افسروں کو کھلانے پلانے کے بعد بھی جب چوری برآمد نہ ہو سکی تو میری ماں بازار سے مٹی کی ہنڈیاں لے آئی کہ چور کے لئے مٹی بے مصرف تھی۔ آگ میں تپ کر سونا کندن بنتا ہے اور مٹی آوے میں پک کر اپنا مول گرا دیتی ہے مگر یہاں تو مسئلہ یہ تھا کہ پولیس کو قیمتی مشروبات پلانے کے لئے میرے پاس پیسہ نہیں تھا۔ اپنی تہی دستی پر میں خشک آنسو بہا کر رہ گئی.... تلاش ابھی نامکمل تھی اور اپنی تلاش میں چلتے چلتے میرے پاؤں دکھنے لگے تھے۔

کمرہ نمبر نو میں ابھی اجلاس جاری تھا۔ اسٹیج پر کھڑا ایک چھوٹے ناٹے قد کا آدمی آزادی نسواں پر دھواں دھار تقریر کر رہا تھا.... میرے ذہن کے پردے پر ایک مدقوق چہرہ ابھرا.... لعن طعن کا طوق گلے میں لٹکائے.... جونکوں کی طرح اپنے جسم سے بچے چمٹائے.... گود میں بچہ، پیٹ میں بچہ، رینگتا بچہ.... سختیاں سہتا اور گالیاں سنتا وہ مدقوق چہرہ میرے ذہن کے افق پر پھیلتا چلا گیا میرے کان بج اٹھے۔ "میرے میاں سوشلسٹ لیڈر ہیں" اس نے بچے کی ناک سے بہتی رینٹ اپنے دوپٹے کے پلو میں سمیٹ کر مجھے بتایا۔

"آزادی نسواں، ان کا خاص موضوع ہے۔ کئی کتابیں لکھ چکے ہیں" اس نے اپنے گال پر نیل کو سہلا کر کہا۔

"یہ چوٹ؟"

"بڑے لوگوں کے کاموں میں مداخلت کا نتیجہ...." وہ بولی۔

"میں تو اس کی بیوی ہوں نا——"

وہ عورت بھی کہیں گم ہو چکی تھی اور اس کا ذہن اس کی کھوج سے ماورا ہو چکا تھا۔ یہاں اس خطے میں ہر عورت اپنی پہچان کھو چکی ہے اور اس پر اس کے باپ، دادا، بھائی اور شوہر کے نام کی مہر ثبت ہے—— میرا سر چکرا گیا۔

چھوٹے ناٹے قد کا آدمی بدستور زور شور سے تقریر کرتا رہا۔ میں نے بے بسی سے نگاہیں اٹھائیں۔ ہر چہرہ یہاں اجنبی تھا اور جو چہرے میری پہچان کی گرفت میں آ رہے تھے انہوں نے اجنبیت کے موٹے نقاب اوڑھ رکھے تھے۔ گھبرا کر میں باہر نکل آئی اور خود کو انسانوں کے بہتے سمندر میں چھوڑ دیا۔ چہروں کے سیلاب میں میں ایک تنکے کی مانند بہنے

لگی- ہنستے مسکراتے چہرے—— منہ لٹکائے بسورتے چہرے—— عجلت اور جلد بازی سے گھبرائے ہوئے پریشان چہرے—— پھرایک بھولا بسرا چہرہ میرے سامنے آن لٹکا-

"استاد کا درجہ والدین کا سا ہوتا ہے-" میں نے کہا-

"کس زمانے کی باتیں کرتی ہیں آپ؟ وہ ڈھٹائی کے ساتھ اطمینان سے بولا-

میں جب بچہ تھی اور تختی بغل میں مار کر پہلی بار مدرسے گئی تھی تو ماں نے کہا تھا-

"بیٹا استاد کی باپ کی طرح تعظیم دینا-" میں نے آج تک ویسا ہی سمجھا اور ویسے ہی کیا مگر تم—— سوچو میں تمہاری استاد ہوں اور پھر تم سے بڑی——" میں نے اسے سمجھایا-

"بڑے مرد چھوٹی عورت سے بیاہ کر سکتے ہیں تو بڑی عورت چھوٹے مرد کو قبول کیوں نہیں کر سکتی بھلا——؟" وہ بحث پر اتر آیا-

"مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے میڈم-"

"ہنہ محبت—— محبت کس قدر فرسودہ لفظ ہے- میں نے محبت کے نام پر جسموں کا نیلام دیکھا ہے- روحوں کا سودا ہوتے سنا ہے- محبت—— ایک مقدس جذبہ ہے- مگر جب تک یہ بتیس دانتوں تلے رہے- لبوں سے پھسلا اور یہ لفظ بکاؤ مال بنا—— جذبے کے تقدس کو مجروح نہ کرو میرے پیارے شاگرد——"

اور پھر وہ چہرہ اداسیوں کے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا اور دوسرا چہرہ تن کر سامنے آگیا- مگر مسائل کی صلیب پر تو ہر چہرہ لٹکا تھا- میں نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور مڑا تڑا کاغذ اپنے دوسرے چہرے کے روبرو لے آئی-

"راحیلہ بی بی-!"

سچ بتلاؤں- خط لکھنا بھی ایک تخلیقی عمل سمجھتا ہوں- آپ کے اوپر تلے تین چار خط ملتے ہیں- ہر خط کے پس منظر میں جذبات کی خوبصورت جھلکیاں ہیں- میں عمر کے اس حصے میں ہوں جہاں اپنے جذبات کے آگے بند باندھنا پڑتے ہیں اور باہر سے آنے والے جذبات کے آگے فصیلیں کھڑی کرنا ہوتی ہیں- آپ کی زندگی شاید ایک چہار دیواری تک محدود ہے- ہم تعلقات کے سمندر میں موجود ہیں- دوستی کے نام پر' محبت کے عنوان سے خلوص کے ناتے سے اتنے چرکے کھائے ہیں' اتنے رنگ روپ دیکھے ہیں کہ انہیں دہرانے کا بھی یارا نہیں- ستم ظریف لوگوں نے ہمیں ایک شجر سایہ دار جان رکھا ہے- لوگ ستاتے ہیں' وقت گزارتے ہیں اور آگے چل پڑتے ہیں—— مجھے مہلت دیجئے- آپ کے خطوں کا تفصیل سے جواب لکھوں گا- مجھے آپ کے جذبے کا احترام ہے—— مگر—— خدانخواستہ

آپ کو دکھی کرنا مقصود نہیں تھا۔ برسوں سے میری روایت یہی رہی ہے کہ میں تعلقات توڑنے میں کبھی پہل نہیں کرتا۔ زیادتی بھی سہ لیتا ہوں، ستم بھی جھیل لیتا ہوں۔ آپ خوش رہا کریں۔ اپنے مسائل کو سلجھائیں۔ کسی کے لئے ناحق آنسو بہاتی ہیں۔ یہ زندگی کا سرمایہ ہے۔ محبتوں کی امانت ہے۔ ہم ایسے لوگ شام کے تاروں کی طرح ہوتے ہیں۔ پل دو پل ابھرے، پھر ڈوب گئے۔ خدا آپ کو مستقل اور مستحکم خوشیاں دے۔۔۔سائے تو سائے ہی ہوتے ہیں۔ دھواں تو بہر حال فضاؤں میں تحلیل ہونے کے لئے ہوتا ہے۔ ایسی آگ روشن کریں جو آپ کو عمر بھر کی حدت اور حرارت دے سکے۔ راکھ کریدنے سے بھلا کیا فائدہ؟

ہاں! یہ سچ ہے کہ ہم اپنی خواہشوں کے اسیر ہوتے ہیں۔ یہی خواہشات دکھی کرتی ہیں، یہی قتل کرتی ہیں۔ آپ تو کم از کم ان سے دامن بچا لیں۔

مڑے تڑے کاغذ کو مٹھی میں بھینچ کر میں نے پھر جیب میں اڑس لیا۔ پیروں کے چھالے پھوٹے تو تکلیف کی شدت میری سوکھی آنکھوں میں نمی لے آئی۔ اذیت کا احساس جاگا تو مجھے گھر یاد آیا۔ مگر گھر اور اس کی ویرانی میری اجڑی روح کو مزید ریزہ ریزہ کر گئی۔ سوچ نے اپنی منور کرنیں سمیٹیں اور وسعتوں میں کہیں جا پہنچا۔ مغرب میں شام کا روشن تارا جھلملانے لگا۔ مگر شام کے تاروں کا کیا ہے۔ ابھی ابھرے، ابھی ڈوبے۔ بس پل دو پل۔ میں اپنی گمشدگی پر ہراساں، گھر کے ایک کونے میں چھپی بیٹھی تھی اور شام کے تارے کے گرد ستاروں کا مدہم ہجوم لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے سانس روک لیا اور ساکت ہو کر اپنی ذات میں سمٹ کر اپنی کھوج کرنے لگی۔ شاید میں مل ہی جاؤں..... شاید۔

***

نورالہدیٰ شاہ

زندگی کا زہر

بھرے شہر میں تنہائی کا ڈستا احساس وجود میں بکھری ہوئی چھوٹی چھوٹی نا آسودہ آرزوؤں کا زہر۔ رگ رگ میں بسی ہوئی تنہائی کی گھٹن۔ آنکھوں میں چبھتا ہوا اذیت کا احساس یہ سارے درد جو پچھلے کتنے زمانوں سے دل کے کسی سنسان گوشے میں دفن تھے۔ آج اسی کا جنازہ اپنے کندھوں پر لئے اس کے سامنے بت بنے کھڑے تھے۔

"بیگم صاحبہ کیا ہوا" اس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں آنسوؤں کی لڑی دیکھ کر زیبو کے جسم دباتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ لیکن وہ بالکل خاموش' موت کے تنہا احساس کی طرح آنکھیں آئینے پر ساکت پھر اس پر جوانی کا پچھلا پہر کالے بالوں میں نکھری چاندی کی جھلملاتی آسیب' اپنی گھٹی ہوئی خواہشوں سے گھبرا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

"بیگم صاحبہ آپ ٹھیک تو ہیں؟ جواب میں ایک لمبی ٹھنڈی سانس جو ہونٹوں پر آکر الجھ گئی۔

زیبو سگریٹ جلا کر لائی۔

"ہاں بیگم صاحبہ پئیں گی آپ؟"

اس نے خموشی سے سگریٹ سلگایا۔ سوکھے ہونٹوں میں دبا ہوا سستا سا سگریٹ سلگایا۔ سگریٹ کا سفید دھواں اور تنہائی کی گھٹن۔

"بی بی جی آج تو کالو نے بھی دیکھ لیا۔"

"پھر" وہ ڈر کے مارے چونک گئی۔ "کہنے لگا کیا کرتی ہو سگریٹوں کا؟"

"تم نے کیا کہا؟" آنکھوں میں راز کھلنے کے ڈر کے سائے۔

"میں نے کہا میں پیتی ہوں سگریٹ"

دونوں کی ہلکی ہنسی جیسے کھنڈروں سے تنہا آواز کی بازگشت۔

"زیبو۔"

"جی بیگم صاحبہ۔"

"تجھے کالوا چھا لگتا ہے۔"

بڑا گہرا سوال لیکن بظاہر درمیانہ سا "اپنا شوہر کیسے اچھا نہیں لگتا۔ بیگم صاحبہ۔"

"تجھے پیار کرتا ہے؟"

"بی بی جی وہ تو کہتا ہے کہ ایک پل بھی مجھ سے جدا نہ ہوا کر۔"

"بڑے مان سے دیا گیا جواب لیکن اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے گرم گرم خون اتر آیا ہو۔ جسم سے پاتال تک پھیلا سگریٹ کا دھواں ایک لمبا کش سوچوں کا ایک طویل سلسلہ نا آسودہ آرزوؤں کا زہر دل میں بھر آیا ایک سانولا سا چہرہ جو وہ دروازہ کے بند کواڑے سے جھانک کر دیکھا کرتی تھی۔ ایک گرم دوپہر کو جھانکتے ہوئے پکڑی گئی تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو"

"اس کے سہمے ہوئے وجود کے چاروں طرف مضبوط بانہیں پھیل گئیں۔ اس کا دل سینے سے نکل کر خون کی ہر بوند میں دھڑکنے لگا۔ بہار کا پھیلاؤ اس کی رگ رگ میں پھیل گیا۔ تب کسی کے کھانسنے پر وہ بانہوں کے گھیرے سے نکل کر اپنے گھر میں آ چھپی تھی۔ وہ بچپن سے ہی احمد کے ساتھ منسوب تھی۔ بہت پہلے ایک دن سورج ڈھلتے وقت اس کی چچی نے جھل مل کرتا لال دوپٹہ اسے پہنایا تھا اور اپنی آغوش میں لے کر کہا تھا۔ "میرے احمد کی چھوٹی سی دلہن" اور یہ الفاظ کئی زمانوں سے اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ تب سے اس نے احمد کے لئے خوبصورت سپنے اپنی آنکھوں میں سجا لئے تھے۔ اس کے بعد اس کے خوابوں کی تعبیر زیبو کے "پرے" تلے اندھیری راتوں میں گھر کی چھت پر لمبی ملاقاتوں' خوشبوؤں

میں لبے لمبے خطوط بانہوں کے وسیع پھیلاؤ تھے۔

احمد پڑھنے کے لئے حیدر آباد چلا گیا۔ اور پھر واپس آنے کا وعدہ کر کے ملک سے باہر چلا گیا اور وہ اس بہت بڑے بنگلے میں تنہا رہ گئی۔ جیسے قبرستانوں میں بھٹکی ہوئی تنہا بدروح جسم کے اندر پاتال میں احمد کی مضبوط بانہوں کا لمس' کانوں میں سرگوشیاں "آخر تو تمہیں میرا ہی ہونا ہے پھر شرمانا کیسا۔" خون کی ہر بوند میں انجانا بھاری بوجھ دوسرے مہینے سب کچھ خود ہی سمجھ گئی۔ پاگل سی ہو گئی۔ دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر اتنا چیختی تھی کہ دھرتی سے آکاش تک بازگشت بن کر گونجتی رہی تھی۔ اس کی ماں کی تیز نظریں سب کچھ سمجھ چکی تھی۔ بے ہوشی کی حالت میں آنکھوں تلے اندھیرا چھایا ہوا تھا یہ سوچ کر اس کے بھائی جو بڑے غیرت مند تھے اگر ان کو پتہ چل گیا تو اسے جان سے مار ڈالیں گے۔ باپ جو بڑا عزت دار آدمی تھا اس کا گلا گھونٹ ڈالے گا۔ لیکن ان دنوں وہ سب گھر پر نہیں تھے۔ بھائی نئی گاڑیاں لینے کے لئے حیدر آباد اور کراچی کے درمیان دوڑتے رہتے تھے۔ اس کے باپ نے حال ہی میں ایک مچھیرن کو بغیر نکاح کے اپنے گھر میں رکھ لیا تھا۔ ایک ماں تھی جو سارا سارا دن پاگلوں کی طرح اس کے پیٹ کی جانب گھورتی رہتی تھی اور وہ خود سارا سارا دن پنگھوڑے میں غنودگی کے عالم میں سوئی رہتی تھی۔ آخر اس کی ماں نے زیبو کو شہر بھیج کر ڈاکٹرنی کو بلوا ہی لیا۔ جب اس کے جسم کے پاتال میں چھپا ہوا بوجھ کم ہو گیا تب اس کی ماں نے دو ہزار روپے اور ایک سونے کی انگوٹھی دے کر ڈاکٹرنی کا منہ بند کر دیا۔ لیکن وہ کئی دنوں تک ویران آنکھوں سے چھت کو تکتی رہی تھی۔ ہر احساس جیسے خود بخود مر گیا ہو۔ اس لمحے اچانک اس کے دل میں ظاہر ہوتا۔ خون اور گوشت کا چھوٹا سا لوتھڑا جو زیبو نے کموڈ میں پھینک کر فلش چلا دیا تھا۔ پانی کی ایک تیز لہر نے گوشت اور خون کے اس لوتھڑے کو دھرتی کے پاتال کی طرف دھکیل دیا۔ لیکن لال لال خون اور گوشت کا یہ بے جان لوتھڑا اس کے اندر چبھتا رہا۔ چھوٹی چھوٹی بانہیں اس کے سارے جسم میں لپٹ گئیں اور پھر اندر سے ایک چیخ نکلتی تھی جو ساری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھی۔ اس کے باپ نے ڈاکٹر کو بلوا لیا۔ "ہسٹیریا ہے شادی کر دو" ڈاکٹر نے کہا۔ دو زنی

(دو بیویوں والا)۔ ہماری بیٹیوں کے لئے کہتا ہے شادی کروا دو۔ باپ ڈاکٹر کو گالیاں دینے لگا تب اس کی چیخیں اور بھی بڑھ گئیں۔

اپنے گھٹے ہوئے احساس سے گھبرا کر احمد کو خط لکھا جو زیبو چھپا کر پوسٹ کر آئی۔ واپسی میں بہت دنوں کے بعد احمد کا خط آیا تو سہی لیکن اس کے باپ کے نام "میں بڑوں کے فیصلوں سے فردوس کو آزاد کرتا ہوں کیونکہ میں نے یہاں پر شادی کرلی ہے۔" احمد کے خط سے کہرام مچ گیا۔ احمد کا بھائی تو احمد کا خون کرنے ملک سے باہر جانے لگا (جیسے وہاں پر بھی سندھ کی طرح انسان کو مارنا آسان کام ہو) لیکن باپ عقل والا تھا۔ عزت کا معاملہ تھا۔ غیرت والے ایک مرتبہ جس جگہ سے رشتہ کرتے ہیں اسے نبھاتے بھی ہیں اور یہ بات کوئی اتنی بڑی بھی نہیں تھی۔ دو بیویاں تو ہم سندھی مردوں کی شان ہیں۔ سو احمد کو لکھ کر بھیجا کہ "جتنی بیویاں اتنی شان' جہاں ناتا لگایا اسے نبھانا' یہ ہماری برادری کی شان ہے فردوس جب تک زندہ رہے گی تمہارے لئے بیٹھی رہے گی۔" احمد نے کوئی جواب نہیں دیا اور جب بات برادری میں پھیل گئی تو اس نے بھی سنا اور اس کے من کی بلند عبادت گاہیں ایک پل میں زمین دوز ہو گئیں۔ اسے ایک بار پھر خون اور گوشت کا وہ لوتھڑا اپنے جسم پر رینگتا ہوا محسوس ہوا۔ کئی خط اس نے احمد کے نام لکھے لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ اندر ہی اندر ریت کے ذروں کی طرح بکھرتی اور ٹوٹتی رہی خون کی ہر بوند میں زندگی کا زہر پھیلتا گیا۔ جوانی کے ڈوبتے سورج کا شدید احساس' تنہائی کا عذاب زیبو نے دوپٹے کے پلو سے ایک سگریٹ سلگا کر اس کے خشک ہونٹوں میں دبا دیا۔ دو تین لمبے کش سینے سے اٹھتی ہوئی ہلکی کھانسی کی بازگشت' وہ سوچنے لگی انسانوں کی بستی سے نکل کر کہیں بھاگ جائے لیکن زہریلی سوچیں دماغ کے ہر گوشے میں پھیل گئیں۔ "زیبو اگر میں مرگئی تو۔"

"مریں آپ کے دشمن بی بی جی۔"

"نہیں میں بھاگ جاؤں گی۔" اک ہلکی سی' ہنسی۔

"آہستہ بولیں بی بی جی کوئی سن نہ لے۔"

ایک زوردار قہقہہ جیسے دمے کی کھانسی کی بازگشت۔

"اگر میں بھاگ گئی تو یہ مجھے ذبح کر ڈالیں گے۔"

وہی قہقہہ لیکن قہقہے میں کھوکھلا پن ——— آنکھوں میں خوابوں کے جنازے سمٹ آئے۔ دل میں باپ اور بھائی کا خوف جن کی غیرتیں اور عزتیں صلیب کی طرح اس کے کاندھوں پر ٹکی ہوئی تھیں لیکن اس کے بعد بند آنکھوں میں گھوم گئیں۔ بہت سی یادیں۔

سلیم جسے اس نے برقعے کے کالے نقاب میں سے ریشم گلی کی ایک زیورات کی دکان پر دیکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی پتہ نہیں کیوں اس کے دل نے دھڑکنا شروع کر دیا تھا۔ "آپ نقاب تو اٹھائیں۔" انگوٹھی دکھاتے ہوئے اس نے فردوس کے کان میں سرگوشی کی، نقاب کے اندر اس کا چہرہ ایک پل کے لئے سرخ ہو گیا اور جب اس نے انگوٹھی انگلی میں پہنی تو اچانک اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اتنے نازک ہاتھ میں اتنی بیدردی سے انگوٹھی نہیں پہنی جاتی۔"

وہ اس کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ چھڑا نہ سکی وہ اسے دیسی فلموں کا ہیرو محسوس ہوا جس سے اسے کسی زمانے میں عشق ہو گیا تھا۔ جس کی فلمی اخباروں اور رسالوں سے کٹی ہوئی تصویریں اس کی الماری میں رکھی ہوئی تھیں۔ انگوٹھی لے کر جب وہ دکان سے نکلی تب اس نے فردوس کے کان میں سرگوشی کی۔

"پھر آیئے گا میں آپ کا انتظار کروں گا۔"

پھر سارے راستے وہ اور زیبو اس کی باتیں کرتے آئے اسے ساری رات نیند نہیں آئی اس رات اسے نہ احمد کا سانولا چہرہ یاد آیا نہ گوشت اور خون کا وہ لوتھڑا رینگتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے انگوٹھی پہناتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور کہا تھا "آپ کے ہاتھ کتنے نازک ہیں۔" وہ ساری رات اندھیرے میں اپنے خوبصورت ہاتھ دیکھتی رہی۔ جن پر ابھی تک سلیم کے ہاتھوں کا لمس محسوس ہو رہا تھا۔ دوسرے دن ماں سے کہنے لگی۔ "انگوٹھی تنگ ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے بدلوانا چاہیے" اور پھر شام کی اداسی میں چہرے پر نقاب ڈالے زیبو کے ساتھ وہ اسی دکان میں پھر گئی۔

وہ مسکرا کر کہنے لگے "مجھے یقین تھا کہ تم آؤ گی۔"

"کیوں"

کئی سوال اس کیوں میں سمائے ہوئے تھے

"میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

اس نے بڑے یقین سے کہا۔ تب اسے محسوس ہوا اس کا دل سینے سے نکل کر پیروں میں آ کر دھڑکنے لگا ہے لیکن بظاہر دکھاوے کے لئے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ حالانکہ اس کا دل بھی شدت سے چاہ رہا تھا کہ وہ ایسے ہی اس کا ہاتھ تھامے رہے اور زندگی کے لمحے ساکت ہو جائیں لیکن وہ بھی اس معاملے میں بڑا تجربہ کار تھا۔ اس نے اپنی دکان میں کئی لڑکیاں پھنسائی تھیں۔ وہ شریف زادیوں کے اندر چھپی ہوئی نا آسودہ خواہشوں سے واقف تھا وہ خود ان خواہشوں کی تکمیل کیا کرتا تھا۔

"تمہارے یہ ہاتھ چومنے کو دل کرتا ہے۔" اس نے سرگوشی کی اور وہ ایسے شرما گئی جیسے اس نے یہ لفظ پہلی مرتبہ سنے ہوں۔

احمد سے پہلے اسکول کلرک نے بھی یہی بات کی تھی۔

لیکن وہ نئی نویلی دلہن کی طرح شرما گئی تھی۔

"انگوٹھی تنگ تھی بدلوانے آئی ہوں۔"

"پہلے نقاب تو اٹھایئے۔" اس نے فردوس کا نقاب اٹھانا چاہا لیکن وہ ڈر کے مارے چونک گئی۔

"نہیں نہیں کوئی دیکھ لے گا"

"ایک جھلک تو دیکھنے دیں' اس نے نقاب سے جھانک کر فردوس کا چہرہ دیکھا ایک بار پھر اس کا دل سینے سے نکل کر پیروں میں دھڑکنے لگا "کتنی خوبصورت ہو تم"

اس کی آواز میں نہ جانے کیا تھا۔ فردوس کو اپنا وجود پگھلتا ہوا محسوس ہوا واپسی میں زیبو کو اس نے وہ ساری باتیں بتا دیں جو اس نے سلیم سے کی تھیں۔ یہاں پر بھی ڈاکیئے کا کام زیبو نے کیا۔ لمبے خوشبودار رومانی خطوط جو اردو شعروں سے بھرے ہوتے تھے خوب صورت ریشمی رومال' ملنے کے لئے پیغام اور ملاقاتیں

جو زیادہ تر سلیم کی دکان کے اندرونی کمرے یا اس کے دوستوں کے گھروں میں ہوتی تھیں۔ گھر سے سہیلیوں سے ملنے کا بہانہ کر کے نکلتی تھی۔ کبھی میلاد شریف' کبھی درزی' کبھی دعوت کا بہانہ ——— ماں نے بھی کوئی روک ٹوک نہیں کی۔ اس نے سوچا احمد کا دیا ہوا دکھ کم ہو جائے گا گھر پر کھڑی دو دو گاڑیاں سلیم اور اس کے درمیان فاصلوں کو کم کرتی گئیں ایک دن اس نے سلیم کے کاندھے پر سر رکھ کر کہا۔ "مجھ سے شادی کرو گے۔" وہ چونک گیا۔

"تمہارے رشتہ دار بہت بڑے آدمی ہیں فردوس مجھے تمہارا رشتہ نہیں دیں گے۔"

"ہم چھپ کر شادی کریں گے۔" اس کی بات سن کر سلیم کا چہرہ پیلا پڑ گیا اس نے کسی بھی لڑکی سے شادی نہیں کی تھی۔ اس کی اپنی خوبصورت بیوی اور دو پیارے پیارے بچے تھے۔ فردوس اور کئی دوسری لڑکیاں اس کی زندگی میں آئیں اور چلی گئیں وہ ایک تجربہ کار کھلاڑی تھا۔

"اپنی شادی جائز نہیں۔"

"جھوٹ کہہ رہے ہو۔"

"سچی قرآن اور حدیث کھول کر دیکھ لو۔" اس نے قرآن و حدیث کا جھوٹا حوالہ دیا۔ فردوس سے جان چھڑانے کے لئے اور وہ چپ ہو گئی۔ موت کے تنہا احساس کی طرح یہ خاموشی اس کے من میں دور دور تک زہر کی طرح پھیلتی گئی۔ ایک دن اچانک سلیم کی دکان پر پہنچی۔ ایک چھوٹی عمر کا لڑکا دکان پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "سلیم بھائی سکھر چلے گئے ہیں اب وہ وہیں رہیں گے اور سکھر والی دکان ہی سنبھالیں گے۔" اسی لمحے اس کے من کی کچی اور پکی عبادت گاہیں زمین دوز ہو گئیں۔ وہ پھر شہر میں تنہائی کا ڈستا ہوا احساس لئے لوٹ آئی۔ اسے ایک مرتبہ پھر ہسٹیریا کے دورے پڑنے لگے۔ کالی کالی تھکی تھکی آنکھوں میں نہ چاہتے ہوئے بھی آنسو امنڈ آئے۔ اس نے خود کو سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے آئینے میں دیکھا جو اذیتوں سے بھرا ہوا تھا۔ اندر باہر تنہائی کا احساس بھرے پرے شہر میں موت کے احساس جیسی تنہائی' کئی یادیں خون کی ہر بوند میں سما گئی۔ چہرے

بانہوں کا پھیلاؤ ہونٹوں کا لمس' کاندھوں پر زندگی کی صلیب' چھوٹی چھوٹی نا آسودہ آرزوؤں کا ہجوم اور پاتال تک پھیلا ہوا زندگی کا زہر۔

"زیبو تم فیملی پلاننگ والے ہسپتال گئی تھیں وہاں سے گولیاں لائیں۔" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "ہاں بی بی جی۔ ڈاکٹر نے کہا ہے جتنے دن یہ گولیاں کھائیں گی خیر رہے گی۔" دونوں کی ہلکی سی ہنسی لیکن ہنسی ایسے جیسے تنہا آواز کی بازگشت پانی سے گولی حلق سے نیچے اتاری جیسے زندگی کا زہر گلے سے نیچے اترا ہو۔ اسے ایک بار پھر گوشت اور خون کا لوتھڑا اپنے مرجھائے ہوئے جسم پر سرکتا ہوا محسوس ہوا اس نے گولیوں کا پیکٹ تکیے کے نیچے چھپا دیا اور وہاں سے ایک خط نکال کر زیبو کو دیا۔ "یہ جمیل کو دے دینا۔ اور اس سے کہنا کہ میں کل شام کو آؤں گی۔" زیبو خط لے کر چلی گئی۔ اور وہ موت کے احساس کی طرح تنہا پنگھوڑے میں بیٹھی سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتی رہی' ازل کا عذاب خون کی ہر بوند میں سما گیا۔ اور ایک لمبی سانس لے کر اس نے آنکھیں موند لیں۔

کشور ناہید

○ لب گویا	شاعری
○ بے نام مسافت	شاعری
○ نظمیں	شاعری
○ گلیاں' دھوپ دروازے	شاعری
○ ملامتوں کے درمیان	شاعری
○ خیالی شخص سے مقابلہ	شاعری
○ سیاہ حاشیے میں گلابی رنگ	شاعری
○ عورت خواب اور خاک کے درمیان	مضامین
○ باقی ماندہ خواب	مضامین
○ آجاؤ افریقہ	سفرنامہ
○ لیلیٰ خالد	آپ بیتی
○ زیتون (بیپسی سدھوا)	ناول ترجمہ
○ نئے زمانے کی برہن	(کشور ناہید پر مضامین)

○ عورت _____ زبان خلق سے زبان حال تک
(عورت سے متعلق 26 موضوعات پر منفرد تحقیقی مضامین)

Women
Myth Realities

The scream of an illegitimate voice
Selection Poems

Rs. 120.00

ISBN 969 - 35 - 0521 - 2